



**MEER ANIS KE MARSIYON MEIN KIRDARNIGARI
(KHAWATEEN KE KHUSUSY HAWALE SE)**

THESIS

Submitted for the Award of the Degree of

Doctor of Philosophy

IN

URDU

By

NISHAT NAQVI

Under the Supervision of

DR. M. SAGHIR BEG

(Pen Name **SAGHIR AFRAHEIM**)

Department of Urdu

Aligarh Muslim University

Aligarh (INDIA)

2009

تلخیص

مرثیہ وہ منفرد صنف سخن ہے جس میں دلی جذبات اور احساسات کی ترجمانی بڑے دلکش پیرایہ میں کی جاتی ہے جس سے ہر ایک کی توجہ اصل مقصد پر مرکوز رہتی ہے اور چونکہ میرے تحقیقی مقالے کا موضوع "میر انیس کے مرثیوں میں کردار نگاری" (خواتین کے خصوصی حوالے سے) ہے لہذا جب تک مرثیے کا مفہوم روشن نہیں ہوگا مرثیہ میں کردار نگاری کا تصور نا تمام رہے گا لہذا سب سے پہلے خود مرثیہ کی لقوی حیثیت سے غور کیا جائے تاکہ اصل موضوع روشن ہو جائے۔

مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مادہ "رثی" ہے جس کے معنی ہوتے ہیں کسی شخص کے مرنے پر اپنے غم کا اظہار کرنا اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کرنا یا مرنے والے کے اوصاف و کمالات اور محاسن کو اشعار کے پیرائے میں بیان کرنا۔

شاعری کی مرثیہ ایک ایسی صفت ہے جس کا رواج ہر زبان میں ہے اور قریب قریب انگریزی اردو فارسی جیسی زبانوں میں بھی اس کا چلن بہت زمانے سے چلا آرہا ہے اس صنف سخن میں میت کے اوصاف و خصائل کو بیان کیا جاتا ہے اور اس پر اظہار افسوس کیا جاتا ہے اردو میں مرثیہ کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ شخصی مرثیہ ۲۔ مرثیہ اہل بیت ۳۔ قومی مرثیہ

اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی تعداد میں بہت زیادہ ہے تقریباً ہر شاعر نے اس پر طبع آزمائی کی ہے غالب اور حالی جیسے عالی مقام شعراء نے بھی اس صنف سخن میں قلم طرازی کی ہے خاص کر غالب کا مرثیہ اپنے بھتیجے کے لیے حالی کا مرثیہ غالب کے لیے حالی نے ایک چھوٹے سے مرثیے میں بہت نرالے لٹھنگ سے بہت اونچی بات کہہ دی ہے میرے خیال میں انہوں نے دریا کو کوڑے میں بند کر دیا ہے۔ قومی مرثیے کا رواج بھی ترکی اور فارسی زبانوں میں ایک مدت سے چلا آرہا ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اردو میں شفیق اورنگ آبادی، شا کرناجی، شاہ حاتم، میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا وغیرہ نے مغلوں کے دور میں سماجی اور سیاسی حالات سے متاثر ہو کر شہر آشوب نظمیں لکھیں ہیں۔ اور ان سبھی میں مرثیے کا رنگ نمایاں ہے پہلے چونکہ مرثیہ مسدس تک محدود تھا اب آزاد نشری نظم پیرائے میں بھی رائج ہو گیا۔ تقسیم ہند کے بعد کچھ شعراء پاکستان چلے

گئے اور وہاں انہوں نے اس فن کو زندہ جاوید بنایا جن لوگوں نے ہندوستان میں اس فن کو ترقی دینے کی کوشش کی ان میں علی سردار جعفری، مرزا صادق مہدی، تابش نقوی کیفی، عظمیٰ کے نام شامل ہیں اور پاکستان میں ساحر لکھنوی، ڈاکٹر ہارون عباسی، شاہد نقوی، سردار نقوی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

عموماً اہلبیت کے مرثیے کو ہی اردو میں اصل مرثیہ مانا جاتا ہے جس میں کر بلا کے درد انگیز واقعات بیان کیے جاتے ہیں جس کے شہسوار میر انیس اور ان کے ہم عصر مرزا دبیر ہیں۔ مرثیہ کو بلند یوں تک پہنچانے والے۔ سہی دونوں ہیں۔ مرثیہ گوئی کا چلن شمالی ہند میں تھا اور لکھنؤ تو مرثیوں کا گڑھ مانا جاتا تھا ساتھ ساتھ دلی اور دوسرے شہروں میں بھی اس کا رواج رہا ہے مرثیہ گو شعراء میں انیس اور دبیر کے علاوہ جنہوں نے اس صنف مرثیے پر طبع آزمائی کی ان میں خلیق اور میر ضمیر کا بھی نام سہر فہرست ہے میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد مستقل فن مرثیہ پر طبع آزمائی کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ملتا۔ انیس کا کلام چھ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے جس میں ۱۲۵ مرثیے ہیں۔

جوں جوں یشت ترقی پزیر ہوئی اس فن مرثیے نے ترقی کے راستے اپنائے۔ چھ شیعہ حضرات جو حجاج بن یوسف کے ظلم سے تنگ آ کر ایران چلے گئے تھے انہوں نے وہاں بھی اس فن کے لیے مستقل کوشش کی۔ بارہویں صدی ہجری میں جب سلطنت اودھ کی بنیاد قائم ہوئی اس کے اکثر فروماں اروا شیعہ تھے۔ ان کے دور میں مسجدیں اور عزاء خانے قائم ہوئے اور مرثیوں کا رواج بڑھتا رہا ایسی محفلیں رام پور، بگن پلی، جاردہ اور مرشد آباد جہاں نوابین نے اس کے لیے نمایاں کردار ادا کیا اس کے علاوہ تقسیم ہند سے پہلے جون پور لکھنؤ اور حیدر آباد میں شیعوں کا عروج تھا اور یہ صنف سخن وہاں پروان چھڑی۔

ادیبوں میں مرثیے کی فنی حیثیت کو لے کر اختلاف ہے اس میں عزیز واقارب کے مرنے پر رنج و غم کا اظہار ہوتا ہے اور اس میں درد و الم، رنج و غم کے ساتھ اس کی جملہ خوبیاں بھی شامل ہوں اور یہ تمام اظہار کی کیفیات اجزائے ترکیبی کے ساتھ کسی شاعری شکل میں ڈھل جائیں تو وہ مرثیہ کہلائی ہے۔

لفظ مرثیہ "رثا" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مرنے والے کے اوصاف کمالات ایسے پیرایہ میں بیان کرنا جس سے سننے والے پر ایک خاص اثر طاری ہو۔

مرثیے کی اصطلاحی تعریف کے مطابق کہا جاتا ہے:- مرثیہ شاعری کی وہ صنف ہے جس میں مرنے والے کے اوصاف و کمالات اس انداز میں بیان کئے جائیں جس سے سننے والے کو اس سے دلی ہمدردی ہو اور ساتھ ہی کوئی خاص اخلاقی پہلو بھی نکلتا ہو۔ مرثیے کی تعریف اور پھر اس کے مطابق مختلف ادباء

کی مختلف رائیں ہیں جیسے تفصیلی طور پر نام با نام مقالے میں پیش کر دیا گیا ہے زین العابدین نے مرثیے کی کچھ قسمیں بتائیں ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ رثائے تشریفات و رسمی ۲۔ رثائے شخص و خانوادگی

۳۔ رثائے مذہبی اس کی مکمل اور مدلل تفصیل مقالے میں موجود ہے۔

مرثیے کے تاریخی پس منظر کے بارے میں اختلاف ہے۔ کچھ نقاد ابو بکر صدیقؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو آخری خلیفہ تسلیم کرتے ہیں مگر کچھ ادباء رسول اللہ کے بعد حضرت علیؓ کو ہی پہلا اور آخری خلیفہ مانتے ہیں۔ ان ادباء کی رائے کے مد نظر حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلافت کے مسئلے پر کربلا کا واقعہ نمودار ہوا جس میں امام حسینؓ جان بحق ہوئے یہیں سے اہلبیت کے مرثیے کا آغاز ہوا۔

مرثیے کے موضوعات پر بھی شعراء کی آپس میں مختلف رائیں ہیں۔ جہاں اردو شاعری کی دیگر اصناف نے اردو شاعری کو ارتقاء کے منازل تک پہنچایا وہیں مرثیے نے بھی اردو شاعری کے دامن کو کافی مالا مال کیا خصوصاً شہدائے کربلا کے مرثیوں نے ایسے طول و طویل موضوعات کی بناء پر اردو شاعری کو زندہ و جاوید بنادیا۔ مرثیے کے جاراہم موضوع قرار دیے گئے ہیں۔ جو تفصیل کے ساتھ اس مقالے میں موجود ہیں

مرثیہ کی فنی خصوصیات میں مرثیہ کی ہیئت کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے جبکہ مرثیہ کسی خاص بیان کا تابع نہیں ہے کیونکہ مرثیہ کسی بھی شکل و ہیئت میں لکھا جاسکتا ہے خواہ غزل۔ قطع، رباعی، مریع، مخمس اور مسدس ہو اس کی بھی بحث لمبی ہے جس کا تفصیلی جائزہ مقالہ میں موجود ہے۔

مرثیہ کی فنی اہمیت میں مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی مختلف ہیں جن میں آٹھ بتائیے گئے ہیں وہ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت، بین وغیرہ ہیں۔

مرثیہ کا آغاز چہرہ سے ہوتا ہے اور اس میں ایسے دلکش مناظر پیش کئے جاتے ہیں جس سے قاری کے ذہن پر مثبت اثر پیدا ہو۔ مثلاً صبح کا منظر، رات کا سماں یا پھر مناجات وغیرہ سراپا میں شاعر ہیر و کی تعریف و توصیف بیان کرتا ہے تاکہ جب مرثیہ کے ہیر و کے کسی نمایاں کارنامے یا اس کی عادات و اطوار اور قد و قامت کا ذکر ہو تو پڑھنے یا سننے والا بخوبی سمجھ جائے کہ ہیر و کی کن خوبیوں کو بیان کیا جا رہا ہے۔ رخصت میں مرثیہ نگار ہیر و کی رخصت کا ذکر کرتا ہے اور ہیر و کے اوصاف و کمالات کے بیان کرنے میں پوری زور آزمائی کرتا ہے۔ آمد میں شاعر ہیر و کی میدان جنگ میں آمد کو دیکھتا ہے اور دشمنوں کی حالت زار پر خوف و ہراس پھیل جاتا ہے

رجز میں شاعر ہیر کی میدان جنگ میں آکر اپنی اور اپنے بزرگوں کی بڑائی بیان کرتا ہے رزم میں شاعر مجاہد کے جنگ کرنے کا مکمل حال تفصیل سے اس انداز میں لکھ دیتا ہے کہ جنگ کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ شہادت میں مرثیہ نگار ہیر و کا بہادری کے ساتھ جنگ کرتے کرتے دشمنوں کے زرعے میں پہنچ جانا مجروح ہونا اور پھر شہید ہو جانا اس کا بیان کرتا ہے۔ بین مرثیہ کا وہ بنیادی حصہ ہے جس میں بہادر کے شہید ہو جانے کے بعد اس کے اپنوں اور عزیز واقارب کی گریہ و زاری رنج و ملال کا اظہار گریہ و زاری کی شکل میں کرتا ہے۔ مرثیہ کو ان ہی اجزائے ترکیبی کی بنیاد پر نمایاں مقام حاصل ہوا اور شعراء نے اجزائے ترکیبی کو بنیادی حیثیت کی شکل دی ہے بے شک عربی و فارسی زبان میں مرثیہ کہے گئے مگر جو مقام اردو مرثیے کو ملا وہ کیسی دوسری زبان کے مرثیے کو نہ مل سکا۔ اور مرثیے کو عروج کردار کی بلندی سے حاصل ہوتا ہے اور چونکہ اردو مرثیہ میں عام طور پر مختلف کردار نظر آتے ہیں۔ اور یہ کردار کسی بھی شکل میں ہمارے سامنے رونما ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عورت، مرد، بچہ، بزرگ، غلام، جوان، ماں، باپ دشمن عزیز اور دوست وغیرہ مرثیہ صرف معرکہ کربلا اور شہیدان کربلا کے اظہار و بیان تک محدود نہیں ہے بلکہ اب شخصی مرثیوں کا رواج شروع ہو گیا ہے جس طرح سے دنیا میں ہر چیز میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اسی طرح سے مرثیوں میں بھی کچھ تبدیلی آئی اور نئے رجحان اور نئے طریقے اختیار کیے گئے بلکہ یوں کہا جائے کہ مرثیہ میں کردار نگاری کو کافی داخل ہو گیا میر انیس کے یہاں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ ایک ہی موضوع پر مختلف مرثیے لکھے ہیں لیکن سب کا رنگ و ڈھنگ، پیرایہ اسلوب بالکل الگ تھلگ ہے۔ مقابلے کے دوسرے باب میں ایسی چیز کو اجاگر کیا گیا ہے۔

دو اقسام کے کردار مرثیہ میں ہوتے ہیں ایک وہ جو صالح حق پرست، دین اسلام کے نام پر مر مٹنے اور جاں نثار کرنے والے افراد ہیں۔ دوسرا کردار وہ جو دین اسلام سے مبرا ظالم، جفاکش اور انتہائی سفاک افراد ہیں مرثیہ میں کردار نگاری ان دو الگ الگ کردار کو کامیابی و دیانتداری کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے۔

امام حسینؑ کا کردار معرکہ کربلا میں ہیر کی حیثیت رکھتا ہے اور مرثیوں میں پیش ہونے والے تمام واقعات ان ہی کے گرد و پیش گردش کرتے ہیں۔ امام حسینؑ کو مذہبی عقیدت اور احترام کی وہ ساری بلندیاں حاصل ہیں۔ جو کسی بھی مذہبی رہنما کیلئے مخصوص ہوتی ہیں۔ مرثیہ نگاروں نے امام حسینؑ کے کردار کی اسے پیرائے میں تصویر کشی کی ہے جو ایک مثالی کردار بن گیا ہے مرثیہ نگار نے امام حسینؑ کے کردار کو بیان کرنے میں اعلیٰ جوہر پیش کیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ امام حسینؑ کا ایثار و قربانی کا جذبہ ہمدردی اور خلوص و محبت سے لبریز اعلیٰ مزاج دشمنوں کو بھی ان کی عظمت کا احساس کرا دیا ہے امام حسینؑ کی سیرت کو پیش کرنے میں انیس کو کمال

حاصل ہے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سیرت نگاری انیس سے پہلے گویا اردو میں تھی ہی نہیں انیس صاحب جس شخص کی سیرت نگاری پیش کرتے ہیں اس کا وہ پورا الحاظ رکھتے ہیں، بالخصوص امام حسینؑ کی سیرت دکھانے میں کمال کر دکھایا ہے اور ملکیت اور بشریت کو کچھ اس تناسب سے سمودیا ہے کہ وہ مقدس سیرت جس طرح دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان تھی اس طرح اردو شاعری کی دنیا میں بھی بے نظیر ہو گئی دبیر نے بھی امام کی ان کیفیت اور کردار کو اس انداز میں پیش کیا ہے مگر دونوں کا کلام پورے طور پر ایک جیسا نہیں ہے کچھ چیزیں مختلف ہیں جیسے اسلوب اور طرزِ بیاں اگرچہ یہ دونوں مرثیہ نگار ایک ہی زمانے کے ہیں لیکن موازنہ کیا جائے تو نمایاں طور پر فرق نظر آئے گا۔

حضرت امام حسینؑ کے کردار کے ساتھ ساتھ حضرت عباسؑ کے کردار پر روشنی ڈالی ہے مرثیوں میں دوسرا اہم کردار حضرت عباسؑ کا ہے جناب عباسؑ امام حسینؑ کے مختلف البطن چھوٹے بھائی حسینی شکر کے علمبردار، فنون جنگ کے زبردست ماہر، نہایت دلیر غصہ ور، بڑے قد آور اور بارعب حیواں، وفا شاعری کا مجسمہ ہیں مرثیوں میں دوسرا اہم کردار حضرت عباسؑ کا ہے اور ان کے کردار کے میر صاحب نے دو پہلو دکھائے ہیں، ایک پہلو بھائی سے زیادہ ایک وفادار اور جانثار خادم کی حیثیت میں ابھرتا ہے اس کردار کا دوسرا پہلو بہادری اور شجاعت ہے مرثیہ نگاروں نے خاص طور سے ان کے دو نمایاں پہلو پر روشنی ڈالی ہے ایک بہادری اور دوسری وفاداری میر انیسؒ نے حضرت عباسؑ کو حضرت علیؑ جیسا بہادر اور پختہ شخصیت والا بتایا ہے دبیر نے بھی حضرت عباسؑ کے کردار کی جملہ خوبیوں محبت الفت جان بازی و جانثاری، ہمت و شجاعت کو ارتقاء کے منازل تک پہنچایا ہے بعد میں آنے والے مرثیہ نگاروں نے صرف ان کی پیروی کی ہے مزید اضافہ کچھ نہیں کیا اس طرح میر انیسؒ نے بھی حضرت عباسؑ کے کردار کو بیان کرنے میں اپنے قلم کی جولانی دیکھائی ہے۔ اور حضرت عباسؑ میں وہ تمام خوبیاں اور صفات و کمالات بیان کیے ہیں۔

حضرت علی اکبرؑ کا کردار بھی بہت ہی بلند اور اعلیٰ دکھایا ہے کیونکہ حضرت علی اکبرؑ بہت خوبصورت اور انتہائی کوخو بر و نو جوان تھے اس لیے مرزا دبیر نے جہاں مرثیہ میں ان کے اوصاف و کمالات کو کردار کے آئینے میں بیان کیا ہے وہیں ان کی خوبصورتی کی بھی حد درجہ تعریف کی ہے میر انیسؒ نے بھی حضرت علی اکبرؑ کے کردار میں ایک صابر و شاکر انسان کو دکھایا ہے مگر یہی صابر و شاکر انسان کہیں کہیں رعب دار اور غیظ و غضب والے انسان کی شکل میں بھی رونما ہوتا ہے جس کا اظہار میر انیسؒ نے اپنے مرثیوں کی زبانی کیا ہے حضرت علی اکبرؑ کے کردار میں ایک غیرت مند انسان کی کیفیت کو بیان کیا ہے جو وقت و حالات کی مناسبت سے مخالف افواج کو

لرزہ بر انداختہ کرنے پر مجبور ہے انیس نے حضرت علی اکبرؑ کے کردار میں ایک ایسے جانثار اور جانباز بیٹے کی تصویر کشی کی ہے جو قربانی اور شہادت کے جذبول سے لبریز ہے اور ان کی بہادری، شجاعت و ہمت کو بخوبی بیان کیا ہے۔ اور ساتھ ہی انیس نے علی اکبرؑ کے کردار میں پاک طینت، سراپا بصیرت، نیک دل اور حق و باطل کے مابین امتیاز رکھنے والا شخص دکھایا ہے جو سچائی اور دیانت داری کی راہ مستقیم پر چلتے ہوئے اللہ کی رضا کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے اور زبان سے اُف نہیں کرتا۔

حضرت زینبؑ کے صاحب زادے عونؑ و محمدؑ بھی بہادروں کی فہرست میں اہم مقام کے مالک ہیں۔ کیونکہ ان کے دادا جعفر طیار اور نانا حضرت علیؑ دونوں حضرات لشکر رسول کے علمبردار تھے اس لیے کربلائی جنگ میں وہ خود کو حسینی فوج کی علم داری کا وارثاً مستحق سمجھتے تھے۔ اور علم نہ ملنے سے نہایت رنجیدہ تھے مگر حضرت حسینؑ نے کسی مصلحت کی بنا پر انہیں یہ زمindari نہیں سونپی عونؑ و محمدؑ کو حضرت زینبؑ کربلا کے میدان میں اپنے عزیز ترین بھائی پر قربان کر دینا چاہتی تھیں دونوں ابھی نو عمر تھے مگر کوئی بھی مرثیہ اٹھا کر دیکھ لیجیے ان دونوں کے کردار میں آپ کو کہیں بھی بچوں والی بات نظر نہیں آئیگی۔ بلکہ تمام مرثیہ نگاروں نے ان کے کردار میں حوصلہ اور باشعور کردار ہی دکھایا ہے۔ جناب زینبؑ نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو جو تربیتی سبق دیا تھا اس کا بھرپور مظاہرہ انہوں نے میدان جنگ میں کیا اور اپنی شجاعانہ و بہادرانہ کردار کے ذریعے اپنی مثال آپ قائم کی۔ میرا انیس نے حضرت عونؑ و محمدؑ کی بہادری کے کارناموں اور جوش و ولولہ، ہمت و شجاعت کو کتنی خوبصورتی کے ساتھ اپنے مرثیوں میں پیش کیا ہے کہ تین دن کے فاقوں کے باوجود دونوں نے جنگ لڑی اور کہیں بھی صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑا اور پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ مرزا دبیر نے بھی ان کے کردار میں حق و باطل کی لڑائی میں نیک دلی، جانبازی اور انتہائی حوصلہ و ہمت کا اعلیٰ ثبوت پیش کیا ہے۔

جناب قاسم امام حسن کے بڑے صاحبزادے تھے اور امام حسنؑ کے بھتیجے تھے تقریباً ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں ان کی خوبصورتی اور ان کے سراپا کی منتظر نگاری بے حد خوبصورت انداز میں پیش کی ہے میرا انیس نے تو اس صنف میں کمال کر دکھایا ہے ان کی خوبصورتی اور سراپا کی دلکشی کچھ اس طرح کی ہے گویا ہر ایک شے کا وصف (آنکھیں، ذلفیں، لب، قد، گیسو، جسم، چہرہ، گردن وغیرہ حسین ترین پیرایے میں بیان کیا ہے ایک عمدہ اور کہنہ مشق شاعر کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ جب کسی شے کی خوبصورتی اور دلکشی کو بیان کرے تو اس سے متعلق ہر ایک چیز کا ذکر کیا جائے تاکہ قارئین کو اس کی سیرت اور سراپا کی تمام خوبیوں سے واقفیت ہو جائے اور کوئی چیز پردہ اخفا میں نہ رہے میرا انیس نے پہلی ملاقات (خصوصاً اپنی نئی نویلی دلہن) کی نفسیاتی کیفیت اور

اس کی جدائی کی بے بسی اور کشمکش کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کردار کی اعلیٰ خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ مرزا دبیر نے بھی حضرت قاسم کی دلیرانہ شجاعت و بہادری اور جوش و غیظ و غضب کو اعلیٰ کردار کی شکل میں پیش کیا ہے اور جو کردار کی نمایاں خوبی ہے اسے حتی الامکان اُجاگر کیا ہے ان کی بہادری، جوش و ہمت اللہ سے محبت و رغبت اور دین اسلام پر مرٹنے کا جذبہ ان میں بھرپور موجود تھا اور یہ کسی شخصی کردار کی بلندی کی علامت ہے علاوہ ازیں ان کے کردار میں ایک نیک دل انسان اور اپنے بڑوں کی عزت و احترام اور چھوٹوں سے شفقت و محبت کرنے والا انسان نظر آتا ہے۔

ایک شخصیت حبیب ابن مظاہر کی بھی ہے جن کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔ حسینی فوج کے سب سے ضعیف اور ناتواں سپاہی تھے اس کے باوجود معرکہ کربلا میں شریک ہوئے۔ امام حسینؑ کے جگری دوست تھے دونوں کو ایک دوسرے سے بہت لگاؤ تھا محبت و عشق کا یہ عالم تھا آپ نے امام حسینؑ سے فرمایا کہ جب تک میں میدان کربلا میں شہید نہ ہو جاؤں آپ کو جنگ کے لیے جانے نہ دوں گا آپ امام حسینؑ کے سچے اور وفادار سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ عبادت گزاروں میں سے تھے مرزا دبیر نے ان کے کردار کی منظر کشی انتہائی درد آمیز طریقے سے کی ہے مرزا دبیر نے ایک ضعیف سپاہی کے عزم و ارادے کی منظر کشی کی ہے جس کی پیری میں جوانی کی جھلک نظر آتی ہے۔

ایک کردار جناب حرّ کا بھی ہے جو یزیدی لشکر کا سپہ سالار تھا۔ اور خاص طور پر امام حسینؑ کو کوفہ جانے سے روکنے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن جب امام حسینؑ کا سامنا حرّ سے ہوا تب حرّ کا لشکر پیاس کی شدت سے بے قرار تھا اور پانی کا تاحد نظر کوئی امکان نہ تھا حضرت امام حسینؑ نے ازراہ ہمدردی اسے پانی پلایا لشکر کا سارا پانی حرّ کے لشکر کو دے دیا اس عظیم واقعہ کا حرّ کے دل پر گہرا اثر ہوا اور یزید کا ساتھ چھوڑ کر حرّ نے امام کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے یزیدی لشکر سے مقابل ہو کر جام شہادت نوش فرمایا۔ میر انیس نے ان کی بہادری اور شجاعت کے نمونے پیش کیے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی عظمت و بلندی کو اُجاگر کیا ہے ان کی بہادری اور پاکیزگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ شہادت کے وقت حضرت امام حسینؑ کا زانو حرّ و نصیب ہوا اور اس طرح دوزخ سے خلاصی ہوئی اور اسے لا جواب موتی بنا دیا۔ ایک نیک عمل کے بدلے اس کی زندگی کے تمام گناہ معاف فرما دیے۔

جہاں مرثیہ نگاروں نے حسینی افواج کی خوبیوں اور ایثار و قربانی پر گہری روشنی ڈالی ہے وہیں یزیدی افواج کے ظلم اور بربریت بے رحمی، سنگ دلی جیسے مذموم حرکتوں کی تصویر کشی کی ہے ان افواج میں جو لوگ

شامل تھے اور جنہیں ان گھناؤنی سازش کے لیے چنا گیا تھا ان میں عبید اللہ بن زیاد، شمر بن الجوشن، عمر بن سعد، حرمہ بن کامل اسدی، خوی، ازرق، ہندیا ہندہ، حارث، جمال کے نام سرفہرست ہیں ان حضرات نے اپنی مجرمانہ حرکت کو بروئے کار لانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ عمر سعد امام حسینؑ کو دریا کے کنارے خیمہ لگانے سے روکا تا کہ انہیں پینے کا پانی نصیب نہ ہو۔ میر انیس نے عمر بن سعد کی مجرمانہ حرکتوں کو اپنے مرثیے میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جس میں عمر سعد کی کم ظرفی، بہیمانہ اور وحشیانہ پن جھلکتا ہے اس کا مقصد صرف امام کو بھوکا و پیاسا قتل کرنا تھا اس کے بعد شمر بن الجوشن کے کردار پر نگاہ ڈالتے ہوئے میر صاحب نے اسے انتہائی ظالم و جابر شخص کہا ہے اور اس کے سفاکانہ کردار اور بربریت کا یہ عالم تھا کہ زخمی حالت میں امام حسینؑ کے سینے پر چڑھ کر ان کا سر قلم کیا اور ان کے سر کو نیزہ پر چڑھایا عمامہ کو اپنے سر پر باندھا اس نے جناب سیکنہ کے دونوں گوشوارے چھینے جس سے ان کے دونوں کان زخمی ہو گئے۔ حسینی قافلہ کا کربلا کے میدان میں پہنچنے اور اس موقع پر شمر کے کردار کو میر دبیر نے بہترین انداز میں پیش کیا ہے مندرجہ بالا دس نام ایسے ہیں جن میں دو کا ذکر مجمل طور پر کر دیا گیا ہے باقی لوگ بھی اپنی ظلم و بربریت سرکشی اور ظلم و ستم میں سرفہرست ہیں۔ جنہوں نے اہلبیت پر ظلم ڈھانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

تاریخ اسلام میں امام حسینؑ کے سپاہیوں کا کردار بھی اعلیٰ مرتبت کا حامل ہے جس میں اہلبیت کے علاوہ مختلف مکی مدنی قبیلے کے جانثار اور جانباز افراد کا ایک ہجوم تھا جس نے حق و باطل کی لڑائی میں امام حسینؑ کا ساتھ دیا میر انیس نے ان کے کردار و اوصاف کو انتہائی دلکش انداز میں بیان کیا ہے اور حسینی افواج کے سپاہیوں کی بہادری کو بیان کرنے میں اپنی بہترین فنی کمالات کا مظاہرہ کیا ہے اور ان کے شجاعت بھرے کارناموں اور ان کی امام حسینؑ سے سچی الفت و محبت اور عقیدت کو کردار کے آئینہ کی طرح پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خواتین کے کردار کو ان کے فطری لب و لہجہ کے ساتھ اس انداز سے مرثیے کے قالب میں ڈھالا ہے جس سے اصل حقیقت ذہن و شعور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ تاریخ اسلام میں خواتین کے کردار کا جائزہ لیا جائے۔

تاریخ اسلام کے مطالعہ کے بعد یہ چیز پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام سے پہلے سماج میں عورت کا کیا مقام تھا عورت کا وجود ایک فال بد سمجھا جاتا تھا اور انہیں زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اسلام نے اس گھناؤنی رسم کو ختم کیا اور عورت کو سماج میں بلند مقام دیا اور ساتھ ساتھ ان کو برابری کا حق دیا۔ واقعہ کربلا جہاں حق و باطل اور خیر و شر کا معرکہ ہوا اور اسی میں ایک جانب اگر مرد صداقت کے حامی تھے تو دوسری جانب

عورتوں نے حق و صداقت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

واقعہ کربلا جہاں امام حسینؑ کے بہادر اور جاں نثار رفیقوں نے قربانی اور سرفروشی کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا وہی امام حسینؑ کے خاندان کی عورتوں کے اعلیٰ اخلاق اور کردار تاریخ کے صفات میں قائم و دائم رہیں گے۔ میر انیس نے ان خواتین کے عزم اور ایثار کی سیرت نگاری اور ان کے کردار کی عیاں تصویر حسن بیان کے ساتھ وہ کرشمہ دکھایا کہ جیسے ہر تصویر زبان سے بولنے لگی۔

میر انیس نے اس دردناک منظر کو جیسے اہلیت کی عورتوں کو جھیلنا پڑا اور جس خندہ پیشانی سے ان خواتین نے اس دردناک منظر کا سامنا کیا اس کو پیش کرنے کا ایک نرالا ڈھنگ اپنایا۔

خواتین کو عام طور پر کم زور، بزدل اور جذباتی مانا جاتا ہے مشکل حالات میں وہ جلد ہار جاتی ہیں۔ مگر خواتین کربلا نے جس صبر و تحمل اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے عام مردوں کے لیے وہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ جن محفلوں میں انیس کا کلام پڑھا جاتا ہے وہاں جناب فاطمہ زہرہ، صغرا، ام کلثومؑ اور شہر بانوؑ، سیکنہ، کبریٰ، ام البنینؑ اور زوجہ عباسؑ بڑی محبوب اور دلکش ہستیاں ہیں اور ان کے ساتھ فضہ، ہندہ، شیریں زوجہ حارث اور بنی اسد کی عورتوں سے بھی انہیں لگاؤ ہوتا ہے وہ ان کو اپنی ہی جیسی محبت اہلیت سمجھ کر دوست اور عزیز رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا خواتین جو میدان کربلا میں امام کے شانہ بشانہ رہی ہیں ان میں سے کچھ اہلیت کے خاندان کی ہیں اور کچھ دوسرے قبیلے کی ہیں۔ اور کچھ کنیریں ہیں اور کچھ عورتیں اس قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں جو اہلیت کے مخالفوں میں سے ہیں کچھ حسینؑ کے قاتلوں میں سے ہیں جن کا معرکہ کربلا میں اہم کردار ہے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ وہ عورتیں جو مخالفین میں سے تھیں ان کے شوہروں نے معرکہ کربلا میں کوئی ایسی کسر ناٹھا رکھی جس سے اہلیت کو پریشانی اور ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

جن خواتین کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ان میں سے فاطمہ زہرا کا نام سرفہرست ہے یہ حضرت پیغمبرؐ کی بیٹی تھیں ان کے اندرز ہدایت و تقویٰ، علم و فضل، ایثار و قربانی، خدمت اور جفاکشی، خدا ترسی اور فیاضی، صبر و برداشت جیسی خوبیاں موجود تھیں۔ میر انیس نے ان کی خوبیوں کو ہندوستانی رنگ و روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے آپ کی شادی حضرت علیؑ سے ہوئی اور معرکہ کربلا کے ہیر و حضرت حسینؑ کی ماں تھیں۔ ان کے دوسرے بیٹے کا نام حسنؑ اور حسینؑ تھا ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ یہ عزت و شرافت کا نمونہ تھیں۔ ان کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ صبر و شکر کا ایک نمونہ تھیں۔ تاریخ کربلا میں اور جو عورتیں اہم خصوصیات کی حامل تھیں ان میں جناب

رباب کا نام بھی ہے یہ حضرت حسینؑ کی بیوی تھیں اور صبر و شکر کا ایک نمونہ تھیں۔ ان کا تعلق بنی کلب سے تھا اور والد کا نام امرؤ القیس تھا۔ تیسری شخصیت اُم فروہؓ کی ہے یہ جوانی میں بیوہ ہو گئیں تھیں اور اپنے بیٹوں میں قاسمؓ سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ ایثار و قربانی کا جو مقابلہ خاندان میں نبوت کی عورتوں میں ہو رہا تھا ان میں یہ کسی سے پیچھے نہیں تھیں۔ اس کے بعد فاطمہ کبریٰؓ ایسی شخصیت تھیں یہ امام حسینؑ کی نوعمر بیٹی تھیں شام کو ان کا نکاح ہوا اور صبح ہی ان کے شوہر نے جام شہادت نوش فرمایا۔ ایک با حوصلہ اور بہادر خاتون تھیں اور حضرت قاسمؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے جو صبر و شکر کا مظاہرہ کیا وہ ایک بے مثال نمونہ ہے جناب زینب کبریٰؓ جو فاطمہ زہراؓ کی بیٹی تھیں حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد زینب کو اُم البنینؓ اور اسماءؓ جیسی نیک طینت خاتون کے ساتھ رہنے کا اشتیاق ہوا۔ پردے کی اتنی پابند تھیں جس گھر میں کراے دار کی حیثیت سے رہتی تھیں اس نے ان کا قد و قامت کبھی نہیں دیکھا تھا۔

امام حسینؑ کی سب سے چھوٹی بہن اُم کلثومؓ تھیں جنہوں نے حضرت فاطمہؓ جیسی ماں اور حضرت علیؑ جیسا باپ نصیب ہوا اُن کی پاک دامنی قابل ذکر ہے ان کا نکاح حضرت عمرؓ سے ہوا تھا۔

سکینہ بنت حسینؑ اُن ہی خواتین کر بلا میں ہیں جنہوں نے میدان کر بلا میں ایک اہم کردار ادا کیا تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ واقعہ کر بلا کے بعد سکینہؓ سوگ نشین ہو گئیں اور اسی غم میں وفات پائی۔

ساتھ ساتھ اُم لیلیٰ جو حضرت حسینؑ کی بیوی تھیں اور کر بلا کے سفر میں امام کے ساتھ تھیں۔ اور ان کی دوسری بیوی شہر بانوؓ جو واقعہ کر بلا میں آپ کے شانہ بشانہ رہیں اور کنیزانِ اہلبیت میں فضہؓ اور شیریںؓ کا نام سر فہرست ہے جنہیں اہلبیت سے بے حد لگاؤ تھا اور گہری عقیدت مندی تھیں اور یہ تمام خواتین اعلیٰ صفات کی مالک تھیں۔ مقالے کے تیسرے باب میں ان تمام خواتین کا تفصیلی ذکر پیش کیا گیا ہے۔ میر انیس کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ عورت کی نفسیات جذبات کردار اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں ان کو دسترس حاصل ہے۔ کردار کی جذباتی کشمکش، نفسیاتی کیفیت، اس کا بات چیت کا انداز رکھ رکھاؤ ٹھیک ویسا ہی پیش کرتے ہیں جیسا کردار کا ہونا چاہیے اور اس طرح ہر کردار کی انفرادیت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے وہ کردار چاہے جناب زینبؓ کا شہر بانوؓ، زوجہ عباسؓ، صغراؓ کا، سکینہؓ، اُم کلثومؓ، فضہؓ، شیریںؓ یا پھر کنیزانِ اہلبیت کا سب کے کردار کی ترجمانی کرنے میں انیس کو کمال حاصل ہے کہ جیسے تصویریں خود بات کرتی ہیں اسی لیے ان کو بہترین مصوّر اور با کمال مرقع نگار کہا جاتا ہے جو پڑھنے والوں کے دل میں ہمدردی اور محبت ہی نہیں بلکہ ایک گہرا لگاؤ ہو جاتا ہے۔ جو خونی رشتے کے برابر ہو جاتا ہے اور ایک ادیب کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ مافی الضمیر کو آئینے کی طرح

سے دوسروں کے سامنے رکھ دے۔

مقالے کے آخری باب میں خواتین کربلا کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خواتین کربلا کی سیرت نگاری میر انیس نے ایسے انداز میں پیش کی ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ میر انیس نے رزمیہ نظم کی شکل میں اردو کو جو انمول تحفہ دیا ہے اور اردو شاعری کو رزمیہ نظم کی شکل میں مرثیے کے اندر ایسے انداز میں پیش کیا ہے وہ نہایت جاذب اور دلکش ہے اور اردو کے لیے گراں مایہ تحفہ ہے حالی نے میر انیس کو ایک اہم شاعر گردانتے ہوئے جو رباعی کی شکل میں پیش کی ہے جس سے میر انیس کی ہستی اور ان کی انفرادی حیثیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

"اردو، گوراج چار سو تیرا ہے
ملکوں میں رواج گو بکھو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن باقی ہے
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے"

مقالے میں خواتین کے کردار کی مرقع کشی میں میر انیس نے ایک ایک پہلو کو اجاگر کر کے ایک نمونہ پیش کر دیا ہے ان میں حضرت زینبؓ جو امام حسینؑ کی بہن جن کا شمار کربلا کی اہم خواتین میں ہوتا ہے جو ایک بلند و بالا ہستی اور منفرد شخصیت کی مالک ہیں۔ جناب زینبؓ نے اپنے بھائی کے ساتھ جو مصائب اور سختی اور ظلم و ستم برداشت کیا اور جو پریشانیاں بھائی کے ساتھ اور ان کے شہید ہونے کے بعد اٹھائیں اس کو میر انیس نے بہت ہی درد انگیز انداز میں بیان کیا ہے جناب زینبؓ کا کردار انیس کے مرثیوں کا سب سے محبوب موضوع رہا ہے انیس کا کوئی بھی مرثیہ جناب زینبؓ کے ذکر سے خالی نہیں انیس نے امام حسینؑ کے کردار کی طرح جناب زینبؓ کے کردار کو ایک مرکزی حیثیت دی ہے اور تاریخی اسلامی و انسانی میں ایک منفرد واقعہ اور عورت کی عظمت کا ایک اہم پہلو ہے۔ جناب زینبؓ کے کردار میں روحانیت کے ساتھ ساتھ انسانی اور نسوانی جذبات کے مناسب امتزاج پیش کیے ہیں۔

انیس نے شہر بانوؓ کے کردار میں امام حسینؑ سے گہری عقیدت اور محبت کو دکھایا ہے جو ہمیشہ اپنے شوہر کی رضا جوئی کی کوشش کرتی رہتی تھیں انیس نے شہر بانوؓ کے کردار میں ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی بیوی کا کردار بہت نمایاں دکھایا ہے۔ انیس نے شہر بانوؓ کے کردار میں جناب زینبؓ جیسی اعلیٰ ظرفی، عظمت اور بلند

حوصلہ مندی نہیں دکھائی ہے مگر وفا شعار بیوی، جاں نثار ماں اور حق پرست مومن بیوی کا مکمل کردار شہر بانو کے اندر ہے جس کا آئینہ دار انیس کے مرثیے ہیں۔

انیس نے جناب فاطمہ کے کردار میں بھی روحانیت اور عظمت دکھائی ہے وہ رسول خدا کی بیٹی ہیں اور اسلامی سماج میں ان کی شخصیت اتنی بالاتر ہے جس کا احترام ہر فرقہ کے مسلمان کرتے ہیں۔ انیس نے ان کے کردار میں خدا ترسی، پرہیز گاری، علم و فضل ہمدردی، محنت خوف سخاوت جیسی خوبیوں کو دکھایا ہے جس کا ذکر اس مقالے میں موجود ہے۔

اس مقالے میں اُمّ البنین اور زوجہ عباس کے کردار کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اُمّ البنین جو حضرت عباس کی والدہ تھیں انیس نے ان دونوں اُمّ البنین اور زوجہ عباس کے کردار میں اعلیٰ ظرفی دکھائی ہے اور دونوں کے آپسی رشتے میں عزت و احترام اور محبت و ہمدردی کو دکھایا ہے۔ اُمّ البنین نے سوتیلی ماں ہوتے ہوئے بھی کبھی جناب عباس اور امام حسینؑ میں فرق نہیں کیا۔ انیس نے سوتیلی ماں کی ہمدردی شفقت اور قربانی کو بڑے کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انیس نے سوتیلی ماں اور سوتیلے بیٹے کے اندر احترام کے جذبات کو دکھایا ہے کہ ایک ماں نے اپنے بچوں کے دل میں سوتیلے بھائی بہن کی محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کے بھر دیا ہے۔ زوجہ عباس کے کردار میں بھی نیکی شرافت اور پاکیزگی اور اپنے شوہر کے لیے عزت و احترام کو دکھایا ہے۔

انیس نے اُمّ کلثوم کے کردار میں بہت سی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ امام حسینؑ کی چھوٹی بہن ہیں وہ لا اولاد تھیں اور شروع سے آخر تک امام حسینؑ کے شانہ بشانہ شریک رہیں اور کسی بھی مقام پر صبر اور استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور ہر مقام پر ثابت قدم رہیں۔ اور مصائب کو ہنس کر برداشت کیا۔

فاطمہ کبریٰؑ امام کی بڑی صاحب زادی تھیں فاطمہ صغریٰؑ چھوٹی صاحب زادی تھیں جو بیماری کی وجہ سے امام کے ساتھ نہ جاسکیں جس کا اس بچی کو بڑا ملال تھا۔ انیس نے ان دونوں کے کردار میں اپنوں کے لیے محبت اور بڑوں کے لیے عزت و احترام کو دکھایا ہے۔

جناب سکینہؑ جو امام حسینؑ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں ان کو معصوم کر بلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے انیس نے مرثیہ میں ان کا کردار ایک بے حد لاڈلی مگر انتہائی ذہین اور صابر و شاکر بچی کے روپ میں ابھارا ہے اور ان کے کردار میں وقت کے ساتھ ساتھ سنجیدگی، برداشت پختگی کو بھی دکھایا ہے جو ان کے کردار کی اہم خوبی ہے۔

ساتھ ساتھ میر انیس نے عام عورتوں کی سہرت و کردار کو بھی اجاگر کیا ہے میر صاحب نے عام عورتوں

کی سیرت نگاری میں اپنے کمال شاعری کا مظاہرہ کیا ہے ان میں کنیزانِ اہلبیت نے دشمنوں کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج اور روگردانی کی ایسی مثال پیش کی ہے جو ایک نادر مثال ہے اور یہ اس نازک موڑ پر جب صاحبِ اقتدار حکومت عہدہ اور مال و دولت کی حوس کی وجہ سے اندھے اور بہرے ہو چکے تھے۔ اور ظلم و ستم کو اپنا شیوہ بنالیا تھا۔ ایسے نازک موڑ پر ان عورتوں نے ظلم و ستم کی مخالفت کی ان کنیزوں میں فضہؓ کا مقام سب سے اعلیٰ ہے۔ فضہؓ نے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ فضہؓ کے کردار کو میر انیس نے بڑے جاندار اور حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ شیریںؓ بھی ان کنیزوں میں سے ایک ہیں جو شہر بانوؓ کے ساتھ غلام بن کر آئیں تھیں۔ شہر بانوؓ نے اسے پالا پوسا اور پھر آزاد کر کے دمشق کے ایک رئیس سے شادی کر دی۔ ان کو بھی اہلبیت سے والہانہ لگاؤ تھا جب اسے واقعہ کربلا کی اطلاع ملی تو اس کو بڑا دکھ ہوا۔ لیکن مجبور تھیں سوائے رنج و غم کے کچھ نہیں کر سکتی تھیں کنیزانِ اہلبیت کی سیرت نگاری میں انیسؓ نے کمال کر دکھایا ہے اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انیسؓ عورت کے جذبات و احساسات کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے اور ان جذبات و احساسات کو کردار کے ذریعہ پیش کر دیتے تھے۔

انیسؓ نے ان خواتین کی کردار نگاری بھی بے حد اچھے انداز میں پیش کی ہے جو خواتین دشمنوں کے عقد میں تھیں۔ لیکن انہیں اہلبیت سے بے حد لگاؤ تھا اور ان سے گہری عقیدت رکھتی تھیں ان خواتین میں ہندہ، خولی کی دو بیویاں، حارث کی بیوی بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے اس واقعہ کربلا کی بے حد مذمت کی اور ظلم و ستم کو روکنے کی بے حد کوشش کی اور اپنے شوہر کی اس حرکت پر زبردست غم و غصہ کا اظہار کیا۔ انیسؓ نے ان خواتین کے کردار کو بھی بے حد موثر طریقے سے پیش کیا ہے اور ان کے کردار میں بھی اعلیٰ ظرفی، ہمدردی، اہلبیت سے عقیدت و محبت کو پیش کیا ہے۔

الحاصل انیسؓ نے مرثیے میں جس خاتون کردار کو بھی موضوعِ نظم بنایا۔ اسے ایک شہکار بنا کر پیش کیا اور ہر کردار کو اس نظر سے دیکھا ہے جس نظر سے صاحبِ کردار اپنا کردار دیکھتا ہے۔ اسی لیے مرثیے کے دیگر کردار نگاروں کے درمیان انیسؓ کو جو تفوق اور برتری حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی۔ میر انیس کے قلمی شہکار کو دیکھ کر زبان پر بے ساختہ یہ مصرع جاری ہوتا ہے ۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے



Dated: 26.10.2009

Certificate

This is to certify that the Thesis entitled “**Meer Anis Ke Marsiyon Mein Kirdarnigari (Khawateen Ke Khususy Hawale Se)**” is the bonafide work carried out by **Miss. Nishat Naqvi** under my supervision and guidance. She is allowed to submit the Thesis for the award of Ph.D. Degree in Urdu from the Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh.

A stylized, handwritten signature in black ink, consisting of several loops and a long horizontal stroke.

(Prof. Khursheed Ahmad)
Chairperson

A handwritten signature in black ink, featuring a cursive style with a prominent 'S' and a horizontal line.

(Dr. Saghir Afraheim)
Supervisor

فہرست

ابتدائیہ ۸-۴

باب اول : مرثیہ کافن ۲۸-۹

☆ تعریف

☆ اردو مرثیہ کا آغاز

☆ شمالی ہند میں اردو مرثیہ

☆ مرثیہ کی مذہبی اہمیت

☆ فنی حیثیت

☆ مرثیہ کے موضوعات

☆ مرثیہ کی ہیئت

☆ اجزاء ترکیبی

باب دوم : اردو مرثیوں میں کردار نگاری ۱۱۲-۴۹

(الف) اردو مرثیوں میں کردار

☆ ممدوحین

☆ مخالفین

www.emarsiya.com

(ب) کردار نگاری کے مواقع

- ☆ سراپا
- ☆ رخصت
- ☆ آمد
- ☆ رجز
- ☆ وقت جنگ تضامت/ کیفیت
- ☆ مکالمے
- ☆ عمل

باب سوئم : خواتین کر بلا ۱۱۳-۱۴۱

- ☆ جناب فاطمہ
- ☆ جناب رباب
- ☆ جناب زینب
- ☆ شہربانو
- ☆ اُم کلثوم
- ☆ اُم فروہ
- ☆ جناب سکینہ
- ☆ فاطمہ کبری
- ☆ ام البنین
- ☆ کنیزان اہل بیت

پاب چہارم : میرانیس کے مرثیوں میں خواتین کی کردار نگاری ۱۴۲-۲۳۴

☆ ان کے مرثیہ کی مناسبت سے

☆ ان کے سماجی رشتوں کے حوالے سے

☆ ان کی اپنی فطرت اور مزاج کے حوالے سے

۲۳۵-۲۵۲ حاصل مطالعہ

۲۵۳-۲۵۸ کتابیات

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے ویس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

صدرہ طاہر : 03340120123

حسین سیالوی : 03056406067

ابتدائیہ

ابتدائیہ

فکرو فن کی دنیا میں تحقیق کی بڑی اہمیت ہے اس کام کے لئے قلم کار کو کئی مراحل کا سامنا کرنا پڑتا ہے دراصل کسی بھی کام میں قلم کار کو اس وقت تک کامیابی نہیں مل سکتی جب تک وہ یکسوئی اور لگن کا مظاہرہ نہ کرے۔ اور اس کامیابی سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہوتی جو لگن سے حاصل ہو۔ یہی معاملہ تحقیق کے کام میں سرگرداں لوگوں کا ہوتا ہے جو آخر کار اپنی انتھک کوششوں سے کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

میرے تحقیقی مطالعہ کا موضوع "میر انیس کے مرثیوں میں کردار نگاری (خواتین کے خصوصی حوالے سے)" ہے اب تک انیس پر بحیثیت مرثیہ گو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جن میں سید مسعود حسن رضوی کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے انیس پر بڑی تحقیق کی ہے اور ان کو وہ مقام دیا ہے جس کا مقابلہ کوئی مرثیہ نگار نہیں کر سکتا۔

میر انیس کی کلیات میں سینکڑوں مرثیے اور لاکھوں اشعار شامل ہیں۔ جن میں خواتین کے کردار کا نہایت عمدہ کی سے نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ نمونہ ہیں جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انیس کی نگاہ میں عورت کا مقام بہت بلند رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے مرثیوں میں خواتین کی کردار نگاری اس انداز سے کی ہے کہ ان کی تمام صفات ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں اور یہ تحقیقی مطالعہ ان ہی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی ادنیٰ سی کوشش ہے۔

اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ میں نے کم عمری ہی سے انیس کے کلام کو نہ صرف سنا

بلکہ پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا یہ اور بات تھی کہ ان کے کلام کے مطالب اور محاسن برسوں بعد شعوری طور پر سمجھ میں آئے مگر غیر شعوری طور پر بچپن ہی سے میں ان سے متاثر ہونا شروع ہو گئی تھی اور اس کی وجہ وہ مجالس تھیں جس میں ہمیشہ پابندی سے جاتی تھی۔

تعلیم کے ابتدائی مراحل میں نے شروع سے آخر تک سرسیدؒ کی دانش گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پورے کیے۔ اردو زبان سے شروع ہی سے دلچسپی رہی۔ اردو زبان اور انیس کے کلام سے والہانہ محبت نے ہی پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ کے لیے تحریک بہم پہنچائی۔ چنانچہ "میر انیس کے مرثیوں میں خواتین کی کردار نگاری" عنوان سے مقالہ عالم وجود میں آیا۔

اس مقالے کے تعلق سے جتنا مواد اور ماحذ کوشش بسیار کے بعد مجھے دستیاب ہوئے، ان کی بنیاد پر اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب مرثیہ کے فن پر مشتمل ہے جس میں مرثیہ کی تعریف، قسمیں، آغاز، موضوعات، ہیئت پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی فنی اور مذہبی حیثیت و اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

اس مقالہ کا دوسرا باب اردو مرثیوں میں کردار نگاری پر مشتمل ہے۔ کردار نگاری میں ممدوحین اور مخالفین دونوں کا تفصیلی ذکر ہے۔ جن میں دونوں کے کرداروں کی تمام خوبیاں اور خامیاں اس طرح پیش کی گئی ہیں جو انسانی فطرت میں شامل ہیں اور جن کے توسط سے مرثیوں میں جدت اور ندرت پیدا کی گئی ہے۔

اس مقالہ کے تیسرے باب میں خواتین کو بلا خصوصاً ۱۔ جناب زینبؑ ۲۔ جناب فاطمہ زہرہؑ، ۳۔ جناب شہر بانوؑ ۴۔ فاطمہ کبریٰؑ ۵۔ جناب سکینہؑ ۶۔ اُم البنین ۷۔ زوجہ عباسؑ، ۸۔ جناب ربابؑ، ۹۔ کنیزان اہلبیت ۱۰۔ جناب اُم فروہ ۱۱۔ اُم کلثوم ۱۲۔ جناب اُم لیلیٰ وغیرہ کی شخصیات اور صفات کو احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔

مقالہ کے چوتھے باب میں ان خواتین کے کردار کا کلام انیس کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا ہے ان خواتین کے کردار کا بیان ان کے سماجی رشتوں کے حوالے سے بھی ہے اور ان کی اپنی فطرت اور مزاج کے تعلق سے بھی ہے۔

پانچویں باب میں مذکورہ بالا چاروں باب کا مدلل بیان ہے جن باب کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں نتیجہ بھی نکالا گیا ہے۔

مقالے کے آخر میں فہرست کتب: بعنوان کتابیات شامل ہے۔ اس مقالہ کی تیاری میں جن سے براہ راست یا بالواسطہ استفادہ کیا گیا ہے۔

تعلیمی سفر میں میں نے کئی نشیب و فراز دیکھے، منزل کو پانے کے لیے انتھک کوشش کی۔ رات دن ایک کیے چونکہ موضوع اپنی پسند کا تھا اس لیے بے حد تھکان ہونے کے باوجود کبھی تھکنے کا احساس نہیں ہوا۔ جہاں تک پی۔ ایچ۔ ڈی کا تعلق ہے۔ یہ چیز ہے دیگر است ایک دشوار ترین مرحلہ ثابت ہوا ایک طرف موضوع کی وسعتیں، اس کا پھیلاؤ اور دوسری طرف معیار کا پاس۔ بہر کیف "ہمت مرداں مددِ خدا"

کسی بھی کام کی تکمیل ایک مشکل مرحلہ ہے اور اس کام کی تکمیل میں کسی ایک شخص کا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ نہ جانے کتنے لوگوں کی محنت شامل ہوتی ہے میرے مقالہ کو پائے تکمیل تک پہنچانے میں جن لوگوں کی کرم فرمائیاں شامل ہیں، میں ان سبھی کے لیے سراپا سیاست ہوں تاہم چند شخصیات کا بطور خاص تذکرہ ضروری ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے نگراں پروفیسر صغیر افرامیم کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جن کی نگرانی میں، میں نے یہ مقالہ مکمل کیا اور جس کی کاوشوں اور قدم قدم پر دیے گئے بیش قیمت مشوروں نے مجھے یہ دن دکھایا کہ میں اس اہم مقام تک پہنچنے میں کامیاب و کامران ہوئی ہوں۔ پروفیسر صغیر افرامیم کے علم کی عظمت اور تجربہ کی روشنی میں جو انمول

موتی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے کی شکل میں مجھے حاصل ہوا ہے اس کو میں ہمیشہ دل کی گہرائیوں میں محفوظ رکھوں گی۔ میرے پاس نہ الفاظ ہیں اور نہ ہی سلیقہ کہ میں اپنے معزز اور محترم استاد مکرم کا شکریہ ادا کر سکوں۔ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ استاد محترم صغیر افرام صاحب کو صحت و سلامتی عطا ہو۔ تاکہ ان کی رہنمائی میں مجھ جیسے طالب علم اپنے علم کی پیاس کو سیراب کرتے رہیں۔ ان کی محبتوں اور عنایتوں کا شکریہ میں تا زندگی ادا نہیں کر سکتی۔

والدین اللہ پاک کی دی ہوئی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں جن کی محنت، محبت اور دعائیں منزل تک پہنچاتی ہیں۔ میں اپنے والدین کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی محنت اور دعاؤں نے مجھے اس منزل تک پہنچایا۔

میں اپنے شعبہ کے صدر پروفیسر خورشید احمد کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے دوران تحقیق میری مدد کی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

میں پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر عقیل احمد صدیقی، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر طارق چھتری، ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر مہتاب حید نقوی، ڈاکٹر سیما صغیر کی بھی ممنون و مشکور ہوں کہ ان تمام اساتذہ نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔

مولانا آزاد لائبریری کے اردو سیکشن کی انچارج شائستہ خان صاحبہ، شعبہ اردو انچارج سہیل احمد اور مولانا آزاد لائبریری کے باقر حسین، فحس جعفری، نسرین آپا کے شکریے کے لیے رسمی الفاظ نا کافی ہیں کیوں کہ ان لوگوں نے کتابوں کی فراہمی میں ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ ان کی مدد کے بغیر یہ مقالہ پائے تکمیل کو شاید نہ پہنچ پاتا۔

ان دوستوں اور ساتھیوں کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں جن کی الفتوں نے مجھے ہر

مقام پر سہارا دیا۔ نصحت، مامون، آفتاب عالم، نذرانہ، صلاح الدین، افسانہ، فرحت زہرہ، طارق کا تہہ دل سے شکریہ کیونکہ یہ لوگ میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔
میں اپنی خالہ کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ ان کی کاوشیں ہمیشہ شامل حال رہیں۔

نشاط نقوی

ریسرچ اسکالر

شعبہ اردو، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

باب اول

مرثیہ کافن

- | | | | |
|---|---------------------------|---|----------------------|
| ☆ | تعریف | ☆ | اُردو مرثیہ کا آغاز |
| ☆ | شمالی ہند میں اُردو مرثیہ | ☆ | مرثیہ کی مذہبی اہمیت |
| ☆ | فنی حیثیت | ☆ | مرثیہ کے موضوعات |
| ☆ | مرثیہ کی ہیئت | ☆ | اجزائے ترکیبی |

باب اول

مرثیہ کا فن

مرثیہ کی تعریف:

مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ ”رثی“ یا ”رث“ یعنی ”رٹی ریٹی“ یا ”رٹو ریٹو“ آتا ہے جس کے معنی میت پر رونا اور اس کی خوبیاں بیان کرنا ہے یا میت کے اوصاف و کمالات اور محاسن کو اشعار کے پیرائے میں بیان کرنا ہے۔

اصناف سخن میں مرثیہ ایک اہم صنف ہے عربوں کے یہاں مرثیہ گوئی اتنی قدیم ہے جتنی ان کی شاعری۔

عرب شعراء مرنے والے کے مناقب و محاسن اور اوصاف و کمالات بیان کرتے اور اس کی موت پر اپنے حزن و غم رنج و الم درد و کرب کا اظہار کرتے اور اسے ایک عظیم صدمہ قرار دیتے تھے۔ قدیم عرب میں ”مہلہل“ بن ربیعہ کے مرثیے مشہور ہیں (۱) زمانہ جاہلیت میں عرب شعراء اپنے بہادروں کے مرثیے اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی کہتے تھے کہ اپنے مقتولوں کا بدلہ لینے کے لئے اکسائیں اور آتش انتقام برافروختہ کریں وہ مرنے والوں کے مناقب و محاسن کے ساتھ ساتھ ان کی بہادری اور جرأت و حماست بھی بیان کرتے۔ اس صنف میں صرف مرد ہی پیش پیش نہیں رہتے بلکہ مرثیہ گوئی میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ عورتیں مرثیہ گوئی کے علاوہ مقتولوں پر نوحہ و ماتم بھی کرتیں اور یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہتا۔ وہ قبروں پر قبیلے کی مجالس اور بڑے بڑے میلوں ٹھیلوں

میں گریہ وزاری اور نوحہ خوانی کے علاوہ سینہ کو پی کرتیں اور اپنا منہ پیٹتیں۔

ماتم کے سلسلے میں بعض عورتوں کے سر منڈوانے کا بھی ذکر ملتا ہے (۲) بعض ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جب کسی شاعر کو یہ محسوس ہوا کہ اس کی موت سر پر آ پہنچی ہے تو وہ خود اپنا مرثیہ کہہ دیتا اور موت کے بعد اس کے ساتھ کیا جانے والا برتاؤ کا بھی ذکر کرتا مثلاً وہ مرثیہ جو ”المزق العبدی“ یا یزید بن خذاق کی طرف منسوب ہے میدان جنگ میں قتل ہونے والوں کا بکثرت نوحہ کیا جاتا اور مقتول کے قبیلے اور خاندان کے لئے اس کے کارناموں کو باعث فخر و عز و شرف قرار دیا جاتا تھا مثلاً ”المرقش“ کا قصیدہ ۳

شعراء عرب نے اپنے اشراف و سادات کی طبعی موت پر بھی مرثیے کہے اور ان کے اوصاف حمیدہ اور اعمال جمیلہ کی دل کھول کر داد دی مثلاً فضالہ بن کلدہ الاسعدی کی موت پر ”اوس بن حجر“ کا مرثیہ ۴

اسلام کے ابتدائی عہد بالخصوص عہد نبوی میں بھی مرثیہ گوئی ملتی ہے مشرکین نے اپنے مقتولوں پر اور مسلمان شعراء نے اپنے شہیدوں پر بھی مرثیے کہے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصال پر بھی مرثیے کہے گئے ۵۔ جن میں حضرت حسان بن ثابت کا مرثیہ زیادہ مشہور ہے ۶۔ اس کے علاوہ حضرت حسان بن ثابت نے خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام کی وفات پر بھی مرثیے کہے ہیں عہد جاہلیت میں ایسا بھی ہوا کہ مرنے والے کا مرثیہ اس اسلوب میں بیان کیا گیا کہ اسے حماسیات میں شامل کر لیا گیا۔ عہد عباسی میں کسی بڑے سپہ سالار یا قائد عسا کر کی موت پر شعراء کرام نے اس کے صبر و استقلال عزم و ہمت اور جرأت و شجاعت کے خوب گن گائے اور قوم و ملت کے لئے اس کی موت کو جانکاہ صدمہ قرار دیا مگر اسی کے ساتھ جذبہ دفاع و وطن کو خوب ابھارا اور میدان جہاد میں بہادری کے جوہر دکھانے کے جذبات کو برا فروختہ کیا ۷۔

شعراء نے تعزیت کے لئے یہ اسلوب بھی اپنایا کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی مفر

نہیں۔ موت نے ہر انسان کو آلینا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا ۹ شعراء اپنے مرثیوں میں اعزہ واقارب کی موت کے باعث جدائی کو فراق کی آتش سوزاں اور شعلہ آگ سے تشبیہ دینے لگے ۱۰ بیٹوں، بھائیوں اور بیویوں کی وفات پر بھی شعراء نے بڑے رنج و غم اور درد و فراق کا اظہار کیا، ”ابن الزیات“ نے جو مرثیے اپنی رفیق حیات کی موت پر کہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ شاعروں نے اپنے مرثیوں میں بچے کی وفات پر ماں کے درد و کرب اور رنج و الم کے جذبات کا اظہار بھی بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ ۱۱

عہد عباسی میں مرثیہ نگاری نے ایک نیا رنگ اختیار کیا جو اس سے پہلے عربی ادب میں معروف نہ تھا اور یہ تھا شہر آشوب یعنی عباسی خلیفہ الامین (۱۹۸ھ - ۸۱۳ھ) سے پہلے مامون کے حامی لشکر نے بغداد کا محاصرہ کرنے کے بعد منجنیقوں سے شہر کو نذر آتش کر دیا اور کئی محل جل کر خاکستر ہو گئے اس المناک صورت حال پر شعراء نے بغداد کی تباہی پر شہر آشوب لکھے ۱۲

اندلس سے عربوں کے اخراج پر بھی کئی مرثیے لکھے گئے جو تاریخ ادب کی کتابوں میں مذکور ہیں ۱۳ مرثیہ میں ایک نیا روپ یہ آیا کہ چہچہانے والے پرندوں اور پالتوں جانوروں اور چوپایوں (قمریوں اور بھیڑ بکریوں اور گھوڑوں) کی موت فقدان یا فراق پر شعراء نے مرثیے کہنا شروع کر دیے ۱۴ اسی طرح شاعروں نے اپنے باغات اور گھروں کی تباہی اور کتابوں وغیرہ کے نقصان جیسے حادثات پر بھی مرثیے لکھے بعض شعراء نے اپنے افلاس پر اور بعض نے شباب یا بصارت کی محرومی پر بھی مرثیے لکھے ہیں۔ ۱۵

عربوں کی طرح دوسری مسلم اقوام میں بھی شعراء نے مرثیہ نگاری کی ہے خصوصاً ترکی، فارسی اور اردو میں مرثیہ کی صنف کو بڑی وسعت نصیب ہوئی۔ کسی قومی المیہ پر اظہار غم عربی ۱۶ فارسی ۱۷ اور اردو تینوں زبانوں میں بخوبی ملتا ہے لیکن عربی و فارسی سے شروع ہو کر اردو تک پہنچتے پہنچتے مرثیہ اہل بیت نے ایک منظم صنف اختیار کر لی۔ ۱۸

(ب) اردو مرثیہ کا آغاز

اردو میں مرثیہ نگاری سے متعلق مختلف اقسام موجود ہیں یعنی

۱۔ کسی شخص کی موت پر مانتی نظم یا

۲۔ قومی مرثیہ

۳۔ اہل بیت کا مرثیہ ۱۹

شخصی مرثیہ

اردو شاعری کی ابتداء ہی میں شخصی مرثیے مل جاتے ہیں اور غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ذاتی مرثیوں کی تعداد اردو شاعری میں اتنی کثیر ہے جن میں سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے صرف چند مثالیں کافی ہوں گی۔

عبدالحی تاباں (۱۷۸۱-۱۷۵۱ء) ان کے دیوان میں ان کے استاد حشمت (۱۷۴۹ء) کا مرثیہ موجود ہے تاباں جب عین جوانی میں فوت ہوئے تو میر تقی میر نے بھی غم کا اظہار اپنی غزل کے ایک مقطع میں کیا جو محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب آب حیات میں درج کیا ہے ۲۰ اور میر کے دیوان اول میں بھی دیکھا جاسکتا ہے ۲۱

مرزا اسد اللہ خاں غالب (۱۸۹۹ء) نے بھی دو شخصی مرثیے لکھے ہیں ایک زین العابدین خاں عارف کا مرثیہ اور دوسرا محبوبہ دنواز کا ۲۲ لیکن درد و غم سے لبریز مرثیہ خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے باکمال استاد مرزا غالب کی وفات پر لکھا جس کے دس بند اور سوا شعرا ہیں ایک ایک شعر میں تلخی غم پائی جاتی ہے ۲۳

علامہ اقبال نے بھی اس قسم کے مرثیے لکھے ہیں مثلاً والدہ مرحومہ کی یاد میں انھوں نے جو طویل نظم لکھی ہے اس میں انھوں نے (فلسفی ہونے کی بناء پر) اپنے ماتم کو ماتم عالم بنادیا۔ (۲۴)

۱۹۳۲ء میں مولانا محمد علی جوہر لندن میں فوت ہوئے جب کہ وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے اور بیت المقدس میں دفن ہوئے ان کے سانحہ رحلت پر تمام قوم غمزدہ و آزرده ہوگئی اس غم اندوہ واقعہ سے اثر لے کر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے ”ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملال“ کے عنوان کے نام سے مولانا کا مرثیہ لکھا۔ جو ان کے مجموعہ سخن ”سوز و ساز“ میں موجود ہے (۲۵)

علامہ اقبال کی وفات ۱۹۳۸ء میں ہوئی علامہ موصوف شاعر مشرق حکیم الامت اور مفکر اسلام تھے پاکستان کا تخیل انھیں کا عطا کردہ ہے اس لئے اس وقت سے لے کر آج تک ہندو پاک کے شعراء انھیں برابر خراج عقیدت پیش کرتے رہے ہیں اور ان کی یاد میں غم انگیز نظمیں لکھتے رہے ہیں اس لئے اس قسم کی نظموں کے کئی مجموعے مثلاً ”بیاد شاعر مشرق“ حضور شاعر مشرق“ بخسور اقبال“ شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ وہ میر کارواں اور معمار ملت تھے ان کے غم میں بھی نظمیں لکھی جا رہی ہیں اس قسم کی نظموں کا ایک مجموعہ عقیدت کے پھول (۲۶) ہمارے سامنے ہے حاصل کلام یہ کہ اکابر و اعزاء کی جدائی کا سلسلہ غیر مختتم ہے اس لئے شعراء اردو ادب اب بھی مرثیے لکھ رہے ہیں۔ (۲۷)

قومی مرثیہ

دہلی سلطنت کا شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا ۱۷۰۷ء میں انتقال ہوا اس کے بعد مغلوں کا اقتدار آہستہ آہستہ دم توڑنے لگا متاخر مغل شہنشاہوں کے عہد میں گرفت اور بھی ڈھیلی پڑتی گئی ساتھ ہی اقتصادی اور سیاسی اختلال رونما ہوا اور اخلاقی اقتدار بھی اس انتشار کی رو میں آ گئیں۔ شعراء نے ان حالات کا ذکر اپنے کلام میں کرنا شروع کر دیا اس سلسلے میں انھوں نے شہر آشوب نظمیں لکھیں (۲۸) جب کہ ترکی اور فارسی زبانوں میں اس صنف شعر کا رواج مدت سے چلا آ رہا تھا۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اردو میں شفیق اورنگ آبادی، شاکر ناجی، شاہ حاتم، میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا وغیرہ نے متاخر مغلوں کے ایام میں ابتر ملکی و سماجی حالات کا بیان درد دل کے ساتھ شہر آشوبوں میں کیا۔ ۱۸۵۷ء کا خونی

انقلاب آیا تو گویا جس معاشرہ کی اصلاح کے لئے یہ شہر آشوب نظمیں لکھی جا رہی تھیں انھیں تلوار کی زد سے ختم کر دیا گیا اسی لئے اس سانحہ پر جو شہر آشوب نظمیں کہی گئیں ان میں مرثیہ کارنگ نمایاں ہے ۲۹

مرثیہ اہل بیت

اب ہم مرثیہ اہل بیت کا ذکر کرتے ہیں۔

مغل شہنشاہ بابر نے ۱۵۲۲ء میں دہلی میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے ورود سے پہلے بہمنی حکومت دکن (۱۳۳۷ھ-۱۵۳۶ء) کا بادشاہ محمود ثانی (۱۵۱۸ء) کا انتقال ہوا تو تلنگانہ کے صوبہ دار سلطان قلی نے گولکنڈہ کی آزاد حکومت قائم کی۔ اس کے جانشینوں میں محمد قلی قطب شاہ ۱۶۱۱ء۔ ۱۶۱۵ء دکنی اردو میں صاحب دیوان شاعر تھا اس نے اہل بیت عظام کے کئی مرثیے لکھے ہیں گویا ابھی مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر کا زمانہ ۱۶۰۵ء۔ ۱۶۲۷ء ہی تھا کہ دکن میں مرثیہ گوئی شروع ہو گئی مولانا عبد السلام ندوی شعر الہند (۳۰) میں لکھتے ہیں کہ عہد جہانگیری میں شجاع الدین نوری ہاشم علی برہان پوری کاظم وغیرہ نے مرثیے کہے (۳۱) مزید تحقیق بتاتی ہے کہ دکن میں اہل بیت کی عزاداری ہند میں مغلوں کے آنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اشرف بھابانی نے واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین کو مثنوی نوسر ہار ۹۰۹ھ ۱۵۰۳ء میں بیان کیا (۳۲) جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کی حیثیت روضۃ الشہداء اور کربل کتھا والی ہے (۳۳)

گولکنڈہ میں غواصی عبداللہ قطب شاہ ۱۶۱۱ء۔ ۱۶۷۲ء اور دوسرے شعراء کرام نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ عہد عالمگیری میں ابوالحسن تانا شاہ کا ندیم شاہ قلی خاں شاہی بیشتر مرثیے ہی کہا کرتا تھا اور اس کے مرثیے لوگ شمالی ہند میں دست بدست لئے جاتے تھے (۳۴)

لیکن مرثیہ گوئی کے لحاظ سے جو کام دکنی ریاست بیجا پور میں ہوا وہ زیادہ قابل قدر ہے کیونکہ گولکنڈہ کی طرح بیجا پور کے بادشاہ بھی زیادہ تر شیعہ تھے محرم کے ایام میں عزاداری کا باقاعدہ اہتمام ہوتا تھا شعراء پڑھنے کے لئے باقاعدہ مرثیہ نما نظمیں اور سلام عام لکھا کرتے تھے ساتھ ہی مختلف فارسی

مرثیوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں رستمی نے محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان کی فرمائش پر ابن حسام کی مثنوی خاورنامہ کا ترجمہ کیا (۳۵) اگرچہ بیجاپور میں علی عادل شاہ شاہی اور سید مہران ہاشمی بھی مرثیہ گوئی کے لحاظ سے مشہور ہوئے ہیں مگر مرزا بیجاپوری سب سے ممتاز ہے (۳۶) مرزا بیجاپوری علی عادل شاہ ثانی شاہی تخلص کے دور ۱۶۶۰ء-۱۶۶۸ء میں حیات تھا اور یہی دور دکنی ادب کے عروج کا ہے اس کا اثر صنف مرثیہ پر بھی پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم مرثیہ اپنے واضح خدو خال کے ساتھ مرزا کے یہاں ابھرتا ہے اس کے مرثیے میں کہیں سوز کا اور کہیں سلام کا رنگ ملتا ہے اور یہیں سے جدید مرثیے کے نقوش ابھرنے شروع ہو جاتے ہیں ان مرثیوں میں بیان واقعہ کے بجائے غنائی رنگ غالب ہے اس لئے کہ یہ گانے کے لئے لکھے جاتے تھے۔ گولکنڈہ میں مرثیہ کے لئے غزل کی ہیئت کا رواج تھا لیکن بیجاپور میں نوحہ، سلام، درود، مثلث، ربع، مخمس، مسدس، سب پہلو برتے گئے شیرینی زبان مکالمے کی قدرت رفعت تخیل میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ مسدس کی شکل میں پہلا مرثیہ مہدی متین برہان پوری شاگرد سید سراج الدین سراج اور نگ آبادی ۱۷۳۳ء کا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ دکن میں صنف مرثیہ نے تسلسل اور باقاعدگی سے ترقی کی اور ہیئت و اسلوب کے لحاظ سے اس نے وہ مقام حاصل کر لیا کہ شمالی ہند میں میر و سودا سے اگلے مدارج تک لے جاسکتے تھے۔ ۳۷

شمالی ہند میں اردو مرثیہ

دکن میں مرثیہ گوئی کا فن بعد میں بھی جاری رہا لیکن مرثیہ کے ارتقائی منازل کی اگلی کڑیاں شمال ہند میں ملتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ دکن میں نالہ و نغاں کے لئے ”روضۃ الشہداء“ کے ترجمے مجالس عزا میں پڑھے جاتے تھے شمالی ہند میں بھی ایسا ہی ہوا۔ عزاداری کی غرض سے ”حسین الواعظ الکاشفی“ کی تصنیف کردہ کتاب کے ترجمے بھی ہوئے ان میں مشہور و معروف ترجمہ ”کر بل کتھا“ یا ”دہ مجلس“ کے نام سے فضل علی فضلی کا کیا ہوا ہے جو محمد شاہی دور ۱۱۴۵ھ-۱۷۳۲ء میں ہوا شمالی ہند میں یہ مرثیوں کی اولین کتاب ہے جو نثر میں ہے اور لسانی اعتبار سے قدیم اردو کا بہترین نمونہ ہے اس میں

”روضۃ الشہداء“ کے فارسی اشعار کے علاوہ طبع زاد نوے اور مرثیہ بھی شامل ہیں۔ فضلی نے سن ۱۱۶۸ھ۔ ۱۲۸۱ھ میں اس پر نظر ثانی کی تھی اسی دور (۱۳۸۱ھ تا ۱۴۱۱ھ) کے مابین نواب درگاہ قلی خاں نے کتاب ”مرقع دہلی“ فارسی زبان میں لکھی تھی جن میں انھوں نے دیگر باتوں کے علاوہ دہلی کے متعدد عاشورہ خانوں اور عزاداری کے رواج کا بھرپور ذکر کیا ہے جس سے مجالس میں مرثیہ گوئی اور سوز خوانی کی تصویر کھینچ جاتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ کربل کتنا معاشرہ کی ایک حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تصنیف ہوئی تھی چونکہ اہل بیت کی عقیدت لوگوں میں پہلے سے موجود تھی اس لئے اسماعیل امروہوی نے اپنی مثنوی ”تولد نامہ“ و وفات نامہ بی بی فاطمہ اردو میں اور رنگ زیب عالمگیر کی وفات سے تیرہ سال ۱۱۵۱ھ تا ۱۶۹۳ء پہلے تصنیف کی تھی۔ ۳۸

مرزا محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع سودا ۱۷۸۰ھ تا ۱۸۷۱ھ میں فوت ہوئے ان کی وجہ سے مرثیہ نے ارتقاء کے نئے مدارج طے کئے ان کے مرثیوں میں دل سوزی سے زیادہ ہنرمندی ہے انھوں نے اپنے مرثیوں کے دیوان میں اپنے فن کے مثبت پہلو بھی پیش کئے ہیں اور رسالہ ”سمیل ہدایت“ میں تنقید کر کے معاصرانہ مرثیہ سرائی کے متعلق مستند معلومات بہم پہنچائی ہیں اور مروجہ مرثیہ نگاری کے عیوب شعری بھی بیان کئے ہیں۔ (۳۹)

لکھنؤ میں مرثیہ گوئی

لکھنؤ میں مرثیہ اپنے نقطہ عروج پر پہنچ جاتا ہے اس میں لکھنؤ کی عام تہذیبی علمی اور ادبی زندگی کا بڑا دخل ہے۔ چوں کہ لکھنؤ کے حکمران اکثر شیعہ تھے اس لئے انھوں نے مراسم عزاداری کی بھرپور سرپرستی کی۔ امام باڑے بنوائے اور کربلائیں اور شہیدوں کے مقابر کی نقول تعمیر کرائیں۔ خود سوگ منایا اور درباریوں و عوام نے بھی عزاداری کی رسمیں اختیار کیں۔ گلی گلی کوچہ در کوچہ علم نصب ہوتے اور

مجلس منعقد ہوتی تھیں علاوہ ازیں لکھنؤی تمدن نے مجالس عزا کے آداب میں نفاست کا مزید رنگ بھرا۔ سامعین میں سے صاحب علم و فضل لوگوں نے خاص طور پر مرثیے کے معاملے میں عوام کو متاثر کر کے اجتماعی ذوق شعری کو بلند سے بلند تر کر دیا۔ سوز خوانی نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی۔ اظہار حزن و ملال اور بین کے لئے موزوں دھنوں کا انتخاب کیا گیا اور سوز خوانی اعلیٰ درجے کی راگ داری شمار ہونے لگی۔ چالیس دن تک لکھنؤ کے گلی کو چے آہ و بکا کی دل سوز آواز سے گونجتے رہتے تھے۔ جس رفتار سے عوام کا ادبی و تہذیبی اور ثقافتی شعور بیدار ہوا تھا اسی کے مطابق مرثیہ میں وسعت و رفعت پیدا ہوئی۔ قدرتی طور پر شاہانہ سرپرستی اور عوام میں مقبولیت کے باعث مرثیہ نے بے انتہا ترقی کی۔ ۱۰۰ لکھنؤ کے اس ماحول نے مرثیہ گوئیوں کی کثیر تعداد پیدا کر دی تھی ان میں میر خلیق ۱۲۶۰ھ لکھنؤ میں اور جن شعراء نے مرثیہ نگاری کی صنف کو ترقی دی ان میں حیدری سکندر گدا احسان اور افسردہ ہیں۔ حیدری اس عہد کا سب سے قدیم مرثیہ نگار ہے جس کے مرثیوں میں رزم رخصت اور شہادت کے بیان کے ساتھ ساتھ واقعات کا ربط و ضبط بھی بخوبی نمایاں ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ ڈاکٹر ام ہانی اردو مرثیہ کا ارتقاء ص ۱۲۸

سکندر عوامی شاعر تھا اس لئے اس نے مرثیوں کو بھی عوام کو نظر میں رکھ کر لکھے تاکہ عوام بھی دیگر باتوں کے علاوہ واقعہ کر بلا کی عظمت و رفعت کو سمجھے اور اس سے سبق لے چونکہ عزاداری کے لئے ایسے ہی مرثیوں کی ضرورت و حاجت تھی اس لئے سکندر کے مرثیوں کو خوب پسند کیا گیا۔ اس وقت تک عزاداری عوام الناس میں عام ہو چکی تھی اس لئے سکندر کے مرثیے اس عزاداری کا ایک واضح اور مناسب حصہ بن گئے جس سے اسے خوب مقبولیت ملی اور وہ ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے شہرہ آفاق کی بلندیوں تک پہنچ گیا۔ حوالہ سابق

گدا کے مرثیوں میں فارسی کے اور کھڑی بولی کے الفاظ زیادہ ہیں چونکہ وہ اہل بیت سے بے انتہا عقیدت و محبت رکھتا تھا اس لئے اس نے اپنے مرثیوں کے حوالہ سے خراج عقیدت پیش کرنے کا بھر پور انداز بیان کیا ہے اس کی زبان میں روانی اور قدرت کلام کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ حوالہ مذکور (۱۶۱)

احسان کے مرثیوں میں وہ تمام تر خصوصیات موجود ہیں جو اس زمانہ کے مرثیہ نگاروں میں دیکھنے کو ملتی ہیں اس کا تذکرہ ”یادگار شعراء“ اور ”گلشن بے خار“ میں ملتا ہے جہاں انھوں نے لکھنؤ میں عزاداری کے شبابی و شتابی رواج کو سامنے رکھ کر اپنے عقیدت کے بموجب ایسے مرثیوں کی تخلیق کی جو عوام کے دلوں میں اثر پذیر ہو سکے۔ حوالہ سابق ۱۵۷

افسردہ نے اپنے مرثیوں میں جنگ کی منظر کشی بہت کم کی ہے اور تمہید نہیں کے برابر ہے ان کے زیادہ تر مرثیے مسدس کی شکل میں ہیں پھر بھی نزاع کی حالت و کیفیت کی منظر کشی میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ حوالہ سابق

فصیح، میر مظفر حسین ضمیر اور دلگیر زیادہ اہم ہیں لیکن زمانہ نے خاص طور پر خلیق اور ضمیر کو قبول عام کی سند عطا کی۔ (۴۱)

مثلاً فصیح نے (۱۲۳۳ھ-۱۷۱۸ء) سے قبل ایک مرثیہ کہا جس میں انھوں نے مرثیہ کے تمام اجزاء چہرہ، رخصت، رزم اور شہادت وغیرہ جمع کر دیے۔ ضمیر کی عمر اس وقت ستائیس برس کے قریب تھی جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ کو موجودہ ترقی یافتہ طرز دی اور فصیح کی عمر پچیس سے متجاوز ہو چکی تھی (۴۲)

میر خلیق

میر خلیق (۱۲۶۰ھ) میر حسن جیسے فصیح البیان شاعر کے فرزند اور میر انیس جیسے قادر الکلام مرثیہ گو کے والد تھے ان کی زبان بڑی فصیح اور با اثر تھی اور ان کے مرثیے میر انیس کے مرثیے کے ساتھ ایسے خلط ملط ہو گئے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس کے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ اگر یہ واقعی میں میر خلیق کا کلام ہے تو بیٹے کو باپ پر ترجیح کی کوئی وجہ نہیں ۴۳

میر مظفر حسین ضمیر

میر مظفر حسین ضمیر نے رزمیہ لکھا، سراپا ایجاد کیا، گھوڑے تلوار اور اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف بیان کئے واقعہ نگاری کی اور ایک ایک جزئی واقعہ کو تفصیل کے ساتھ لکھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی ۴۴

مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں کہ اگر ان کے عمدہ کلام کا انتخاب کیا جائے تو میر انیس کا کلام معلوم ہوگا۔ علاوہ ازیں میر ضمیر غالباً پہلا شخص ہے جس نے سوز کے لہجے میں پڑھنے کے بجائے مرثیہ منبر پر بیٹھ کر تحت اللفظ پڑھنا شروع کیا۔ مرثیہ گوئی کی تاریخ میں دور خلیق و ضمیر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ فصیح و دلیکیر کے علاوہ وہ خاص طور پر ان دونوں نے اپنی اعلیٰ و ادبی اور فنی صلاحیتوں سے مرثیہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے روشناس کرایا (۴۵)

اب ہم میر دبیر و انیس کے دور کا ذکر کر رہے ہیں۔

دبیر

مرزا سلام علی دبیر لکھنوی، میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد تھے ان کی تاریخ وفات ۳۰ محرم (۱۲۹۲ھ) ۸ مارچ ۱۸۷۵ء ہے کم و بیش تقریباً ساٹھ برس انھوں نے مرثیہ گوئی کی ان کے استاد میر ضمیر کو مضمون آفرینی کا شوق تھا اور یہی وصف مرزا دبیر کے مرثیوں کا جوہر بنا۔ انہیں فارسی، عربی، صرف و نحو، حدیث و فقہ اور ادب و حکمت میں دسترس حاصل تھی (۴۵)

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال اور شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں۔ انھوں نے گریہ انگیز روایتیں (۴۶) اکثر نظم کی ہیں مناظر کی تصویر کشی میں اپنی پرواز تخیل، صنائع کی مہارت اور خلاقی طبع سے نئے سے مضامین پیدا کرتے چلے جاتے تھے اور جذبات کی مصوری کرتے ہوئے وہ اعلیٰ درجہ کی سادگی اور صحیح تاثر بلکہ صداقت کے بھی عمدہ نمونے پیش کیا کرتے تھے۔ ذی علم سامعین ان کے شکوہ الفاظ، رفعت تخیل اور

مضمون آفرینی کو پسند کیا کرتے تھے اور عوام الناس ان کے درد انگیز اور پرتاثر انداز بیان کے شیدائی تھے۔ شاہان اودھ نے انعامات اور گراں قدر مشاہرہ سے انہیں معاش کی جانب سے بے فکر کر دیا تھا۔ انہوں نے چار سو سے زائد مرثیے، تین سو سے زائد سلام اور ساٹھ سے زائد خمسے کہے ہیں جب کہ رباعیات وغیرہ علاحدہ ہیں۔ آج کل بعض صاحبان مرزا دبیر کی لفاظی، خیال آفرینی اور صنعت گیری کو تصنع سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اس بات سے مرزا دبیر کی عظمت میں فرق نہیں آتا (۴۶)

اوصاف

مرزا دبیر نہایت پرہیزگار، متقی، کریم النفس اور مسافر نواز بزرگ تھے ان کی شخصیت میں خاص عظمت و رفعت تھی (۴۷)

انیس

میر برانیس ۱۲۷۶ھ - ۱۸۰۱ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور بیالیس سال کی عمر تک بشتہ وہیں قیام پذیر رہے اس کے بعد لکھنؤ چلے آئے جہاں انیس شوال ۱۲۹۱ھ - ۷ دسمبر ۱۸۷۴ء کو فوت ہوئے (۴۸)

موزونی طبع اور فصاحت لسانی انہوں نے ورثے میں پائی تھی چونکہ ان کے والد میر خلیق بذات خود ایک معروف مرثیہ گو تھے اس سے ان کی ذات پر بھی اس کا بخوبی اثر پڑا جب میر انیس لکھنؤ پہنچے تو اس وقت میر دبیر کی عظمت کا سکہ ہر سوراں تھا لیکن خداداد صلاحیتوں کی بنا پر میر انیس بھی بہت جلد ماحول پر چھا گئے مرزا دبیر کی طرح انہوں نے بھی مسدس کی شکل میں مرثیے کہے لیکن انہیں تکلف، تصنع، مبالغہ اور اغراق و دقت پسندی سے پاک رکھا اور شاعری کا ایسا مصفی اور منزہ نمونہ عوام کے سامنے پیش کیا جس میں عمیق ترین خیالات و جذبات کا اظہار اور نازک و لطیف کیفیات کا ابلاغ دل آویز سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں ہزاروں واقعات سہولت اور قدرت کے ساتھ بیان کئے اور ان میں ترتیب و تسلسل کو ملحوظ رکھا، متعلقہ اشخاص کے کردار اور سیرت

و جذبات کے صحیح عرفان کے ساتھ واقعہ کی تصویر کشی کی اور نفسیاتی لحاظ سے ایسا لطیف انداز اختیار کیا کہ شہادت سامعین کو ذاتی المیہ نظر آتی تھی (۴۹)

تحت اللفظ پڑھتے تھے لیکن مافوق العادت اثر ڈالنے والے خوش بیان مرثیہ گو تھے داستان کربلا کے بیسیوں افراد ہیں اور ہر ایک کی کردار نگاری اور جذبات نگاری انھوں نے اس طرح عمدگی سے کی کہ ہر ایک کی بشری اور روحانی خصوصیات جدا جدا نگاہوں کے سامنے حاضر ہو جاتی ہیں اور ہر ایک کی تصویر جذبات، عمر، مزاج اور کردار کے مطابق سامنے آتی ہے منظر نگاری کے اعتبار سے تمام جزئیات اپنی جگہ پر مکمل ہیں اور سادہ مناظر سے گزر کر اس کی مرکب تصویریں بھی مہارت سے کھینچی گئیں ہیں (۵۰)

میر انیس نے رزمیہ عناصر سے اردو شاعری میں ایک نئی جہت کا آغاز کیا اسلمہ کے اوصاف بیان کئے، گھوڑے کی تفصیل نگاری کی، اور جنگ کا منظر آنکھوں کے سامنے لے آئے۔ رزمیہ عناصر کے جلال، رجز خوانی کے ہمبے اور قوت بیان کے دبدبے سے انھوں نے اپنے کلام میں تموج پیدا کیا۔ جو فی الواقعہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ان کے موضوع میں عظمت تھی، اپنے تابدار اسلوب سے انھوں نے اسے رزمیہ سے ہم آہنگ دیا اور اسلامی اخلاق و کردار کا دلوں پر سکھ بٹھایا۔ اس طرح اخلاقی لحاظ سے ان مرثیوں کی فضا خیر کامل کی طرف مائل کرتی نظر آتی ہے۔ ۵۱

دبیر و انیس کے بعد مرثیہ

ان دو مرثیہ گو شعراء کے پائے جانے کے بعد کوئی مستقل مرثیہ کہنے والا نظر نہیں آتا۔ ان کے کلام کی چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جس میں کم و بیش ایک سو پچیس مرثی شامل ہیں یہ حقیقت ہے کہ صنف مرثیہ میں جس قدر ممکنات تھیں وہ مرثیہ گو انیس میں بدرجہ کمال موجود ہیں عشق کا شمار انیس و دبیر کے معاصرین شعراء میں کیا جاتا ہے جہاں اس عہد میں انیس و دبیر کی شاعری کا

سکہ چل رہا تھا اور یہ دونوں شاعر آسمان کی بلندیاں چھو رہے تھے وہیں عشق کی شخصیت ماند سی پڑ گئی تھی لہذا عشق نے دیگر صنف سے قطع نظر مرثیہ کی زبان و بیان کی صحت پر خاص توجہ مرکوز کی۔ اس سلسلہ میں ایک رسالہ مرتب کیا جس میں محل فصاحت و بلاغت کا معیار متعین کیا اور جو الفاظ و ترکیبیں غلط تھیں انہیں ترک کرنے پر زور دیا۔ زبان و بیان کی اصلاح کے سلسلے میں یہ ان کا ایک اہم کارنامہ ہے جس نے تمام مرثیہ نگاران کو متاثر کیا اور داد تحسین حاصل کیا اس کے علاوہ انہوں نے مرثیے بھی کہے ہیں جن میں میر انیس کا رنگ و روپ غالب ہے ان کے مرثیوں میں جو نمایاں خوبی نظر آتی ہے وہ سلاست لسانی اور اثر پذیری ہے۔ درد و غم اور سوز و گداز کو جذبات نگاری میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ تعلیٰ کے برعکس تواضع اور انکساری کو مرثیے کے لئے زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ مرثیے ہی کی طرح یہ سلاست و تاثیر ان کی رباعیات و سلاموں میں بھی موجود ہے ان تمام خصوصیات کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا کلام ادبیت سوز اور دلکشی سے پوری طرح مالا مال ہے۔ علاوہ ازیں عشق کے مرثیوں میں مذہبی پہلو پوری طرح نمایاں ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ مرثیے کا اصل مقصد اہل بیت رسول کے اوصاف و کمالات کو اس خوبی کے ساتھ واضح اور بیان کیا جائے جس سے ان کی عظمت و رفعت کھل کر سامنے آجائے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر جعفر رضا۔ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی ص ۲۰۳-۲۰۴ مطبع الہ آباد ۱۹۷۳ء۔

تعشق بھی اسی زمانے کے مرثیہ نگار ہیں دراصل یہ غزل گو شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں بھی تغزل کا رنگ نمایاں ہے ساتھ ہی الفاظ کے ذریعہ تشبیہ و استعارہ کا بحسن و خوبی استعمال ہے۔ مثلاً

ع پروانہ جاں سوز ہوئے شمع فروزاں ہے بلبل کو تلاش گل گر میں خفقاں ہے
عاشق کو ہے غم آنکھ سے معشوق نہاں ہے وہ درد ہے دل میں کہ خفا جسم سے جاں ہے

پروانے کو یاں شغل ہے سوز جگری کا
واں شمع میں عالم ہے چراغ سحری کا

مذکورہ بالا بند کے ذریعہ عشق نے مرثیہ میں تغزل کا رنگ واقعہ کر بلا میں پیوست کر دیا۔ بقول جعفر رضا، کر بلا جیسے عظیم واقعہ میں غزل کی علامتوں، اصطلاحوں اور انداز بیان کا استعمال کر کے مرثیہ کو ایک نیا راستہ دکھایا اور جو روایت پہلے سے چلی آرہی تھی اسے آگے بڑھایا۔ عشق کا کلام سوز و گداز سے لبریز ہے ساتھ ہی حسن بندش، جذبات کی عمدگی، خیال کی نزاکت و لطافتی استعمالات انکے کلام کی وہ خوبیاں ہیں جس نے انھیں صفحہ اول کے مرثیہ نگاروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے دبستان عشق کی مرثیہ نگاری ص ۲۳۷

لیکن پھر بھی تحقیق کے طالب علم کے لئے یہ امر ایک حد تک اعتراض طلب ہے کہ مرثیہ میں تغزلی رنگ و روپ کے کیا معنی ہیں۔ کیونکہ غزل کی تعریفات میں محبوب سے عشق و محبت کی ایسی داستان جس میں محبوب کی جملہ دلکش سراپا، حسین صفات و کمالات کے اجزاء کا بیان شامل ہے جس کا ذکر محبت کے لئے سرور و مستی پیدا کرتی ہے جب کہ مرثیہ میں ایسا کچھ بھی نہیں۔ مرثیہ تو محبوب کے سوز و غم، آہ و بکا، رنج و الم اور مصائب کی شدت کا بیان ہوتا ہے جس میں سرور و مستی کے بجائے افسردگی پیدا ہوتی ہے چہ جائے کہ انھیں نادر تشبیہات و استعارات کا جامہ ہی کیوں نہ پہنا دیا جائے۔ اگر مرثیہ کو تغزلی رنگ میں ڈھال کر بیان کیا جائے تو وہ مرثیہ کے بجائے غزل کے مختلف اصناف ہی کی ایک صنف قرار پائے گی۔ راقم

خانوادہ انیس میں مرثیہ کہنے والے کچھ نظر آتے ہیں (۵۲) تاہم ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات ادب و زیست کے بدلتے ہوئے تصورات اور تغیرات اقدار نے جدید مرثیہ گوئی کی کچھ خصوصیات پیدا کیں ہیں اس سلسلے میں اثر لکھنوی، نسیم امر و ہوی، محسن جوینوری، وحید اختر غریز لکھنوی اور جوش ملیح آبادی کا ذکر کیا جاسکتا ہے (۵۳) بیسویں صدی کے ابتداء میں مرثیے کے اندر قابل قدر تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کا سہرا جوش ملیح آبادی کے سر جاتا ہے۔ جوش نے مرثیے کے قدیم روایتی تصور سے یکسر انحراف کر کے مرثیے کو جدید تصورات اور جدید مقاصد کے ساتھ پیش کیا۔ جوش نے مرثیے

کے اصل مقصد (رونا رولانا یا پھر ثواب الہی کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے) آزادی انقلاب کا ذریعہ بنا کر پیش کیا۔ اس سلسلے میں انقلاب کی سب سے بڑی طاقت کی شکل میں حضرت امام حسینؑ کو پیش کیا اس کی زندہ مثال جوش کا وہ مرثیہ ہے جو ”حسین اور انقلاب“ کے نام سے معروف ہے۔ جس میں مرثیہ نگاری کے جدید رجحان سے عوام و خواص کو روشناس کرایا اور جدید فنی تقاضوں اور فکری موضوعات کو سامنے رکھ کر مرثیہ کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا (۵۴) جدید مرثیہ نگاروں نے جہاں مرثیہ کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔ دیکھئے ص ۱۵

اب مرثیہ مسدس تک محدود نہیں رہا بلکہ آزاد نثری نظم کے پیرائے میں بھی لکھا جا رہا ہے اور حضرت امام حسینؑ کی شہادت کو بطور علامت پیش کرنے کا رجحان قوی تر نظر آتا ہے۔ یوں کہا جائے تو اپنی مرکزی نقطہ نظر سے ہٹے بغیر دور حاضر میں بھی مرثیہ اپنے فطری تقاضے پورے کر رہا ہے اس کے باوجود مجالس عزاء وغیرہ میں قدیم روایتی مرثیوں کا رواج اب بھی کم نہیں ہوا۔ علامتی مرثیے دراصل سیاسی و نظریاتی شاعری کا حصہ ہیں معیاری اور مثالی مرثیے وہی ہیں جن کے بڑے نمائندے دبیر و انیس ہیں۔ ۵۵

وہیں ان کے بالمقابل ایک دیگر جماعت ایسے فنکاروں کی بھی موجود تھی جو مرثیے کی اصل روایت جو قدیم زمانے سے چلی آرہی تھی اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ کیوں کہ جہاں جدید انقلابی مرثیہ نگار مرثیے لکھ رہے تھے وہیں وہ مرثیہ نگار جو مرثیہ میں واقعہ کربلا کی اہمیت پر زور دیتے ہیں مرثیے کو پوری عقیدت کیساتھ لکھ رہے تھے اور یہ جدید مرثیہ گو کے مقابلے، کسی طرح کم لائق تحسین نہیں کہے جاسکتے بلکہ انھیں جدید مرثیہ گو کے مقابلے عقیدت مندوں کے حلقے میں زیادہ مقبولیت اور مرتبت حاصل تھی اگر ان کے مرثیوں کا بخوبی جائزہ لیا جائے تو یہ کربلا کی مرثیہ نگار فن کی معراج پر نظر آئنگے۔ ان ممتاز مرثیہ نگاروں میں قمر جلال پوری، زید، خبیر لکھنوی، قلق میرٹھی وغیرہ شامل ہیں ۵۶

پاکستان و ہندوستان میں بھی یہی صورت حال تھی۔ تقسیم وطن کے بعد یہاں بھی جدید مرثیہ نگار

وہی موضوعات کو جگہ دے رہے تھے جیسا کہ مذکور ہوا۔ ہندوستان میں جن کربلائی مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کے فن کو ارتقاء کے منازل تک پہنچایا ان میں علی سردار جعفری، مرزا صادق مہدی نظمی، تابش نقوی، کیفی اعظمی، اور ڈاکٹر طاہر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ وہیں پاکستان میں ساحر لکھنوی، وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر صفدر حسین، ڈاکٹر ہارون عباس، شاہد نقوی، سردار نقوی، قیصر بارہوی، اور ظہور وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں جو مرثیہ نگاری میں عقیدت مندی کے تحت اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا اظہار بلند ترین فنکارانہ انداز میں کر رہے ہیں اور بہت حد تک مرثیہ نگاری کا حق ادا کرنے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں۔ (۵۷)

(د) مذہبی اہمیت

شیعیت کے نشوونما اور ارتقاء کے بنیادی عوامل وہی ہیں جو اسلام کے نشرو فروغ میں کارفرما رہے اس لئے کہ شیعیت اسلام سے الگ کوئی دین نہیں ہے۔ شیعیت کے فروغ میں اموی حکمرانوں کی جارحانہ روش اور طریقہ کار خصوصاً المیہ کربلا نے مؤثر اور پائیدار کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں اموی حکمرانوں کے خلاف غم و غصہ اور اہل بیت سے عقیدت و محبت اور ہمدردی کا والہانہ جذبہ ابھر کر سامنے آیا اور اسی ہمدردی کی آڑ لے کر بنو عباس اموی حکمرانوں کے بالمقابل آگئے اور آل رسول کے حقوق کا اعلان کر کے انقلاب کی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ ہوا کا رخ دیکھ کر سیاسی مقاصد کی برآوری کے لئے تھا مگر اس سے آل محمد کی طرف عوام کے ذہنی رجحان و قلبی عقیدت مندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۳۲ھ میں اموی اقتدار کا خاتمہ ہوا اور ”ابوالعباس السفاح“ خلافت کے نام پر برسر اقتدار آگیا اس اموی و عباسی حکومت کے درمیانی وقفے میں حضرت ”امام جعفر الصادق“ کو موقع مل گیا کہ وہ آزادانہ ترویج مذہب اور نشر علوم و معارف کر سکیں اگرچہ ان کی پشت پر نہ مادی قوت تھی اور نہ حکومت کی تائید مگر یہ امام کی علمی و عملی بلندی اور پرکشش شخصیت کا کرشمہ تھا کہ لوگ استفادہ کی غرض سے مختلف دور

دراز علاقوں سے کھنچ کھنچ کر آنے لگے ۵۸ اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ تدوین و تالیف کا کام تیزی سے شروع ہو گیا ۵۹

سلطنت عباسیہ کا مرکز عراق تھا اور یہی حضرت علیؑ کا پایہ تخت رہ چکا تھا جس کی وجہ سے شیعیت کے قدم پہلے سے وہاں جمے ہوئے تھے اور بنی عباس کے معاندانہ رویہ کے باوجود شیعوں کی آبادی میں نمایاں طور پر اضافہ ہی ہوتا رہا بلکہ دار الخلافہ بغداد میں بھی شیعیت ہر دور میں موجود رہی ہے اور بغداد کا محلہ ”کرخ“ خالص شیعہ آبادی پر مشتمل تھا جہاں دیگر علماء و خلفاء بھی کثیر تعداد میں تھے چنانچہ ابو عبد اللہ شیخ مفید، شیخ ابو جعفر الطوسی، سید مرتضیٰ علوم الہدی، سید رضی (۶۰) اور دوسرے اعلام بغداد ہی میں بود و باش رکھتے تھے البتہ جب مقامی ہنگامہ و فساد کی وجہ سے بغداد کا امن و سکون رخصت ہو گیا تو شیخ ابو جعفر الطوسی ۴۲۸ھ میں بقواد سے نجف چلے آئے اور اسے ایک علمی و عملی تربیت گاہ بنا دیا اور آج بھی نجف دنیائے شیعیت کا سب سے بڑا تعلیمی و تربیتی مرکز ہے (۶۱)

ایران میں شیعیت کی رفتار اوائل میں کافی سست رہی صرف ”قم“ میں شیعہ تھے جو اصلا عرب تھے اور حجاج بن یوسف کے مظالم سے تنگ آ کر کوفہ سے قم چلے آئے تھے اور تشیع کو اپنے ساتھ لائے تھے ان کی وجہ سے اہل قم نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا اور جب خلیفہ مامون رشید کے دور میں ”امام علی الرضا“ خراسان میں تشریف فرما ہوئے تو خراسان میں شیعیت تیزی سے پھیلنے لگی۔ ۳۲۰ھ میں جب ”دیالمہ“ نے ایران کے بعض شہروں کو فتح کر لیا تو انھوں نے اپنے اثر و نفوذ سے مرکزی خلافت میں وزارت عظمیٰ کا درجہ حاصل کر لیا چونکہ یہ دیالمہ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے اس لئے انھوں نے شیعہ علماء کی سرپرستی کی اور شیعہ عقائد کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔ پھر حکومت صفویہ (۶۲) میں شیعیت نے فروغ حاصل کیا اور دولت صفویہ کے زوال کے بعد سلاطین زندیہ اور قاجاریہ شیعیت کے لئے پشت پناہ ثابت ہوئے اور اس کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اب ایران شیعیت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور ”قم“ مشہد، تہران، نیشاپور، نہاوند اور دوسرے شہروں میں ان کے بلند پایہ علمی و تربیتی مراکز اور دینی

مدارس قائم ہیں۔ (۶۳)

پاکستان و ہند میں شیعیت ان علماء و مبلغین کے ذریعہ پھیلی جو وقتاً فوقتاً برصغیر میں آتے رہے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے ۱۶۱۷ھ میں جب چنگیز خاں ایران پر حملہ آور ہوا اور فتنوں و ہلاکتوں کا دروازہ کھلا تو جو سادات اموی حکمرانوں سے تنگ آ کر ایران میں آباد ہو چکے تھے انھوں نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ اور پھر یہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی ۱۷۸۷ھ میں جب حسن گنگو بہمنی دکن کا فرمانروا ہوا اور سلطنت بہمنیہ کی بنیاد رکھی تو یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں بیجاپور میں حکومت قائم کی اور ۹۱۸ھ میں سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے برسر اقتدار آیا اور گولکنڈے میں قطب شاہیہ حکومت کا سنگ بنیاد رکھا اور ۹۴۴ھ میں نظام شاہ تاجدار دکن نے ”ظاہر شاہ“ کی تبلیغ سے شیعہ مذہب اختیار کیا تو ان شیعہ حکومتوں میں شیعوں کو آزادانہ مراسم دینی بجالانے اور دینی شعائر قائم کرنے کے وسیع مواقع ملے۔ ۶۴

بارہویں صدی ہجری میں سلطنت اودھ کی بنیاد قائم ہوئی۔ اودھ کے اکثر فرمانروا شیعہ تھے جن کے دور میں مسجدیں اور عزا خانے تعمیر ہوئے شیعہ تعلیمات اور عزاداری کے قیام میں رام پور، بیگن پلی، جاوہر، مرشد آباد، وغیرہ شیعہ ریاستوں اور نوابین بنگال میرٹاپور (سندھ) اور قزلباش (پنجاب) نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ان ریاستوں کے حکمرانوں اور نوابین کے مذہبی عقائد کی بنیاد پر ان ریاستوں کے شعراء نے حکمرانوں اور نوابین کی دلجوئی اور درباری اثر و رسوخ حاصل کرنے کے لئے عزا خانوں اور عزاداری کی مجالس میں مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی کی رسم ایجاد کی اور اسے مذہب کا ایک حصہ گردانا۔ چونکہ اہل بیت سے والہانہ محبت و اخوت اور قلبی عقیدت کی بنیاد پر دنیا کے مسلمانان (خواہ وہ سنی ہو یا شیعہ) نے اس عمل کو عقیدت کی نظر سے دیکھا اور ان مجالس میں شرکت کو باعث فخر تسلیم کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مجالس میں مرثیہ خوانی و گوئی کا یہ سلسلہ دن بدن ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ درباری شعراء عمدہ سے عمدہ تشبیہات و استعارات اور نادر انداز بیان کے ذریعہ داد تحسین حاصل کرتے رہے۔ مرثیہ کی مذہبی اہمیت و حیثیت کا جو سلسلہ ان درباری شعراء نے ماقبل شروع کیا تھا وہ اب تک جاری و ساری ہے اور جب تک

دنیا اسلام میں شیعیت زندہ ہے یہ سلسلہ مسلسل جاری رہے گا۔ شیعہ کتب کی اشاعت کے لئے مطبع سلطانی قائم ہوا اور مدارس دینیہ کی تاسیس عمل میں آئی۔ علماء شیعہ میں سید دلدار علی، غفران مآب اور ان کے اخلاف و تلامذہ نے اصلاح رسوم اور ترویج علم و تبلیغ مذہب کے سلسلہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں (۶۵) حوالہ مذکور

علاوہ ازیں تقسیم ہند سے قبل جو پور، حیدر آباد، لکھنؤ وغیرہ میں شیعوں کو عروج حاصل رہا اور تقسیم کے بعد جہاں مسلمانوں نے ہجرت کی وہیں شیعوں کی ایک بڑی جماعت ترک وطن کر کے پاکستان میں آباد ہو گئی ہے اور کراچی، حیدر آباد، خیر پور، ملتان، لاہور، اور سرگودھا میں ان کے معیاری مدارس دینیہ بھی قائم ہو چکے ہیں۔ (۶۶)

کشمیر میں سید علی ہمدانی، اور میرٹھس عراقی کے دور میں شیعیت نے ترقی کی اور اب آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر دونوں میں شیعہ آباد ہیں (۶۷) اور مذہبی اہمیت و حیثیت کی بنیاد پر مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی کا رواج عام ہے۔

(۵) فنی حیثیت

مرثیہ کی فنی حیثیت کے متعلق مختلف ادیبوں نے اپنی جداگانہ اور مختلف النوع رائیں پیش کی ہیں۔ یہ امر حقیقت ہے کہ مرثیہ قلب کو چھو لینے والی نظم سے عبارت ہے جس میں ایسا تجربہ بیان کیا جاتا ہے جو اس شخص سے متعلق ہے یعنی اگر کسی شخص کا کوئی عزیز ناگہانی واقعہ کی بناء پر اس سے جدا ہو جائے اور متعلق شخص اس کی جدائی پر اپنے غم کا اظہار اس اندازہ پر کرتا ہے جس میں درد و الم، رنج و غم کے ساتھ اس کی جملہ خوبیاں بھی شامل ہوں اور یہ تمام اظہار کی کیفیات اجزائے ترکیبی کے ساتھ کسی شعری شکل میں ڈھل جائیں تو وہ مرثیہ کہلاتی ہیں۔

لغوی تعریف

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ لفظ مرثیہ ”رثا“ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مرنے والے کے اوصاف و کمالات ایسے پیرائے میں بیان کرنا جس سے سننے والے پر ایک خاص اثر طاری ہو (۶۹)

اصطلاحی تعریف

مرثیہ شاعری کی وہ صنف ہے جس میں مرنے والے کے اوصاف و کمالات اس انداز میں بیان کئے جائیں جس سے سننے والے کو اس سے دلی ہمدردی ہو اور ساتھ ہی کوئی خاص اخلاقی پہلو بھی نکلتا ہو (۷۰)

مختلف ادباء کی رائیں

اس سلسلے میں ”نور الحسن نقوی“ مرثیہ کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔ مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے اور ”رثی“ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں کسی کی موت پر رونا۔ اے

سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں۔ مرثیہ بالعموم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کر کے اس کی موت پر افسوس کیا جائے اور بالخصوص مرثیہ کا اطلاق اس نظم پہ ہوتا ہے جس میں امام حسین کی شہادت یا اس سے متعلق کوئی واقعہ غم انگیز پیرایہ میں بیان کیا جائے۔ ۲

”حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔“ مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص کی موت پر اظہار حسرت و غم کیا جائے اور اس کے اوصاف بیان کئے جائیں۔ اردو زبان میں عام طور پر مرثیہ کے لفظ سے شہادت اہل بیت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے لیکن اصل میں مرثیہ واقعات کر بلا کے بیان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے دوسرے کے مرنے پر بھی نظمیں کہی گئیں ہیں اور ان کو بھی مرثیہ ہی کہتے ہیں ۳

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ مرثیہ پر بھی اس لحاظ سے کہ اس میں زیادہ تر شخص متوفی کے محامد و فضائل بیان ہوتے ہیں مدح کا اطلاق ہو سکتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مردوں کی تعریف کو (جس میں تأسف اور افسوس شامل ہوتا ہے) مرثیہ کہتے ہیں ۴

علاوہ ازیں ”مولانا شبلی نعمانی“ نے مرثیہ گوئی کے تین اصول بیان کئے ہیں:

۱- ”مدوح کی عظمت و شان کا ذکر کیا جائے تاکہ اس سے عبرت کا سبق حاصل ہو کہ اس پائے کا شخص اٹھ گیا۔ ۷۵

۲- اس کے مرنے سے ملک میں جو رنج و ماتم برپا ہے اس کا ذکر کیا جائے ۷۶

۳- اس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کئے جائیں جس سے یہ ثابت ہو کہ انتہائی وارفتگی اور مدہوشی کی وجہ سے مرثیہ کہنے والے کو اس کی موت کی بھی خبر نہیں اور وہ اب تک اس کو اسی طرح مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے جس طرح زندگی میں کرتا تھا ۷۷

زین العابدین نے رثا کے متعلق لکھا ہے کہ۔

”رثا“ ان اشعار کو کہتے ہیں جس میں مرنے والوں کا ماتم کیا جائے دوستوں اور اقارب کی تعزیت کا ذکر ہو، قوم کے قائدین یا فرما رواؤں کے مرنے پر الم کا اظہار ہو یا پیشوا یا ان دین اور المیہ کا اظہار خاص طور پر حضرت سید الشہداء اور شہدائے کربلا کے مصائب کا ذکر ہو اور ان کے مناقب و فضائل بیان کئے جائیں ۸

علاوہ ازیں زین العابدین نے مرثیہ کی مندرجہ ذیل قسمیں بھی بتائی ہیں۔

۱- رثائے تشریفات و رسمی

یہ وہ مرثیے ہیں جن میں اکابر قوم و ملت اور سلاطین کی موت پر ماتم کیا جائے۔ ۹

۲- رثائے شخصی و خانوادگی

ان مرثیوں میں شعراء اپنے دوستوں، اپنے خاندان کے افراد یا اپنے پیاروں کے مرنے پر

اظہار تأسف اور تلقین صبر کرتے ہیں۔ ۸۰

۳- رثاء مذہبی

یہ وہ مرثیے ہیں جس میں پیشوایان دین کی موت موضوعِ سخن بنتی ہے خاص طور پر المیہ اظہار، سید الشہداء اور شہدائے کربلا کی وفات کا ذکر ان مرثیوں کا موضوع ہوتا ہے۔ ۸۱

مرثیہ سے متعلق ”زین العابدین“ نے جو قسمیں اور تعریفات بیان کی ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرثیہ اسے کہتے ہیں جس میں مرنے والوں کے ماتم کے ساتھ ساتھ قوم کے قائدین و فرما رواؤں، پیشوایان دین کے المیہ کا اظہار اور شہدائے کربلا کے فضائل و مناقب بیان کئے جائیں ساتھ ہی اپنے خاندان کے افراد یا اپنے پیاروں اور چہیتوں کے مرنے پر غم کے اظہار کے ساتھ صبر بھی کیا جائے ان تمام تعریفات سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مرثیہ کسی خاص شخصیت کی وفات پر بھی لکھا جاسکتا ہے (جیسا کہ مرثیہ کے فن کے باب میں بعض شعراء سے متعلق ذکر کیا گیا ہے) جب کہ ”اثر امداد امام“ نے مذکورہ بیانات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے مرثیہ کو فی زمانہ اہل بیت رسول کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ عام لوگوں کے جذبات و احساسات کا ذکر کر کے مرثیہ کے موضوع کو وسعت تو دی جاسکتی ہے لیکن اسے مرثیہ کے لئے شرط لازم قرار نہیں دیا جاسکتا ۸۲

اس سلسلے میں ”ڈاکٹر اکبر حیدری“ لکھتے ہیں کہ اصطلاح شعراء میں مرثیہ اس صنفِ سخن کو کہتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام کے نواسے حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی کربلا کے میدان میں المناک شہادت اور ان پر ڈھائے گئے بے پناہ مظالم و مصائب کا بیان ہو۔ ۸۳

ڈاکٹر اکبر حیدری کے بیان کے بموجب مرثیہ میں عمومیت نہیں بلکہ یہ صرف اہل بیت کے

ساتھ خاص ہے

تاریخی پس منظر

مرثیے کی فنی اہمیت کے سلسلے میں مرثیہ کی تاریخی حیثیت کا بیان بھی خاص اہمیت کا حامل ہے

مرثیہ واقعہ کربلا و شہدائے کربلا کے بیان کا نام ہے اسی لئے مرثیہ میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں کسی نہ کسی حیثیت سے ان کا تعلق مذہبی عقیدے سے بھی ہوتا ہے۔ واقعہ کربلا اور شہدائے کربلا کے متعلق تفصیلی واقعات و کیفیات کے بیان سے اسلامی کتب و توارخ بھری پڑی ہیں پھر بھی مناسب یہ ہے کہ مختصر ان واقعات پر ایک نظر ڈالی جائے۔ اور حضرت علی مرتضیٰ کے (حضرت فاطمہؑ کے لطن سے) سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ امام حسینؑ بانی دین و اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور وارث تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش رحمت میں پرورش و تربیت پانے کی وجہ سے وہ جملہ اوصاف حمیدہ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے میں ہونی چاہیے بدرجہ اتم موجود تھیں۔

حضرت رسول خدا ﷺ نے اپنے بعد حضرت علی کو اپنا جانشین مقرر کیا (لیکن اس بات کو کچھ لوگ مانتے ہیں کچھ نہیں) جو لوگ رسول کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کو خلیفہ مانتے ہیں ان کے خیال میں ۱۱ھ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترسٹھ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے تو شوری نے حضرت ابوبکر صدیق کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا اور پوری امت انھیں کی امامت میں دینی و شرعی، معاشرتی و سیاسی امور انجام دینے لگی اور یکے بعد دیگرے حضرت عثمان تک خلافت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ۸۴ھ

جب ۳۵ھ میں ناموافق و نامناسب حالات و کیفیات کی بناء پر حضرت عثمان کی شہادت کا ناگہانی واقعہ پیش آیا اور حضرت عثمان شہید کر دیے گئے تو جن لوگوں نے انھیں شہید کیا تھا انھوں نے ہی جا کر حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور انھیں اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا مدینہ میں جس قدر انصار و مہاجرین اصحاب کرام تھے سب نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، سوائے حضرت طلحہ و زبیر کے کہ انھوں نے بلوایوں کے جبر سے بیعت کی اور بیعت کرنے کے فوراً بعد مکہ چلے گئے ۸۵ھ اہل شام نے آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ چونکہ معاویہ شام کے گورنر تھے اور ان کا اور حضرت عثمان کا تعلق خاندان بنی امیہ سے تھا اس لئے ان کا خیال تھا کہ جس قدر انصار و مہاجرین نے آپ کے ہاتھوں پر بیعت کی ہے وہ

بلوایوں کے جبر سے کی ہے (۸۶) بہر کیف ۳۵ھ میں آپ نے مسند خلافت کو زینت دی اور ۸ رمضان ۴۰ھ کو عبدالرحمن بن ملجم خارجی کے ہاتھوں بمقام کوفہ شہادت نوش فرمایا (۸۷)

حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت امیر معاویہ نے باقاعدہ اپنی خلافت کا اعلان کیا پھر بھی مکہ، حجاز اور عراق میں بہت سے لوگ ایسے موجود تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور خلیفہ وقت ہونے کے قابل انکے جگر پاروں اور جگر گوشوں (امام حسن و حسین) کو ہی سمجھتے تھے۔ انھوں نے حضرت امام حسن کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا تھا مگر حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ حضرت امام حسن کو امیر معاویہ سے صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور خلافت سے دست بردار ہو گئے یہاں تک کہ ۴۵ھ میں امام حسن کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا اور امیر معاویہ شام میں لوگوں سے اندرون خانہ اپنے بیٹے یزید کے لئے عوام سے بیعت کرنے کا وعدہ لیتے رہے اور اپنے آخری ایام میں یزید کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا چنانچہ جب حضرت معاویہ وفات پا گئے تو یزید نے فوراً اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس دوران کوفہ سے برابر لوگ آپ کو بلانے کے لئے خط بھیج رہے تھے اور آپ کو خلیفہ امیر المومنین کے خطاب سے نوازا رہے تھے ساتھ ہی ان خطوط میں یزیدی عمالوں کے ظلم و ستم کے تذکرے ہوتے تھے اور آپ سے بیعت پہ آمادگی کا اظہار ہوتا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر آپ نے کوفہ جانے کا قصد کیا تو آپ کے بعض عزیزوں اور جانثاروں نے بھی آپ کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا امام حسینؑ کے منع کرنے کے باوجود نہیں مانے اسی طرح خاندان کے تقریباً سبھی افراد جن میں مرد عورتیں جوان بورھے اور لڑکیاں شامل تھیں آپ کے ساتھ روانہ ہوئے امام حسینؑ نے سب سے پہلے مدینہ سے مکہ جانے کا قصد کیا تا کہ فریضہ حج ادا کریں۔ اس دوران حضرت امام حسینؑ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا تا کہ حالات کا جائزہ لیں مسلم بن عقیل کے کوفہ پہنچنے پر ان کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا اور مسلم کے ہاتھوں پر لوگوں نے امام حسین کی بیعت کرنی شروع کر دی۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب کوفی عوام پر سختی برتی گئی تو وہ مسلم بن عقیل سے پھر گئے اور پھر انھیں

شہید کر دیا گیا۔ امام حسین کو جب مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملی تو انھوں نے حج کے بدلے عمرہ ادا کیا اور کوفہ کے سمت رخت سفر باندھا۔ اس دوران امام حسینؑ کے بعض خیر خواہوں نے (جن میں ان کے سوتیلے بھائی ابن حنیفہ اور حضرت زینب کے شوہر بھی تھے) انھیں روکنے کی بہت کوشش کی اور باپ و بھائی کے ساتھ جو کارکنار یاں کوفہ والوں نے کی تھی وہ بھی یاد دلائیں لیکن حسینؑ بضد رہے ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ کم از کم عورتوں اور بچوں کو تو ساتھ نہ لے جائیں مگر امام حسینؑ اس پر راضی نہ ہوئے۔ ماہ محرم کی دو یا تین تاریخ تھی کہ حسینی قافلہ ”نینوا بستی“ کے پاس پہنچ گیا یہی وہ بستی تھی جو آگے چل کر کرب و بلا کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہاں دریائے فرات کی ایک شاخ بہتی ہے جس کا نام علقمہ تھا امام حسینؑ نے گھوڑا روکا اور وہاں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا ابھی قافلہ پوری طرح اتر ابھی نہ تھا کہ یزیدی فوج کے بعض دستے پہنچ گئے اور مزاحمت شروع کر دی امام حسینؑ نے جنگ سے گریز کیا اور کچھ دور صحرائی تپتی ریت پر اپنا کیمپ قائم کیا۔

دو محرم سے آٹھ محرم تک یزیدی فوجیں گروہ در گروہ جمع ہوتی رہیں انھوں نے چاروں طرف سے امام حسینؑ کی مختصر سی فوج کا گھیراؤ کر رکھا تھا تا کہ بندی کر دی گئی تھی تاکہ غذا کے لئے رسد نہ پہنچ سکے سات محرم سے پانی تک بند کر دیا گیا تھا اس طرح صبح عاشورہ شروع ہوئی اور دشمن کی طرف سے عین نماز فجر کے وقت تیروں کی بوچھاڑ سے جنگ کا اعلان ہوا۔

صحیح تاریخی روایات میں یزیدی فوجوں کی تعداد بیس ہزار سے چالیس ہزار تک بتائی جاتی ہے اور حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کل بہتر افراد تھے جن میں بوڑھے نو عمر لڑکے اور ایک دودھ پیتا بچہ بھی تھا۔ ۵۸

امام حسینؑ اور ان کے بعض ساتھیوں نے جن میں حبیب بن مظاہر کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے روز عاشورہ بھی یزیدی فوج کے سامنے جا کر خطبے دیے مگر انکو راہ راست پر لانے یا صلح کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ میدان کارزار گرم ہوا کربلا کے بھوکے پیاسے مجاہدوں نے جہاد پر کمریں کیں اور

جب تک ان میں سے ایک فرد بھی زندہ رہا امام حسینؑ کو قتل سے بچانے کے لئے سر ڈھڑکی بازی لگائے رکھا۔ عباس کو لشکر کا علم بردار چنا گیا اکبر کو سپہ سالار بنایا گیا سب سے پہلے حروفِ مخالف سے امام حسین کی طرف چلا آیا تھا میدانِ جنگ میں گیا اور بہادری سے لڑ کر حسینؑ پہ جان قربان کی۔ پھر عرب دستور کے مطابق یکے بعد دیگرے اصحاب حسین میدانِ جنگ میں جاتے رہے اور جامِ شہادت نوش کرتے رہے پھر گھسان کی جنگ شروع ہوئی امام حسینؑ نے ایک یادگار اور بے مثال بہادری کی طرح جنگ کی ہر طرف سے تیر و تلوار، نیزے اور برچھیوں کے وار ہو رہے تھے حضرت حسین زخمی ہو گئے۔ (۸۹)

عصر کی اذان کی آواز کان میں آئی اپنے زخمی جسم کو گھوڑے سے گرا دیا اور مجروح پیشانی بارگاہِ الہی میں خاک زمیں پر جھکا دی اور اسی حالت میں شہر اور اس کے دیگر گیارہ ساتھیوں نے مل کر آپ کا سر تن سے جدا کر دیا ۹۰

وہ سراقدر جس کو ظلم و ستم کی ساری طاقتیں مل کر نہ جھکاسکیں تھیں اب وہ نیزہ بر بلند تھا۔

سر داد نہ داد، دست در دست یزید حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

کر بلا کے دردناک المیہ کا یہ مختصر خاکہ ہم نے حتی الامکان تاریخ کی روشنی میں پیش کیا ہے تاکہ جب آپ مراثی کا مطالعہ کریں تو اس کے پس منظر سے واقف ہوں یہی سادہ اور رنگین حقیقی واچھوتی داستان ہے جو صدیوں سے شاعروں، ادیبوں اور خطیبوں کا موضوعِ سخن رہی ہے اور خواص و عوام کے دل کے تاروں کو چھوتی رہی ہے۔

(و) مرثیے کے موضوعات

مرثیے کی فنی اہمیت کے پیش نظر مرثیے کے موضوعات کا بیان بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کی بنیاد حقیقت پر مبنی ہے۔ ایک تاریخی دل آزار واقعہ کو شاعری کے قالب میں ڈھال کر عوام الناس کے مابین پیش کرنا جس میں یاس، امید، رنج و غم، درد و الم، حسرت وغیرہ ہر طرح کے جذبات شامل ہوں مرثیہ ہی کے ذریعہ ممکن تھا اس لئے جہاں اردو شاعری کی دیگر اصناف نے اردو شاعری کو ارتقا

کے منازل تک پہنچایا وہیں مرثیہ نے بھی اردو شاعری کے دامن کو کافی وسعت دی۔ خصوصاً شہدائے کربلا کے مرثیوں نے اپنے طول و طویل موضوعات کی بناء پر اردو شاعری کو زندہ و جاوید بنا دیا۔

پہلا:

مرثیہ کا سب سے پہلا موضوع امام حسینؑ کا اپنے عزیزوں کے ساتھ مدینہ سے روانگی اور اس پر امام حسینؑ کی بیٹی صفری کا ساتھ جانے کے لئے بضد ہونا ہے جناب صفری بیماری کی وجہ سے اپنے والد امام حسینؑ کے ساتھ نہیں جاسکتی تھیں اس بناء پر ان پر اور ان کے عزیزوں پر ان کی جدائی کے جذبات و احساسات کی مرثیہ کے ذریعہ نمائندگی و ترجمانی کرنا مرثیہ کے وہ موضوعات ہیں جن پر مرثیہ نگاروں نے اپنے قلم کی جولانی دکھانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اس سلسلے میں سنبل نگار لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ اور ان کے عزیزوں کی مدینہ سے روانگی اس واقعہ کا پہلا موضوع ہے جناب امام حسینؑ اپنی ایک کم سن بیمار بیٹی صفری کو ساتھ نہیں لے جاتے وہ ساتھ چلنے کے لئے ضد کرتی ہے یہ روانگی کے موضوع کا ہی ایک پہلو ہے ۹

دوسرا:

مرثیہ کا دوسرا موضوع وہ طویل ترین سفر ہے جس میں امام حسینؑ اور ان کے عزیزوں و ساتھیوں کو کافی پریشانیوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا جس میں دھوپ، پانی کی کمی، پیاس سے بے حالی، تھکان وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر مرثیہ نگاروں نے عمدہ فنکاری اور طبع آزمائی کی ہے اور مذکورہ تمام موضوعات کو مرثیہ میں جگہ دیکر اس کی وسعت کو اجاگر کیا ہے۔

تیسرا:

مرثیہ کا تیسرا موضوع حُر کا دوران سفر امام حسینؑ کے قافلے کو روکنا، پھر حر کے لشکر میں پانی کا ختم ہو جانا اور امام حسینؑ کا حر اور اس کے لشکر کو پانی مہیا کرانا۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن کو مرثیہ نگاروں نے اپنے اپنے مزاج و ذوق طبع کے مطابق مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے جس سے مرثیہ کی مقبولیت دن بدن

دو گنی ہوتی گئی۔

چوتھا:

مرثیہ کا چوتھا موضوع حضرت امام حسین اور آپ کے اصحاب کا کربلا کے میدان میں پہنچنا، وہاں یزیدی فوجوں کا آپ کے خیموں کو نصب نہ کرنے دینا، پانی کا بند کر دینا، آپ کا صلح کے لئے جدوجہد کرنا اور نا کام ہونا، جنگ کی تیاری کرنا اور دشمن سے جنگ کرنا آپ کے عزیز بہادروں کا شہید ہو جانا، نچتجا خود شہادت پانا، پھر آپ کی اور آپ کے اصحاب کی شہادت پر خاندان کی عورتوں کی گریہ وزاری وآہ بکا اور رنج و غم کا اظہار کرنا وغیرہ یہ چہارگانہ وہ موضوعات ہیں جس نے مرثیہ کو ترقی کے منازل تک پہنچایا اور مرثیہ کے دامن کو اتنا وسیع کر دیا کہ اس میں ہر طرح کے موضوعات سما سکتے ہیں۔ (۹۲)

۱۔ مرثیہ کی ہیئت

مرثیہ کی فنی خصوصیات میں مرثیہ کی ہیئت کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے جب کہ مرثیہ کسی خاص بیان ہیئت کا تابع نہیں ہے کیونکہ مرثیہ کسی بھی شکل و ہیئت میں لکھا جاسکتا ہے خواہ وہ غزل ہو قطع، رباعی، مربع، مخمس، اور مسدس ہو البتہ جب کوئی شاعر مرثیہ کہتا ہے تو ادب کے طالب علم کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ آیا مرثیہ کی ہیئت و شکل کیا ہے اس سلسلے میں سنبل نگار رقم طراز ہیں کہ مرثیہ کے لئے کسی خاص ہیئت یعنی فارم کی پابندی لازمی نہیں۔ غزل، قطع، رباعی، مخمس، مسدس، مربع کسی بھی فارم کو مرثیہ کے لئے اختیار کیا جاسکتا ہے مرثیہ کو دراصل اس کے فارم سے نہیں بلکہ موضوع سے پہچانا جاتا ہے ۹۳ نور الحسن نقوی لکھتے ہیں کہ تاریخ ادب کے ورق الٹتے تو پتہ چلتا ہے کہ مرثیہ کے لئے کوئی خاص ہیئت متعین تو نہیں رہی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ لازمی طور پر کوئی ہیئت آج بھی مقرر نہیں ۹۴

مذکورہ بیانات کے پیش نظر مرثیہ کسی خاص ہیئت کا پابند نہیں بلکہ کسی بھی شکل میں کہا جاسکتا ہے اور یہی شی اس کی بے پناہ مقبولیت کا راز ہے۔

علاوہ ازیں اردو مرثیہ کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مرثیہ غزل و مثنوی کی ہیئت و شکل

میں کہا گیا ہے جو طویل عرصہ تک مرثیہ کے لئے موزوں صنف تھی جیسا کہ غالب نے عارف کا مرثیہ (غزل کی شکل میں) اور علامہ اقبال نے اپنی والدہ مرحومہ کا مرثیہ (مثنوی کی شکل میں) کہا ۹۵

لیکن ان تمام ہیئتوں کے باوجود مرثیہ کے لئے مسدس کی شکل سب سے کارآمد اور موزوں ثابت ہوئی۔ اس سلسلے میں نور الحسن نقوی لکھتے ہیں کہ

آخر کار مسدس مرثیہ کے لئے موزوں ترین شکل ٹھہری اس میں چھ مصرعوں کے بند ہوتے ہیں چار مصرعہ ایک قافیہ وردیف میں باقی دو جدا گانہ قافیہ وردیف میں۔ ۹۶

اجزائے ترکیبی

مرثیہ کی فنی اہمیت وحیثیت کی بقاء قائم رکھنے میں مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ مرثیہ کے موضوعات جوں جوں ترقی کے منازل طے کرتے گئے وہیں مرثیہ کے لئے ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ اسے پڑھنے کے لئے مختلف حصوں میں بانٹا جائے اور مرثیہ کے یہی حصے اس کے لئے اجزاء ترکیبی کہلائے۔ اور میر ضمیر کے عہد تک آتے آتے مرثیہ کے لئے اجزائے ترکیبی متعین ہو چکے تھے پھر بھی بعض مرثیہ نگاروں نے یہ سوچ کر کہ کہیں مرثیہ طویل نہ ہو جائے اپنے مرثیوں سے اجزائے ترکیبی کو حذف کر دیا۔

اردو مرثیہ آہستہ آہستہ ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا اور اس کے موضوعات میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا اور مطالعہ کے لئے اسے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا یہ حصے اجزائے مرثیہ کہلائے۔ میر ضمیر کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے مرثیہ کے یہ اجزائے ترکیبی متعین ہو چکے تھے۔ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت اور بین وغیرہ۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ اجزاء تمام مرثیوں میں نہیں پائے جاتے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ ان اجزاء کو نظر انداز کیا جاسکے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرثیہ کے اجزاء ترکیبی کیا ہیں؟ اور مختلف مرثیہ نگاروں نے انہیں

اپنے مرثیہ میں کس طرح جگہ دی ہے؟ اس بارے میں ادیبوں کی رائیں مختلف ہیں بعض نے مرثیہ کی تمہید (آغاز) حمد، نعت، منقبت، اور منظر سے کی ہے ۹۷ بعض نے تمہید کو چہرہ سے تعبیر کیا ہے ۹۹ اور بعض نے حمد و ثنا، نعت رسول، مدح اہل بیت، خود اپنی تعریف، دنیا کی بے ثباتی یا مختلف مناظر کے بیان سے کی ہے۔

ان تمام مختلف تعبیرات سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ چہرہ ہی اصل میں مرثیہ کا وہ بنیادی حصہ ہے جس سے مرثیہ کا آغاز ہوتا ہے (خواہ وہ کسی بھی شکل میں بیان کیا گیا ہو) اور اس سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ جب کسی چیز کا آغاز کیا جاتا ہے تو اس میں ایسے دلکش مناظر پیش کئے جاتے ہیں جس سے قاری کے ذہن پر مثبت اثر پیدا ہو مثلاً صبح کا منظر، رات کا سماں، یا پھر مناجات وغیرہ۔

مرثیہ کا دوسرا حصہ سراپا کہلاتا ہے مرثیہ کا یہ حصہ اس لئے بھی بہت اہم ہے کہ اس میں ہیرو کی تعریف و توصیف بیان کی جاتی ہے۔ مختلف ادیبوں نے الفاظ کے تیج و خم اور نشیب و فراز کے مابین سراپا کی تعریف بیان کی ہے (۱۰۱)

جس کا ما حاصل ایک ہی ہے سراپا میں شاعر ہیرو کے حسن اخلاق اور اوصاف و کمالات کے بارے میں مکمل جانکاری مرثیہ کے پڑھنے یا سننے والے کو دیتا ہے تاکہ آگے جب مرثیہ کے ہیرو کے کسی نمایاں کارنامے یا اس کی عادات و اطوار اور قد و قامت کا ذکر ہو تو پڑھنے والا یا سننے والا بخوبی سمجھ جائے کہ ہیرو کی کن خوبیوں کو بیان کیا جا رہا ہے۔

مرثیہ کا تیسرا حصہ جسے رخصت کے نام سے جانا جاتا ہے اس لئے بھی کافی اہم ہے کیونکہ اس حصے میں شاعر ہیرو کی رخصت کا ذکر کرتا ہے (۱۰۲) شاعر مرثیہ کے اس بنیادی حصہ میں قلم کی جولانی اور ہیرو کے اوصاف و کمالات کے بیان کرنے میں پوری زور آزمائی کرتا ہے۔

مرثیہ کا چوتھا حصہ آمد ہے اس حصہ میں شاعر قارئین اور سامعین کو ایسے دلکش مناظر سے روشناس کراتا ہے جس میں مجاہد کا جنگ میں درد کے ساتھ دشمنوں کی حالت زار پر خوف و ہراس پھیل

جاتا ہے۔ (۱۰۴)

مرثیہ کا پانچواں حصہ رجز ہے اس حصہ میں ایسے مناظر پیش کئے جاتے ہیں جس میں بہادر میدان جنگ میں آ کر اپنی اور اپنے بزرگوں کی بڑائی بیان کرتا ہے اور ان کے نمایاں کارناموں کو منفریہ انداز میں بیان کرتے ہوئے دشمنوں کو لکا کرتا ہے (۱۰۴) جس سے دشمنوں کی فوج پر خوف و ہراس کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مرثیہ کا چھٹا حصہ رزم ہے اس حصہ میں ایسے مناظر پیش کئے جاتے ہیں جس سے جنگ کا آغاز ہوتا ہے اور مجاہد کے جنگ کرنے کا مکمل حال تفصیل سے اس اندازہ میں لکھ دیا جاتا ہے کہ جنگ کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے اور ساتھ ہی ایسے مناظر بھی آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں جس میں جنگ کے دوران تلواروں کا چلنا، دھوپ کی شدت اور گھوڑے وغیرہ کا تیز روی کے ساتھ دوڑنا سبھی کچھ شامل ہوتا ہے ۱۰۴۔

مرثیہ کا ساتواں حصہ شہادت ہے اس حصہ میں ہیر و کا بہادری کے ساتھ جنگ کرتے کرتے دشمنوں کے زرعے میں پہنچ جانا مجروح ہونا اور آخر کار معبود حقیقی سے جا ملنا بیان کیا جاتا ہے۔ ۱۰۵۔

مرثیہ کا آٹھواں حصہ بین ہے اس حصہ میں مرثیہ نگار ایسے مناظر پیش کرتے ہیں جس میں بہادر کے شہید ہو جانے کے بعد اس کے اپنوں اور عزیز و اقارب کی گریہ و زاری، اور رنج و ملال کا اظہار ہوتا ہے ۱۰۶۔

ایسی حالت میں شاعر جذبات نگاری کے وہ جوہر دکھاتا ہے جس سے پڑھنے والوں اور سننے والوں کی آنکھوں سے خود بخود آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے اور دل سوگوار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ بنیادی حصہ ہے جس میں شاعر کو اپنے فن شعور اور متبادر دلکش مناظر کو عوام الناس کے سامنے پیش کرنے کا پورا موقع فراہم ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے دیکھا جائے تو مرثیہ کا پورا دار و مدار اسی حصہ پر ہوتا ہے۔

ان ہی اجزائے ترکیبی کا نام مرثیہ ہے۔ مرثیہ کی بے پناہ مقبولیت میں ان اجزاء ترکیبی کا نمایاں مقام ہے۔ مرثیہ کے سلسلے میں جن ادیبوں نے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے ان کے نزدیک اجزائے ترکیبی

بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ مرثیہ ہماری شاعری کی وہ صنف ہے کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے اس نے اردو شاعری کو نئے نئے موضوعات عطا کئے حادثہ کر بلا پر بے شک پہلے بھی عربی و فارسی زبان میں مرثیے کہے گئے لیکن وہ اردو مرثیہ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ دنیا کی کسی اور زبان میں تو اس موضوع پر اور ایسے فن کارانہ انداز میں مرثیہ کے بیان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اردو شاعری اس صنف پر جتنا ناز کرے بجا ہے۔ گویا کہ مرثیہ صنف شاعری کا وہ اہم جز ہے جس نے شاعری کے دامن کو تو وسعت دی ہی ساتھ ہی ساتھ مرثیہ میں نئے نئے موضوعات کو بھی جگہ دی۔ علاوہ ازیں مرثیہ میں ایسی بہت سی اصناف موجود ہیں جو کسی دیگر اصناف شاعری میں پائی نہیں جاتیں۔

حواشی

- ۱- شیخو: مرثی شواعر العرب - شوقی ضیف تاریخ الادب العربی ۱/ ۲۰۷/۲ حوالہ سابق
- ۲- حوالہ سابق
- ۳- دیکھئے المفہمات ص ۲۲۷/ دائرة المعارف الاسلامیہ (اردو) ۲۰/۳۹۰
- ۴- دیوان اوس ابن حجر ص ۵۳
- ۵- الانساب الاشراف ۱/ ۵۹۲-۵۹۴
- ۶- دیوان حسان بن ثابت ص ۵۸
- ۷- حوالہ سابق
- ۸- دیکھئے: دیوان ابو تمام مرثیہ محمد بن حمید الطوسی الطائی خوارج کے ہاتھوں مارے گئے یزید بن مزید کی موت پر بھی بکثرت مرثیے کہے گئے۔ شاعرات میں الخنساء اور لیلی الاخیلیہ کے مرثیے عربی ادب میں بڑے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ دائرہ ۲۰/ ۳۹۱-۳۹۵
- ۹- مثلاً عبد المجید الشقی پر ابن مناظر کا مرثیہ دائرہ ۲۰/ ۳۹۵
- ۱۰- الخالدین المختار من شعر لبشار ص ۲۵
- ۱۱- ابن رقیق العمدة ۲/ ۱۲۵
- ۱۲- المسعودی مروج الذهب ۳/ ۳۱۳
- ۱۳- دائرہ ۲۰/ ۳۹۲
- ۱۴- الصولی الاوراق: اخبار الشعراء ص ۱۶۳ الاغانی ۲۰/ ۵۶
- ۱۵- دائرہ المعارف الاسلامیہ ۲۰/ ۳۹۲

- ۱۶- مثلاً ابن یردوں
- ۱۷- مثلاً شیخ سعدی کا مرثیہ جو سقوط بغداد کے بعد لکھا
- ۱۸- دائرۃ ۳۹۳/۲۰
- ۱۹- بعض اوقات کسی معاشرے یا شہر کی بربادی کا بھی مرثیہ لکھا گیا جیسا کی حالی نے تذکرہ، دہلی مرحوم، والی نظم میں اظہار غم کیا اسی طرح بعض شہر آشوب بھی مرثیہ کے ضمن میں آ جاتے ہیں۔
- ۲۰- آب حیات
- ۲۱- میر دیوان اول
- ۲۲- دیوان غالب
- ۲۳- حالی: مرزا غالب لاہور ۱۹۴۲ء
- ۲۴- محمد اقبال: بانگ درا والدہ مرحومہ کی یاد میں اب ہم قریب تر زمانہ کے تصنیف شدہ مرثیے تک پہنچ گئے ہیں۔ راقم
- ۲۵- حفیظ اللہ جالندھری: سوز و ساز
- ۲۶- مرتبہ: رشیدی لاہور ۱۹۵۰ء
- ۲۷- دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۳۹۶/۲۰
- ۲۸- یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے اکثر شعری نشستوں اور جا بجا شاعروں میں بھی سماجی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی حالات کے بدتر مناظر نظموں اور غزلوں کی شکل میں سننے کو ملتی رہتی ہیں جنہیں ہم شہر آشوب کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ راقم
- ۲۹- تفصیل کے لئے دیکھئے: حسین خاں کوکب، فغان دہلی، علامہ اقبال بانگ درا، شبلی نعمانی، در تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ج ۹ سہیل احمد خاں، قومی و ملی شاعری در تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند ج ۹ عبدالعزیز خالد، خروش خم، نظمیں، یا رحمۃ اللعالمین و بان گروہ

ڈاکٹر سید عبداللہ: مباحث مقالہ شہر آشوب

- ۳۰- حصہ دوم ص ۱۱۰-۱۱۱، ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہاشم و کاظم کے مراٹھی ایڈنمبر ایونیورسٹی میں محفوظ ہیں
- ۳۱- حوالہ سابق
- ۳۲- جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو
- ۳۳- تاریخ ادب اردو/۱۷۶-۱۷۷
- ۳۴- میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ شعراء اردو میں اس کا ذکر کیا ہے۔ دیکھئے شعراء اردو ص ۱۲۳ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۲ء
- ۳۵- دیکھئے سید عبداللہ: ولی سے اقبال تک ص ۲۲ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو/بمداشاریہ
- ۳۶- خانی خاں نے لکھا ہے کہ مرزا بیجا پوری نے اپنے آپ کو حمد و نعت و منقبت ائمہ ظاہرین کے لئے وقف کر رکھا تھا بعد میں اس نے شہداء کربلا کے ماتم میں بے شمار مرثیے لکھے مرزا کے مرثیے عالمگیری فوج میں بھی بے حد مقبول تھے اور اس کے ذریعہ شمالی ہند میں پہنچے۔ دیکھئے منتخب الباب ۳/۳۶۰ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۵ء
- ۳۷- جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو ۱/۱۹۶، ۳۱۹، ۳۶۹، ۳۷۵، ۳۸۹، ۵۶۶، ۵۸۳، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء صفدر حسین رزم نگاران کربلا ص ۱۷، ۴۹، ۵۰، ۵۱، لاہور ۱۹۷۷ء
- ۳۸- بقول ابوللیث صدیقی اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ محمد شاہ کے عہد میں سودا سے کچھ پہلے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا فن بہت حد تک ترقی کر چکا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۶۶۸ مطبوعہ لاہور میر جعفر: کلیات جعفر زٹلی۔ ص ۳۵-۳۶ مطبوعہ محمدی دہلی ۱۲۸۹ء
- ۳۹- دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۲۰/۳۹۹-۴۰۰
- ۴۰- حوالہ سابق

- ۴۱- غالباً اس لئے کہ ان کے سلسلے میں انیس ودبیر جیسے کا ملین فن پیدا ہوئے ورنہ فصیح ودلگیر نے مرثیہ کی تشکیل جدید میں قابل قدر حصہ لیا ہے۔ دیکھئے دائرۃ ۴۰/۲۰
- ۴۲- حوالہ سابق
- ۴۳- موازنہ انیس ودبیر ص ۳۴-۳۵، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء
- ۴۴- دائرۃ ۴۰/۲۰
- ۴۵- شعرالہند ۲/۱۱۵ دائرۃ ۴۰/۲۰
- ۴۶- موازنہ انیس ودبیر دائرۃ ۴۰/۲۰
- ۴۷- خواہ نقاہت کے اعتبار سے ان روایات کا اعتبار کچھ بھی ہو
- ۴۸- دائرۃ ۴۰/۲۰
- ۴۹- حوالہ سابق
- ۵۰- الیہا
- ۵۱- یہ حقیقت ہے کہ صنف مرثیہ میں جس قدر ممکنات تھیں وہ مراۃ انیس میں بدرجہ کمال موجود ہیں۔
- ۵۲- خانوادہ انیس میں کچھ مرثیہ کہنے والے نظر آتے ہیں مثلاً ان کے چھوٹے بھائی میر مونس، اور بڑے صاحبزادے میر خورشید علی نفیس یہ بھی صاحب دیوان تھے اور انھوں نے اچھے مرثیے کہے۔ سید مرزا عشق ۱۳۰۹ء اور شاد عظیم آبادی ۱۳۳۶ھ وغیرہ نے بھی شہید کربلا سے عقیدت کی بناء پر مستحسن مرثیہ گوئی کی مگر اپنی ودبیر والی بات کہاں۔ دائرہ ۴۰/۳
- ۵۳- مؤخر الذکر کے مجموعہ کلام میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جو مرثیہ ہونے کے باوجود روایتی مرثیوں سے الگ ہیں۔ ان نظموں میں شہادت کو ایک بلیغ استعارہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے یہ زندگی کے گونا گوں مسائل سے ہم آہنگ کیا گیا ہے اور حضرت امام حسینؑ کی ذات کے حوالے

سے حیات و کائنات کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے دیکھیے: سید حضور حسین رزم نگاران

کربلا۔ لاہور ۱۹۷۷ء

۵۴۔ ضمیر اختر ندوی: جوش ملیح آبادی کے مرثیے۔ ص ۲۷ لکھنؤ ۱۹۸۱ء

۵۵۔ تفصیل کے لئے دیکھیے: صفدر حسین۔ مرثیہ بعد انیس

۵۶۔ ضمیر اختر ندوی: جوش ملیح آبادی کے مرثیے۔ ص ۲۷ لکھنؤ ۱۹۸۱ء

۵۷۔ حوالہ سابق

۵۸۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد چار ہزار تک پہنچ

گئی تھی۔ جن میں امام ابو حنیفہ، مالک بن انس، سفیان عیینہ وغیرہ شامل تھے۔ دائرۃ ۱۱/۹۰۷

۵۹۔ چار سو کتابوں میں سے جنہیں شیعہ اصطلاح میں اربعۃ کہا جاتا ہے زیادہ تر انہیں کے دور میں

مدون ہوئیں۔ حوالہ سابق

۶۰۔ جامع نہج البلاغۃ۔

۶۱۔ دائرۃ ۶۱/۹۰۸

۶۲۔ جس کا بانی شاہ اسماعیل صفوی تھا۔

۶۳۔ دائرۃ ۱۱/۹۰۸

۶۴۔ دائرۃ ۱۱/۹۰۸

۶۵۔ حوالہ مذکور

۶۶۔ دائرۃ ۱۱/۹۰۹

۶۷۔ حوالہ سابق

۶۸۔ شیخ مرثی سوا العرب۔ مرتضیٰ زبیدی القاموس۔ مادہ رثی، رث و

۹۶۔ حوالہ سابق

- ۷۰- ڈاکٹر ام ہانی اشرف، اردو مرثیہ نگاری ص ۲۴، دہلی ۱۹۹۲ء
- ۷۱- سید مسعود حسن رضوی ادیب: روح انیس ص ۸، لکھنؤ ۱۹۳۱ء
- ۷۲- پروفیسر حامد حسن قادری: تاریخ مرثیہ گوئی، ص ۵، دہلی ۱۹۷۳ء
- ۷۳- مقدمہ شعر و شاعری: مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی - ۲۲۸-۱۸۹۳ء
- ۷۴- شعر العجم ۱/۱۷۷ اعظم گڑھ
- ۷۵- حوالہ سابق
- ۷۶- حوالہ سابق
- ۷۷- سید عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات ص ۶۳۵-۱۹۶۰ء
- ۷۸- حوالہ سابق
- ۷۹- حوالہ سابق
- ۸۰- جیسا کہ فرخی کا مشہور مرثیہ جو محمود غزنوی کی وفات پر لکھا گیا اور جس کی تہنیت قصیدے کی ہے اس شق سے متعلق ہے۔ حوالہ سابق
- ۸۱- کاشف الحقائق ص ۱۳۹، مطبوعہ نئی دہلی ۱۹۸۲ء
- ۸۲- اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقاء ص ۶۷ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۸۱ء
- ۸۳- مورخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان کی خلافت کے آخری ایام میں مخالفوں اور بغاوتوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔
- ۸۴- کیونکہ اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ حج کے اردے سے مکہ ہی میں تھیں۔
- ۸۵- تاریخ اسلام
- ۸۶- حوالہ سابق

- ۸۷- مرثیہ گو شاعروں نے شاعرانہ مبالغہ کی بناء پر یزیدی فوجوں کی تعداد لاکھوں لکھتے ہیں۔ صالحہ عابد حسین: انیس کے مرثیے ۱/ ۲۸ ترقی اردو لاہور دہلی ۱۹۹۰ء
- ۸۸- حوالہ سابق
- ۸۹- حوالہ سابق ڈاکٹر مسیح الزماں کا اردو مرثیہ کا ارتقاء ص ۲۵
- ۹۰- ام ہانی اشرف: اردو مرثیہ نگاری ص ۲۰ الہ آباد ۱۹۹۲ء
- ۹۱- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۴۲
- ۹۲- حوالہ سابق
- ۹۳- ام ہانی اشرف: اردو مرثیہ نگاری ص ۳۱
- ۹۴- تفصیل کیلئے۔ دیکھئے ام ہانی اشرف: ۳۲
- ۹۵- ام ہانی اشرف ص ۳۲ ڈاکٹر مسیح الزماں اردو مرثیہ کا ارتقاء ص ۴۱۵
- ۹۶- حوالہ سابق۔
- ۹۷- ام ہانی اردو مرثیہ نگاری ص ۳۸
- ۹۸- تفصیل کے لئے دیکھئے: سنبل نگار ص ۱۱۴۸ ام ہانی اشرف: ص ۳۴ مسیح الزماں ص ۴۱۶
- ۹۹- حوالہ سابق
- ۱۰۰- حوالہ سابق
- ۱۰۱- ایضاً
- ۱۰۲- تفصیل کے لئے دیکھئے: شبلی نعمانی موازنہ انیس و دبیر
- ۱۰۳- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۴۸

باب دوم

اردو مرثیوں میں کردار نگاری

(الف) اردو مرثیوں میں کردار

☆ ممدوحین ☆ مخالفین

(ب) کردار نگاری کے مواقع

☆ سراپا ☆ رخصت ☆ آمد

☆ رجز ☆ وقت جنگ تضامت/کیفیت

☆ مکالمے ☆ عمل

باب دوم

(الف) اردو مرثیہ میں کردار نگاری

اردو مرثیہ میں عام طور پر مختلف کردار نظر آتے ہیں اور یہ کردار کسی بھی شکل میں ہمارے سامنے رونما ہو جاتے ہیں مثلاً عورت، مرد، بچہ، بزرگ، غلام، جوان، ماں، باپ، دشمن، عزیز اور دوست وغیرہ اگر اردو مرثیہ کی روایت پر نظر ڈالی جائے (جیسا کہ باب اول، اردو مرثیہ کافن میں گزر چکا ہے) تو بخوبی اندازہ ہوگا کہ مرثیہ اب صرف واقعات کر بلا اور شہیدان کر بلا کے اظہار بیان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اب شخصی مرثیوں کی روایت شروع ہو چکی ہے۔ فطرت کا قانون ہے کہ زندگی میں ہر شے ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی اس میں تغیر و تبدل رونما ہوتے رہتے ہیں۔ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ تہذیب و تمدن، افکار و اقدار وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہے جس سے حساس شاعر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

مرثیہ کا ابتدائی موضوع اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے عبارت تھا جس میں مرثیہ گو شاعر کا اصل اور بنیادی مقصد صرف اظہار رنج و غم تھا۔ یہ اظہار رنج و غم و الم واقعہ کر بلا سے عام تھا جس کے تحت ہر اس شخص کے لئے مرثیے لکھے جاتے تھے جو اس دار فانی سے کوچ کر جائے (۱)

پھر بھی مرثیہ نگار شعراء کرداروں کے ذریعہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بآسانی سامعین کے روبرو کر دیتا ہے۔ کردار نگاری کے سلسلے میں ایسے صدیقی لکھتے ہیں کہ۔

”اردو مرثیوں میں مختلف النوع کردار پائے جاتے ہیں جن میں عورت، مرد، بوڑھا، بچہ، جوان، آقا، غلام، ماں باپ، بہن بھائی، اولاد، دوست، دشمن اور مختلف احباب، موقع محل کے اعتبار سے سامنے آتے ہیں اور عام معاشرتی زندگی کے ایسے خاکے پیش کرتے ہیں جس میں رنگ بھرنے کے لئے

شاعر کو فنکارانہ چابک دستی کے علاوہ ہر کردار کے لئے اس کے مخصوص رنگ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے کردار نگاری میں کامیابی اسی پر منحصر ہے۔ (۲)

ایسے صدیقی کے قول کے بموجب کردار نگاری میں اگر مذکورہ باتوں کا خیال و پاس نہ رکھا جائے تو شاعر کو کردار نگاری کے سلسلہ میں مقبولیت اور کامیابی ملنا مشکل ہے۔

ڈاکٹر صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں کہ لوگوں کے ذہنوں میں عام طور پر یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ مرثیہ صرف رونے رلانے کے لئے ہوتے ہیں یوں تو ابتدائی زمانے کے مرثیوں تک میں بھی شہیدانِ کربلا کی زندگی کے واقعات بیان کئے جاتے تھے اور ان مثالی کرداروں اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی حامل ہستیوں سے دنیا کو متعارف کرایا جاتا تھا وہ بجائے خود اخلاقی تربیت کا ایک ذریعہ کہا جاسکتا تھا (۳)

یوں تو واقعاتِ کربلا کے موضوعات پر ہر دور میں مرثیے لکھے جاتے رہے ہندوستان کی متعدد زبانوں میں واقعاتِ کربلا پر اپنے انداز میں مرثیے کہے گئے اور مرثیہ گو شاعر زیادہ تر ان مصائب کا تذکرہ کرتا جو اس کو کربلا میں پیش آئے۔ لیکن یہ میر انیس کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے خاندانِ نبوت کی سیرت نگاری و کردار نگاری اس کے شایانِ شان کی اور اس کا حق ادا کیا۔ مدینہ سے کربلا تک کا سفر اور پھر محرم کے دس دنوں میں پیش آنے والے واقعات کی مرقع کشی کر کے انھوں نے واضح کر دیا کہ وہ کس شان و شوکت اور کس کردارِ اعلیٰ کی بیویاں تھیں۔

میر انیس کے یہاں ایک ہی موضوع کے متعدد مرثیے ملتے ہیں مگر سب کا رنگ و روپ جداگانہ اور سب کا اسلوب بیان مختلف ہے میر انیس کے اسلوب میں نظریہ سے زیادہ بیانیہ کیفیتیں ابھر تی ہیں ان کا بیانیہ ان کی منظر نگاری سے کہیں زیادہ بہتر خوبصورت اور موثر تر ہے میر انیس نے صبح و شام گرمی و سردی جنگل و پہاڑ دریا سفر و حضر زنداں و ہنگامہ جنگ رخصت و شہادت کے مضامین نظم کئے ہیں ایک مرثیہ میں صبح عاشورہ باپ بیٹی کی رخصت کا جو منظر دکھاتا ہے وہ اور بھی زیادہ درد انگیز اور اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

دیکھائیہ کہہ کے بالی سیکنہ کو یاس سے لپٹی وہ دوڑ کر شہ گردوں اساس سے
طاقت نہ تھی کلام کی ہر چند پیاس سے بولی و تشنہ کام شہ حق شناس سے
ع کیا اس بلا کی بن سے تہیہ سفر کا ہے صدقہ گئی بتاؤ ارادہ کدھر کا ہے ۴
میر انیس کے مراٹھی نے نہ جانے کتنی نسلوں پر کتنا اثر ڈالا ہوگا جو تقریباً ڈیڑھ سو سالوں سے ان
مرثیوں کو سنتے ہیں اور اس میں بیان کی ہوئی دلکش و دلنشین تہذیب اور مثالی کرداروں سے بھرپور متاثر
ہوتے رہے ہیں یہ ایک اہم موضوع ہے جس پر تحقیقی عمل ہو سکتا ہے۔

مراٹھی انیس کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کرنے میں جن کرداروں کا ذکر ہمارے سامنے آتا ہے
ہم ان کے اسم مع لقب درج کر رہے ہیں تاکہ ان میں سے اکثر مرثیہ پڑھتے وقت سمجھ میں آجائیں کہ
کون سا لقب کس کے لئے استعمال کیا گیا ہے (چہ جائے کہ ان کے القاب تو بے شمار ہیں جو اکثر صفات
سے متعلق ہوتے ہیں) مثلاً حضرت علی کے لئے شیر خدا امام حسین کے لئے مظلوم کر بلا شہنشاہ دارین شاہ
دین و دنیا سید سجاد کے لئے بیمار کر بلا اور علی اکبر کے لئے شبیہ رسول یا ہم شکل پیمبر اور حضرت عباس کے
لئے سقائے سیکنہ شیر کر بلا وغیرہ وغیرہ

کر بلا کا اندوہ ناک المیہ اور مراٹھی انیس کے اہم کرداروں کے نام حسب ذیل ہیں۔

- ۱- امام حسینؑ کر بلا کے المیہ کے ہیرو
- ۲- عباس بن علیؑ امام حسین کے سوتیلے جاں نثار بھائی
- ۳- علی اکبرؑ امام حسین کے منجھلے صاحبزادے جن کی عمر اٹھارہ برس تھی
- ۴- سید سجاد، عابد، یازین العابدین چوتھے امام، امام حسین کے بڑے صاحبزادے
- ۵- علی اصغرؑ امام حسین کا چھ ماہ کا بچہ
- ۶- عون اور محمدؑ حضرت زینب کے نو عمر بہادر بیٹے
- ۷- قاسمؑ امام حسن کے بیٹے۔ امام حسین کے بھتیجے اور داماد

- ۸- حضرت زینبؓ امام حسینؑ سے چھوٹی بہن جن کا حصہ واقعہ کربلا میں امام حسین کے بعد سب سے اہم ہے
- ۹- حضرت ام کلثومؓ امام حسینؑ کی سب سے چھوٹی بہن جو اپنی بڑی بہن زینب کے ساتھ واقعہ کربلا میں اہم رول ادا کرتی رہی۔
- ۱۰- شہر بانو یا بانو امام حسین کی بیوی، شاہ ایران یزدگرد کی پوتی
- ۱۱- فاطمہ کبری، فاطمہ صغری، سکینہ امام حسین کی صاحبزادیاں
- ۱۲- فضہ جناب فاطمہ کی کنیز جنہوں نے زینب اور حسین کو پالا بھی تھا اور سب ان سے محبت اور عزت بھی کرتے تھے۔
- ۱۳- ہندہ خاندان حسین میں پرورش پائی عورت جن کی شادی یزید بن معاویہ سے ہوئی تھی
- ۱۴- شیریں شہر بانو کی کنیز جس کو آزاد کر کے عرب کے ایک رئیس سے شادی کر دی تھی
- ۱۵- حربن ریاحی یزید کی فوج کا ایک افسر جو امام حسین کی طرف چلا آیا تھا اور ان کی حمایت میں جنگ کی اور شہید ہوئے۔
- ۱۶- مسلم بن عقیل امام حسین کے چچا زاد بھائی اور سفیر جن کو کوفہ کے حاکم ابن زیاد نے سفاکی سے قتل کر ڈالا تھا
- ۱۷- حبیب بن مظاہر امام حسین کے بوڑھے ساتھی، دوست، رفیق، جانثار، امام حسین کی نصرت اور فتح مندی کے لئے جنگ کی اور شہادت پائی۔
- دشمن کی فوج کے بعض مشہور افراد:
- یزید بن معاویہ خلیفہ وقت بننے کا دعویدار جس کے حکم سے امام حسین کو شہید کر ڈالا گیا

عبداللہ بن زیاد کوفہ کا ظالم حاکم جو ان فوجوں کا سپہ سالار تھا جو کربلا میں امام حسین سے لڑنے آئی تھی

عمر بن سعد کربلا میں یزیدی فوجوں کا سردار و سپہ سالار
شمر بن ذی الجوشن امام حسین کا سفاک قاتل جس نے آپ کا سر اقدس تن سے جدا کر دیا
حرملہ بن کاہل اس کے سہ پہلو تیر سے امام حسین کا ننھا بچہ علی اصغر شہید ہوا
سنان بن انس اس کی برچھی علی اکبر کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی جس سے انھوں نے شہادت پائی

ازرق شامی شام کا مشہور بہادر پہلوان جس سے قاسم بن حسن نے جنگ کی اور قاسم نے اس کو اور اس کے چار بیٹوں کو قتل کر دیا۔
خولی یزیدی فوج کا ایک شقیق القلب افسر جس کی تحویل میں امام حسین کا سر دیا گیا

خولی کی دو بیویاں ان دونوں نے اپنے شوہر کے پاس سر حسین دیکھ کر سخت احتجاج کیا اسے لعنت و ملامت کی ایک نے جان دی اور دوسری جنگل نکل گئی۔ (۵)
کربلا کے اس عظیم المیہ اور ہولناک واقعہ کے ان اہم کرداروں سے ذرا واقفیت کے بعد مرثیہ کے کرداروں کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

مذکورہ بالا کرداروں کے پیش نظر نتیجہ نکلتا ہے کہ مرثیہ میں دو اقسام کے کردار ہیں:

- ۱- ایک وہ جو صالح، حق پرست، دین اسلام کے نام پر مر مٹنے اور جاں نثار کرنے والے افراد ہیں
- ۲- دوسرا وہ جو دین اسلام سے مبرا، ظالم جفاکش، اور انتہائی سفاک افراد ہیں اس لئے ان دو گانہ افراد کے جدا گانہ کرداروں کی امتیازی خصوصیات اور ان کے اوصاف و کمالات واضح کرنا لازمی ہو جاتا ہے کیونکہ کردار نگاری اس وقت تک مکمل نہیں جب تک کہ ان دونوں کرداروں کے امتیازی اوصاف

وکالات کو کامیابی و دیانت داری کے ساتھ قارئین کے روبرو نہ کیا جائے۔

اس دوران یہ عرض کرتی چلوں کہ جہاں مرثیہ کے کرداروں میں مرثیہ کے حق پرست کردار کا بیان ہے وہیں مرثیہ نگار کی اپنی مذہبی عقیدت و عظمت بھی شامل ہے چونکہ ہر دین و مذہب میں اپنے اسلاف اور بزرگان دین سے ایک خاص قسم کا لگاؤ احترام و اکرام ہوتا ہے اس لئے یہ احترام و اکرام اور مذہبی عقیدت و محبت جب کسی شاعر کے ذہنی افتاد کے ساتھ ملتا ہے تو ایسے موقع پر شاعر اپنی عقیدت و محبت کا ذکر خوب تر کرتا ہے خواہ میر انیس (۶) ہوں یا دبیر ہر کسی کے یہاں ایسی عقیدت و محبت نظر آتی ہے اس سلسلے میں ایسے صدیقی لکھتے ہیں کہ۔

اردو مرثیوں میں کرداروں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک زبردست ذہنی کشمکش سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے اس کشمکش کا سامنا ہر اس ادب میں ہو سکتا ہے جس کی تخلیق مذہبی عقائد کے پیش نظر کی گئی ہو ہر قوم میں پیشوایان دین کا ایک مخصوص تصور ہوتا ہے یہ تصور ان شخصیتوں کو دنیا کے دوسرے افراد سے ممتاز اور معلیٰ کرتا ہے ادب میں ان شخصیتوں کو پیش کرنا بھی اسی تصور کا اظہار ہوتا ہے اسی لئے ادب جب ان کرداروں کو پیش کرتا ہے تو اپنی عقیدت میں وہ دنیا کی سب سے بڑی صداقت کو پیش کر رہا ہوتا ہے لیکن عملاً وہ ایک ایسی صداقت کو پیش کرتا ہے جو مذہب کی تبدیلی کے ساتھ خود بھی تبدیل ہو جاتی ہے نتیجہ میں وہ صداقت عامہ جو کردار نگاری کی خصوصیات ہونی چاہیے ان کرداروں سے نہیں جھلک پاتیں۔ (۷)

صدیقی صاحب کے نقطہ نظر سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مرثیہ نگار مرثیہ کے کرداروں کے ذریعہ اپنی مذہبی عقیدت (خواہ وہ سنی ہو یا شیعہ) کو پیش نظر رکھ کر مرثیہ گوئی کرتا ہے شاعر اپنی مذہبی مکتب فکر کو سامنے رکھ کر ایسی صداقت کو پیش کرتا ہے جو تبدیلی مذہب کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ یہ نہیں جان پاتا کہ کرداروں کی جو اصل خصوصیت ہے وہ کرداروں کے ذریعہ عوام الناس کے سامنے آئیں یا نہیں۔ اس لئے مرثیہ گو شاعر کو چاہیے کہ وہ مذہبی عقیدت و محبت کیساتھ ایسی تکنیک اور پیرایہ سے کام لے جو کردار نگاری اور سیرت نگاری کے لئے لازمی جز ہے۔

در اصل اہل بیت رسول کیلئے ہر مومن کے دل میں قابل قدر عزت و احترام اور ستائشی جذبات کا ہونا لازمی ہے اور انہیں والہانہ جذبات کا تعلق حیات میں مدح سرائی سے ہوتا ہے جہاں پر مبالغہ جائز ہوتا ہے مگر اردو ادب کے نقادوں کی رائے ہے کہ خواہ نثر ہو یا نظم مبالغہ حدود میں ہونا چاہیے اس لئے شاعر و نثر نگار کے نزدیک یہ بات ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ جن جذبات و کردار کو مدح کے ذریعہ پیش کر رہے ہیں وہی جذبات و کردار مرثیہ کا بھی روپ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے شاعر جب بھی کسی شخص کا بیان مرثیہ میں کرے اس طرح کرے کہ اس کی جملہ امتیازی خصوصیات واضح ہو جائیں مثلاً بچہ کا بیان اس طرح کرے کہ اس کی طفلانہ تمام حرکتیں اور شرارتیں سامنے آ جائیں ایک بہادر کا ذکر ہو تو سخت سے سخت مشکل رونما ہونے پر بھی پائے استقلال میں لرزش نہ آئے اور اس کی بہادری اور دلیری کے جوہر خوب سے خوب تر نظر آئیں جب کسی شریف النفس صفت انسان کا بیان ہو تو اس کی جملہ شرافت کی علامات ظاہر ہوں۔ بقول ایس اے صدیقی ”یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر شخص کا کردار اس کی عمر، مرتبہ اور ماحول کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے اس اختلاف کو ملحوظ رکھنا کردار نگاری کے شرائط میں داخل ہے تاکہ ان کی پہچان نہ بگڑنے پائے اس لئے کہ جہاں پہچان ختم ہو جاتی ہے کردار خود بھی ختم ہو جاتا ہے یا پہچان نامکمل رہتی ہے تو کردار بھی نامکمل رہتا ہے۔“

۷۸-۱

صدیقی صاحب کے قول کے بموجب شخصی مراتب کے اختلاف کو ملحوظ خاطر رکھنا کردار نگاری کے لئے ضروری ہے اور اس سے متعلق جملہ شرائط کو سمجھنا کردار نگاری کی بنیادی شرط ہے لہذا شاعر کو چاہیے کہ ان شرائط کو ملحوظ رکھے ورنہ مرثیہ کے کرداروں میں وہ باریکی پیدا نہیں کر سکے گا جو کردار نگاری کے لئے اشد ضروری ہیں۔

اردو میں ایک کامیاب اور بلند پایہ مرثیہ کا امتیازی عنصر یہی تصور کیا جاتا ہے کہ مرثیہ نگار اپنی گہری عقیدت و عظمت کے ساتھ کردار نگاری کے جملہ تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے یعنی ایک طرف تو وہ اپنے کرداروں کے ذریعہ بشری صفات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس میں مکمل طور پر بشری صفات نمایاں

ہو جائیں اور دوسری طرف وہ یہ بھی کوشش دے دے کہ کردار کے تئیں اس کے دل میں جو عورت کے لئے احترام ہے اس پر ذرہ برابر بھی حرف نہ آنے پائے۔

مراثی میں جن معزز با عظمت اور معتبر اشخاص کا ذکر کیا جاتا ہے ان میں بعض شخصیتوں کے کارناموں کے بیان کو کربلا کے المناک واقعہ میں ایک خاص اہمیت و مرتبت حاصل ہے مختلف مرثیہ نگار نے ان مایہ ناز شخصیتوں کے بلند پایہ کارناموں اور ان کے اعلیٰ کرداروں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے مثلاً امام حسین علیہ السلام کے کردار کو پیش کرنے میں مرثیہ نگاروں نے اپنی جدت بیانی اور کمال فن کو بخوبی اجاگر کیا ہے ان کے تمام تر اوصاف و کمالات کو شعری پیرایہ میں اس طرح سمو دیا کہ حضرت امام حسین کی شخصیت جس طرح دنیا و تاریخ میں عظیم و بے مثال سمجھی جاتی تھی شاعری کی دنیا میں بھی بے نظیر شخصیت بن گئی۔ امام حسین کے کردار سے متعلق ڈاکٹر جعفر رضا لکھتے ہیں کہ۔

امام حسین کا کردار معرکہ کربلا میں ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے اور مراثی میں پیش ہونے والے تمام واقعات ان ہی کے گرد و پیش گردش کرتے ہیں امام حسین کو مذہبی عقیدت اور احترام کی وہ ساری بلندیاں حاصل ہیں جو کسی بھی مذہبی رہنما کے لئے مخصوص ہوتی ہیں وہ امام زمانہ ہیں اور سب پر ان کی اطاعت فرض ہے بہت بڑے عابد و زاہد اور اپنے دور کے بہت نمایاں انسان ہیں ان کو نسبی طور پر بھی مراتب حاصل ہیں ان کے باپ حضرت علی اسلامی تاریخ کی مقتدر ترین ہستیوں میں سے ہیں انکی والدہ رسول اسلام کی جگر گوشہ ہیں امام حسین خود بھی اپنے نانا کے سب سے زیادہ محبوب اور پیارے نواسے ہیں۔ (۹)

ڈاکٹر جعفر رضا کے قول کے بموجب گویا کہ حضرت امام حسین کا کردار مرثیہ میں سب سے اہم اور مایہ ناز کردار ہے یہی وجہ ہے کہ مرثیہ نگاران نے موصوف کے کردار کی اتنی خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ منظر کشی کی ہے کہ موصوف کا کردار ایک مثالی اور ابدی کردار بن کر ابھرتا ہے پھر بھی مرثیہ میں کردار نگاری کی جو مثالیں اور نظیریں ہمیں ملتی ہیں ان میں امام حسین کا کردار مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی جذباتی کشش، نفسیاتی کیفیات، اس کا انداز گفتگو، رکھ رکھاؤ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس جیسے کردار کا ہونا

چاہیے۔ اس طرح ہر کردار کی اپنی انفرادیت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے اگر قارئین کے پیش نظر واقعہ کربلا کا دسوز منظر ہو تو بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرثیہ نگاران نے امام حسین کے کردار کو بیان کرنے میں اعلیٰ جوہر پیش کئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ امام حسین کا ایثار و قربانی کا جذبہ ہمدردی اور خلوص و محبت سے لبریز اعلیٰ مزاج دشمنوں کو بھی ان کی عظمت کا احساس کرا دیتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ جب اپنے تمام عزیز واقارب دوست و احباب وغیرہ کی قربانیاں پیش کر چکے تو آپ اپنے کورضائے الہی اور قضاء الہی کے سپرد کر کے اور عزیز واقارب سے رخصت ہو کر میدان کربلا میں تشریف لائے تو دیر نے ان کیفیات کو اور ان کے کردار کی خوبیوں کو انہیں کے الفاظ میں یوں بیان فرمایا۔ ع

فرمایا یادگار سپاہ قلیل ہوں پیش خدا عزیز ہوں تم میں ذلیل ہوں
صندوق اسم اعظم رب جلیل ہوں شہزادہ ملائک و جبرائیل ہوں
حسن البلاد ہے وطن اپنا حبان میں
آیا صحیفہ حق کا ہماری زبان میں
میں ہوں ملکین دوش نبی برمکال کا فخر شیر خدا کالال ہوں نوشیر و اں کا فخر
کوثر کی آبرو ہوں اور اہل جنات کا فخر کعبے کا نور، عرش کا اوج، آسماں کا فخر
نام و نسب سے قدر عجم و عرب کی ہے
رونق ہماری ذات سے نام و نسب کی ہے
پسپا ہوئے عجم میں عرب جا کے چند بار جب ہم گئے تو فتح ہوئی صاف آشکار
چلتے ہیں مثل راہ کئی فوج نابکار دونوں قدم جہاد میں اپنے ہیں ذولفقار
بنیاد ہم نے شہروں میں ڈالی ہے دین کی
نقش قدم ہمارا سپر ہے زمین کی

پیرو ہمارے نانا کا جو روزیہ ہوا ایمان روزیہ کا ہر ایک روزیہ ہوا
 ذرے سے آفتاب ہوا کہہ سے منہ ہوا خدمت میں رفتہ رفتہ شرف اسی کا یہ ہوا
 ہم رنگ آل سے ہے نبی کی جناب میں
 من اہل بیتی آیا ہے سلمان کے باب میں

(۱۰)

پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب لکھتے ہیں کہ:

”سیرت نگاری تو انیس سے پہلے گویا اردو میں تھی ہی نہیں بعض قصوں اور مثنویوں میں اشخاص کی سیرت ایک حد تک متعین کر کے دکھائی گئی ہے لیکن سیرت نگاری کا وہ کمال جو انیس کے یہاں ہے اس کا ایک شاہد بھی میر حسن کے سوا شاید ان کے کسی پیش رو کے یہاں نہیں ملتا۔ انیس کے مرثیوں میں جن لوگوں کا ذکر آتا ہے ان میں سے بعض کے کارناموں کو واقعہ کر بلا میں خاص اہمیت حاصل ہے ان لوگوں کی سیرتیں انیس نے تفصیل کے ساتھ دکھائی ہیں اور ان کے مخصوص امتیازات اور خاص خصوصیات ہر جگہ اور ہر حالت میں نمایاں رکھے ہیں باقی لوگ جن کے کردار کو واقعہ کر بلا میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے ان میں انیس نے تمام انسانی خوبیاں حد کمال تک دکھائی ہیں۔ (۱۱)

آگے فرماتے ہیں کہ:

امام حسین کی سیرت دکھانے میں انیس نے بالخصوص بڑا کمال کیا ہے اور ملکیت اور بشریت کو کچھ اس تناسب سے سمودیا ہے کہ وہ مقدس سیرت جس طرح دنیا کی تاریخ میں عدیم المثل تھی اسی طرح اردو شاعری کی دنیا میں بھی بے نظیر ہو گئی۔ ۱۲

ڈاکٹر صالحہ عابد حسین رقم طراز ہیں کہ:

انیس جس فرد کی سیرت دکھاتے ہیں اس کی شخصیت اور درجے کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں اس کی جذباتی کشمکش، نفسیاتی کیفیت، اس کا بات چیت کا انداز رکھ رکھاؤ ٹھیک ویسا ہی ہوتا ہے جیسا اس جیسے

کردار کا ہونا چاہیے اور اس طرح ہر کردار کی انفرادیت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے وہ کردار حسین کا ہو یا حضرت زینب کا، عباس کا ہو یا علی اکبر کا، عون و محمد کا ہو یا شہر بانو اور زوجہ عباس کا یا صفراءِ سکینہ کا ہو، ہر فرد اپنی بات چیت اور احساسات و ذہنی کیفیت بغیر نام کے بھی پہچانا جاسکتا ہے ۱۳ آگے فرماتی ہیں کہ:

یوں تو انیس نے ہر کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے مگر بزرگ ہستیوں میں زینب اور حسین جوانوں میں علی اکبر اور عباس اور نو عمروں میں عون و محمد اور فاطمہ صفراء کی کردار نگاری میں تو قلم توڑ دیا ہے خاص طور پر امام حسین اور زینبؑ کی کردار نگاری میں جو باریکیاں، جو نازک جذبات، احساسات کی جو شدت اور گہرائی دکھائی ہے اس کا جواب تو خود انیس کی شاعری میں بھی ملنا محال ہے کسی اور کا تو ذکر ہی کیا (۱۴)

میر انیس نے حضرت امام حسینؑ کے بلند پایہ کردار کو اپنے مرثیہ ”امام حسین کا جہاد“ کے بند نمبر ۸۱ میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

نعرہ یہ تھا کہ ہمیں پشت و پناہ دیں نور خدا، سراج ہدی، بادشاہ دیں
روشن ہمارے نور سے ہے شاہ راہ دین دنیا میں ہم ہیں تاج سر عز و جاہ و دیں
سجدہ بتوں کے کرتے تھے ساکن کنشت کے

ہم نے تمہیں بتا دئے رستے بہشت کے

سب جانتے ہیں دلبر مشکل کشا ہوں میں جو ہر کشائے تیغ شہ لافنا ہوں میں
شمس الضحیٰ علی ہیں تو بدر الدجی ہوں میں قرآن گواہ ہے کہ زبان خدا ہوں میں
کس آیہ کریم میں ذکر علی نہیں؟
قرآن میں کیا خفی ہے جو ہم پہ جلی نہیں

بخشا ہے مجھ کو حق نے شہ لافنا کا زور اس دست مرعش میں ہے دست خدا کا زور
 ہے انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور
 الٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا
 جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا ۱۵

بندوں میں میرا نیس نے حضرت امام حسینؑ کی مدح و منقبت اس انداز میں بیان کی ہے کہ ان
 کے کردار کو ایک خوبصورت و حسین مجسم شکل دیدی جو مذہبی جذبہ و عقیدت کے کام تو آ سکتا ہے لیکن کسی
 تنقیدی نقطہ نظر کا محمل نہیں ہو سکتا کیونکہ جو کردار ارتقاء پذیر ہوتے ہیں وہ زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں اور جو
 کردار مکمل ہوں وہ جامد ہوتے ہیں عام طور پر انکا تعلق عام انسانی قدروں سے نہیں ہوتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ کی قربانی اسلامی تاریخ میں ایک ایسی نظیر ہے جس کی ادنیٰ سی مثال رہتی دنیا
 تک کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ اپنا گھربار، عزیز و اقارب، دوست و احباب کو راہ خدا میں قربان کر دینا اور کسی
 مقام پر پائے استقامت میں لرز اور کسی قسم کی لغزش پیدا نہ ہونا بلکہ ہر مقام پر خدائے الہی کا شکر بجالانا یہ
 ایسے اوصاف ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کی ادنیٰ سی مثال کہ جب امام حسینؑ علی اصغرؑ کو دشمن کی فوج کے
 سامنے پانی کے سوال کی غرض سے پیش کرتے ہیں جو پیاس کی شدت سے تڑپ رہا ہے اس موقع پر میر
 انیس نے امام حسین کے کردار اور ان کے اوصاف و کیفیات کو ایسے جذباتی اور نفسیاتی انداز میں بیان کیا
 ہے کہ سننے والوں کے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ بقول میرا نیس

ع پیہم پکا رتے تھے شہ آ سماں جناب مسلم ہو تم تو روح نبی سے کرو حجاب
 منہ پھیرتے سب، کوئی دیتا نہ تھا جواب نکلا پرے سے حرمہ خانما خراب
 جلدی کماں میں جوڑ کے سرکش نے تیر کو
 تا کا نگاہ قہر سے حلق صغیر کو

کتنا بچا یا شہ نے اجل سے نہ بس چلا کڑ کی ادھر کمان ، ادھر چھد گیا گلا
 آنسو بھر آئے آنکھوں میں منکا جو نہی ڈھلا آنکھوں سے شہ نے آنکھیں ملیں منہ سے منہ ملا
 جو حسرتیں تھیں دل میں قضا نے نکال دیں
 ننھی سی باہیں باپ کی گردن میں ڈال دیں
 (۱۶)

مذکورہ بند کے ذریعہ حضرت امام حسینؑ کی نفسیاتی کیفیت ان کی بے بسی و لا چاری اور ان کے صبر کا صرف اندازہ لگایا جاسکتا ہے الفاظ کا جامہ پہنایا نہیں جاسکتا خصوصاً یہ مصرع آنکھوں سے آنکھیں ملیں منہ سے منہ ملا یہ بلاغت کی اعلیٰ مثال ہے جسے میر انیس نے مرثیہ کے رنگ و روپ میں ایک مظلوم انسان کی لا چارگی کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ اعلیٰ قدروں کی جانب بھی رہنمائی کی اور ساتھ ہی ایک اعلیٰ صابر و شاکر انسان کی تصویر کشی کی۔

امام حسین کے کردار کی مزید ایک خوبی جس کو اکثر مرثیہ نگاران نے بیان کیا ہے وہ امام حسین کے کردار میں شجاعت و بہادری کی مثالیں ہیں۔ حضرت امام حسین کا شمار اپنے وقت کے جری شجاع اور بہادر لوگوں میں ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ آپ نے یزیدی حکومت کی تنہا مخالفت کر کے لازوال شجاعت و بہادری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا مرثیہ نگاروں نے عموماً ان کی اس اعلیٰ خوبی کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔
 بقول دبیر:

آیا جلال میں اسدا شمع جہاں فاقے میں زور دلبر حیدر ہوا عیاں
 یوں اس کے تن میں وپکیر ہوئی نہاں جس طرح در میں فاتح خیبر کی انگلیاں
 دور ہو گیا ہو دشمن دیں ذوالفقار سے
 گرنے لگا تو چار کیا ایک وار سے

چلایا ابن سعد تمہیں ہے خیال کیا ایک ایک بڑے حسین سے توبہ مجال کیا

ان کے حضور تیغ زنوں کا کمال کیا اسفند یار و ہمن و سراب و زوال کیا

مل کر لڑو و گر نہ ہزیمت ہے صاحبو

اس پر بھی فتح ہو تو غنیمت ہے صاحبو

پھر تو بڑھے جنود و قشوں سب لئے جدال جو لا ہوئے سمند، اڑا عرصہ قتال

چمکی نکل کے گرد سے وہ تیغ خوش جمال جیسے فلک پہ ابر سے ہٹ جانے سے ہلال

روشن یہ ماہ نو کر دشت معاف تھا

رویت کی وجہ یہ تھی کہ مطلع بھی صاف تھا

حملہ کیا امام سلیمان و قار نے یا مرسل اکبر یاح کسادا ہوار نے

خیبر شکن کو یاد کیا ذوالفقار نے دیکھا صفوں کو ہیت پروردگار نے

آوردہ گار دیکھ کے آمد رواں ہوئی

دن کی زمیں دہل کے اٹھی آسمان ہوئی

(۱۷)

مذکورہ بند کے ذریعہ دبیر نے امام حسین کی شجاعت کو تمام تر فاقہ کشی اور مصیبتوں کے باوجود ایسے

پیرائے میں بیان کیا ہے جہاں صبر و شکر کے ساتھ استقلال پایا جاتا ہے۔

امام حسینؑ کے کردار کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کا عزم و استقلال، حق پرستی اور حق شناسی

ہے جنگ کے دوران حضرت امام حسینؑ حق کی راہ میں باطل سے ٹکر لیتے ہوئے خود کو رضائے الہی کے

سپرد کر دیتے ہیں اور جام شہادت نوش فرماتے ہیں ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ اس مرحلے پر میرا نیس نے

امام حسین کا کردار اس انداز میں پیش کیا ہے۔

بقول میر انیس

آئی نداء غیب کہ شبیر مرحبا اس ہاتھ کے لئے تھی شمشیر مرحبا
یہ آبرو یہ جنگ یہ توقیر مرحبا دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر مرحبا
غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر

بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر
بس اب نہ کر دعا کہ ہوں اے حسین بس دم لے ہوا میں چند نفس اے حسین بس
گرمی سے ہانپتا فرس اے حسین بس وقت نماز عصر ہے بس اے حسین بس
پیاسے لڑا نہیں کوئی یوں ازدحام میں

اب اہتمام چاہیے امت کے کام میں
لبیک کہہ کے تیغ رکھی شہ نے میان میں پلٹی سپاہ آئی قیامت جہاں میں
پھر سرکشوں نے تیر ملائے کمان میں پھر کھل گئے لپٹ کے پھر ہرے نشان میں
بے کس امام ظلم شعاروں میں گھر گئے
تنہا حسین لاکھ سواروں میں گھر گئے

(۱۸)

پھر اگلے بند میں مزید لکھتے ہیں کہ:
گرتے ہیں اب حسین فرس پر سے ہے غضب چھٹی لجام دست مطہر سے، ہے غضب
پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب گردن ڈھلی، عمامہ گراسر سے ہے غضب
قرآں رحل زریں سے سرفرش گر پڑا
دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

(۱۹)

مذکورہ بندوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے آخری وقت تک صبر کا دامن چاک

ہونے نہ دیا اور ہر مقام پر خدا کا شکر ادا کیا۔ انیس نے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ مذکورہ بند میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر امام حسینؑ لڑنا چاہتے تو دشمنوں کے ساتھ اس انداز میں لڑتے کہ دشمن خود بخود میدان چھوڑ کر جائے فرار اختیار کرتے۔ مگر چونکہ امام حسینؑ جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے اسلئے بقول انیس ”بلیک کہہ کر تیغ رکھی شہ نے میان میں“ کے ذریعہ ان کے اس کردار کو اجاگر کر دیا اور قیامت تک آنے والے افراد کو یہ پیغام دیا کہ اگر امام حسینؑ چاہتے تو جنگ کر سکتے تھے لیکن خدا کو تو ان کے صبر کا امتحان لینا اور ایک صابر و شاکر اور حق پرست انسان کے کردار میں امام حسینؑ کو پیش کر کے عوام الناس کے دلوں میں ان کے کردار کی بلندی کا سکھ بٹھا دینا تھا۔ اس سے یہ مطلب نہ اخذ کر لیا جائے کہ نعوذ باللہ حضرت امام حسینؑ کسی بھی طرح کی ہمدردی، نرمی و رحم یا کسی قسم کی مراعات کے طلب گار تھے بلکہ وہ یہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ کسی مسلمان کے خون سے اپنا ہاتھ دھوئیں یا انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ میرا انیس کے کارنامے میں اصلی شخصیت اور سب سے زیادہ بلند مرتبت اور قابل قدر ہستی حضرت امام حسینؑ کی ہے میرا انیس نے اپنے مرثیوں میں جا بجا آپؑ کا سراپا پیش کیا ہے۔ انیس کے کلام میں آپؑ کی سیرت کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے دماغ میں ایک ایسی معتبر ہستی و مقدس شخصیت کا تصور قائم ہو جاتا ہے جو بچپن ہی سے نیک صورت اور نیک سیرت ہے جس کے اہل و عیال دین و دنیا دونوں جگہ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جس کے خاندان میں مذہبی عظمت و بلندی کے سوا دنیاوی امانت بھی موجود ہے جس کا بچپن محبت اور صداقت، و شرافت کے گہواروں میں بسر ہوا ہے جس کی جوانی اعلائے کلمۃ اللہ کی تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ کے دلچسپ بازی گاہوں میں شہسوارانہ کرتب دکھاتے ہوئے گزری ہے اور جس نے اپنی عمر کا آخری حصہ اپنے خاندانوں، عزیز و اقارب، دوست و احباب اور اصحاب کی لاج رکھنے، اپنے نانا کی امت کی دلجوئی، تعلیم و اصلاح، فلاح و بہبود کے خیال سے اور اپنے والد محترم کے ساتھیوں کی امداد کے لئے سخت جفاکشی میں گزار دیا۔ پایان کار صرف

صداقت کی خاطر اس وقت جب کہ دنیا میں کوئی اس کا یار و مددگار، مونس و غم خوار نہ تھا، اس موقع پر جب کہ بڑے بڑے رستم دل سوراووں کے پاؤں ڈگمگاتے ہیں سخت سے سخت تکلیفیں اٹھاتے ہوئے اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔

میر انیس نے اپنے مرثیہ اول میں آپ کا سراپا اس طرح بیان کیا کہ آپ کا چہرہ آفتاب سے زیادہ روشن و تابناک تھا آپ کے گیسوئے مبارک نہایت کالے اور لمبے تھے ان گیسوؤں میں چہرہ مبارک ایسا نظر آتا تھا جیسا کہ ہالے میں چاند دکھائی دیتا ہے آپ کے ابرو ماہ نو سے زیادہ خوبصورت تھے آنکھیں ہرن کی آنکھوں کو شرمندہ کرتی تھیں ڈاڑھی پر خضاب لگایا کرتے تھے آپ رسول پاک کے سب سے زیادہ مشابہ تھے جب آپ جنگ کے لئے کھڑے رہتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔

”گویا کھڑے ہیں جنگ کو محبوب کردگار اور آپ کے رخ سے دبدبہ شاہ ذوالفقار“

عیاں رہتا تھا (۱)

چونکہ آپ بچپن سے نہایت بااخلاق اور دین دار واقع ہوئے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ جب آپ مدینہ سے کربلا کے لئے نکلتے ہیں تو تمام باشندگان شہر افسر و مغوم ہو جاتے ہیں اور چلاتے ہیں کہ خلق کا مخدوم چلا جا رہا ہے رانڈیاں پکارتی ہیں کہ شاہ کی سواری تو جا رہی ہے اب مصیبتوں میں ہماری خبر کون لے گا۔ یتیم رو رہے ہیں اپنا بچ مضطر ہیں ضعفاء آہ وزاری کرتے ہیں، فقیر کہتے ہیں کہ اب ہم کو غنی کون کرے گا تمام شہر والے بہت دور تک آپ کو چھوڑنے کے لئے آپ کے ساتھ آتے ہیں اس وقت امام حسین انجام کار سے واقف ہیں لیکن دعوت قبول نہ کرنا انسانیت کی خلاف سمجھتے ہیں آپ کو معلوم ہے کہ کوئی دکھو کے باز اور بے وفا ہیں لیکن اس وقت ان کو صدائے احتجاج پر لبیک کہنا اپنا اسلامی فرض خیال کر کے اپنے عیش و آرام اور عافیت و اطمینان پر ٹھوکر مار کر ان کی مدد کے لئے اپنے پیارے وطن کو الوداع کہتے ہیں۔

جب آپ مکہ پہنچتے ہیں تو وہاں بھی آپ کی عزت و احترام خاص طور پر کی جاتی ہے وہاں حضرت

علیؑ کے جتنے دوست تھے وہ سب کہتے ہیں کہ نبی کے نواسے میں سب باپ کی خوبیاں ہے کعبہ میں آپ ایک دن بھی آرام لینے نہیں پاتے کیونکہ دن رات خطوط چلے آتے ہیں چنانچہ آپ احرام باندھ کر کھول دیتے ہیں اور آٹھ ذی الحجہ کو کعبہ سے کوفہ کی جانب رخ کرتے ہیں (۲)

ابھی کوفہ پہنچنے نہیں پاتے ہیں کہ ایک شخص ناقہ پر آتا ہوا دکھائی دیتا ہے امام حسین حضرت عباس سے فرماتے ہیں کہ بھائی جان تم جا کر اس عرب کو میرے پاس لاؤ کہ حسین غریب کو اس سے کچھ پوچھنا ہے، چنانچہ حضرت عباس اس مسافر کو لے آتے ہیں اور امام حسین اس کو کنارے لے جا کر فرماتے ہیں۔ آتا ہوا کدھر سے ارادہ کدھر کا ہے گر نیک ہو سفر تو وسیلہ ظفر کا ہے اور جب اس نے عرض کیا کہ میں کوفہ کے شہر سوم سے آیا ہوں تو اس سے آپ نے مسلم کی خبر دریافت کی، یہ سنتے ہی وہ رونے لگا۔

شہ بولے وجہ کیا جو تیرا حال غیر ہے جلدی بتا کہ میرے مسافر کی خیر ہے
آخر کار حضرت مسلم کی شہادت کی خبر اور کوفیوں کی بے وفائی کا حال بیان کر کے وہ عرب کہنے لگا۔
ہاتھوں کو جوڑتا ہوں میں شاہانہ جائیے بہر علی و احمد زہرا نہ جائیے
اس جا دعا ہے سید اعلیٰ نہ جائیے آقا نہ جائیے میرے مولا نہ جائیے
جب شاہ نے عرب سے سارا معاملہ سنا تو فرمایا کہ

جو مسلم غریب پہ ہونا تھا ہو چکا باقی ہے کچھ جو ظلم وہ اب ہم پہ ہو یگا
بندوں کا اختیار ہے کیا، جو رضائے رب دونوں یتیم بھی نہ بچے اس کے ہے غضب
اور وہ عرب جب آپ کو اس سمت جانے سے منع کرتا ہے تو گویا آپ واپس ہو سکتے تھے لیکن آپ کی صداقت و اخوت و حمیت نے ہر گز یہ گوارہ نہ کیا کہ آپ واپسی کا خیال کر سکتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔
منہ کو سنان و تیغ سے موڑا نہ جائے گا مجھ سے خدا کی راہ کو چھوڑا نہ جائیگا (۳)

غرض آپ کر بلا کے میدان میں پہنچ کر قیام فرماتے ہیں جب اعداء دریا کے کنارے مقام کرنے سے روکتے ہیں تو حضرت امام حسین کو برا معلوم ہوتا ہے آواز دیتے ہیں اور پھر کس خوبی سے نصیحت فرماتے ہیں۔

بھیا ہمارے سر کی قسم ہے یہ تلوار بازیاں روک لو، خشک وتر ہماری نگاہ میں یکساں ہے راہ حق میں غیظ و غضب کو دخل مت دو گرچہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے اور یہ بے شعور نا سمجھ ناحق تم سے فتنہ و فساد کرتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں جانے دو، جاہلوں سے تکرار کیا ضروری ہے اور ان سے معمولی سی معمولی باتوں پر بحث کرنا فضول ہے عالی مقام اشخاص کے لئے خاموشی ہی ان کے کلام کا جواب ہے اگرچہ ان کی بے ادبی شرارت و خباثت قابل سزا ہے لیکن تم تو رحیم باپ کے پسر ہو ان کی خطا بخش دو خواہ جنگل ہو یا ترائی ہر جگہ خدا ہے جو مظلوم و غریب ہیں ان کو غصہ سے کیا کام، عاجزی وہی کرتا ہے جو حق شناس اور حق کا طلبگار ہے یہ تو نانا کی امت ہے لہذا ان پر رحم لازم ہے کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بیٹوں کی طرح پیار کرتے تھے۔

کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے اس آخری شعر کے ذریعہ میر انیس نے حضرت امام حسینؑ کی عالی شان سیرت و کردار کی ایک جھلک دکھلائی ہے جب حضرت امام حسین دیکھتے ہیں کہ شام کی فوج لڑنے کے لئے تیار ہو رہی ہے تو پہلے طریقے پر انھیں سمجھاتے ہیں۔

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو	تیر جوڑے ہیں تم نے تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادے پہ غربت میں جفا کرتے ہو	دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم برا کرتے ہو
یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار	یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو سینہ فگار
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جو ہر دار	کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پہ ہوں سوار
کس کی یہ تیغ ہے یہ تیغ دوسر کس کا ہے	کس جبری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کا ہے

اور پھر ڈراتے ہیں۔

تنگ آئے گا تو پھر رکنے کا نہیں پھر شبیر
 ایک حملہ میں فنا ہوں گے یہ دولاکھ شریر
 چل سکیں گے نہ تیر مجھ پر نہ تلوار نہ تیر
 کاٹ جائیگی سپر سب کے یہ براں شمشیر
 شیر ہوں لخت دل غالب ہر غالب ہوں
 میں جگر بند علی ابن ابی طالب ہوں
 آخر کار جب اعداء کسی طرح نہیں مانتے تو آپ مجبور ہو کر جنگ کا اعلان فرماتے ہیں اور اپنے
 ساتھیوں سمیت راہ حق میں مردانہ وار سر دیتے ہیں۔

یہ تو حضرت امام حسینؑ کی پوری زندگی اور کردار کا ایک بیرونی خاکہ ہے اس کے علاوہ میر انیس
 نے جگہ جگہ آپ کے کردار کی بعض بعض خصوصیات پر جو روشنی ڈالی ہے وہ نہایت قابل شتائش و قابل
 تعریف ہے اپنے بھائی بہن، بھتیجوں و بھانجوں کیساتھ آپ کی محبت و برتاؤ اپنے دوستوں اور معتقدوں
 کیساتھ مکمل ہمدردی، مخالفین کی خیر خواہی اور انھیں راہ راست پر لانے کی جملہ کوشش صبر و رضا اور ہمت
 و استقلال کا زبردست مظاہرہ ان تمام پہلوؤں کو اپنے مرثیہ کے ذریعہ نمایاں کر کے میر انیس نے دنیا
 والوں کے سامنے ایک ایسا عالی شان اور معظم اسوہ حسنہ پیش کیا ہے جس کا اثر قیامت تک آنے والی
 نسلوں پر پڑتا رہے گا۔

اس قسم کی ایک اور جھلک جو امام حسینؑ کے کردار کو زیادہ تفصیل سے پیش کرتی ہے وہ ایک موقع
 پر ضمنا رونما ہو گئی۔

اہل بیت نبی کر بلا کے لقا و دوق میدان میں کئی روز سے مقیم ہیں آج اس منزل کی آخری رات
 ہے کل آفتاب غروب ہونے سے پہلے پاک پنجتن کا خاتمہ ہو جائیگا حضرت امام حسینؑ باہر نماز شب میں
 مشغول ہیں اور ان کے یار و انصار جنگ کی اجازت کے متمنی کہ حرم سے رونے کی آواز آتی ہے سب
 معلوم کر کے حضرت زنان خانہ میں پہنچتے ہیں اور بہن زینب سے آہ و زاری کا سبب دریافت کرنے میں
 مشغول ہیں کہ سب سے چھوٹی صاحبزادی سیکنہ پکارتی ہیں۔

نید آتی ہے بیٹی کو سلا جائیے بابا بس ہو چکی باتیں اب ادھر آئیے بابا
 اس ایک شعر میں بلاغت کے کئی نکتے پوشیدہ ہیں اعلیٰ انشاء پرداز کا دار و مدار انتخاب مواقع پر
 ہے اور جو ادیب کسی واقعہ کو تفصیل سے پیش کرنے کے بجائے اس کا صرف اور صرف ایک ہی ایسا پہلو
 پیش کر دے جس کے دیکھتے ہی دماغی فضا اس مرقعہ سے متعلق جملہ کائنات سے موفور ہو جائے وہ ایک
 زبردست صنّاع ہے میر انیس خود تو تفصیل سے بیان نہیں کرتے کہ صاحبزادی سکیکنہ ہمیشہ امام حسین کے
 ساتھ سونے کی عادی تھیں اور بن باپ کے انہیں نیند آنا دشوار تھا بلکہ رجال داستان ہی کی زبانی اس واقعہ
 کو نہایت اختصار اور خوبی کے ساتھ پیش کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ امام حسین کی پدرانہ
 شفقت انکی گذشتہ زندگی کی حالت اور مستقبل کے متعلق نصیحت سب کچھ دکھاتے رہے ہیں چنانچہ۔

حضرت نے کہا میں تیری آواز کے قرباں
 غربت میں کہاں راحت و آرام کا سماں
 اچھی نہیں عادت یہ نہ رویا کرو بی بی
 کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں
 تم پاؤ نہ ہم کو نہ تمہیں ہم کہیں پائیں
 جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
 جب عمر تھی کم ہم بھی چھٹے تھے یوں ہی ماں سے
 کوچ ان کا ہوا سامنے آنکھوں کے جہاں سے
 یہ داغ یہ اندوہ و الم سب کے لئے ہے
 اللہ تم اب تک نہیں سوئی ہو میری جاں
 بن باپ کے تم کو نہیں چین کسی آں
 پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی
 مجبور ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کے جائیں
 بی بی کہو پھر چھاتی پہ کس طرح سلائیں
 برسوں رہے جو ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی
 سوتے تھے لپٹ کر یونہی خاتون جنان سے
 ماتم سے ملیں وہ نہ بکا سے نہ فغاں سے
 ماں باپ زمانے میں صدا کس کے جئے ہیں
 خصوصاً چھٹا شعر کے ذریعہ ایک نادان اور کم فہم لڑکی کو سمجھانے کا جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ
 نہایت قابل تعریف ہے اور سوائے ایک زبردست رموز داں فطرت کے کسی اور شاعر سے اسکا اظہار
 ناممکن ہے۔

جناب عباسؑ کا کردار

مرثیوں میں دوسرا اہم کردار حضرت عباس کا ہے۔

۱- ایک وہ کردار جو حضرت امام حسین کے سوتیلے بھائی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے

۲- دوسرا وہ کردار جو ان کی شجاعت و بہادری اور دلیری کی حیثیت سے سامنے آتا ہے

اس سلسلے میں مسعود حسن رضوی رقم طراز ہیں کہ۔

”عباس“ امام حسین کے مختلف البطن چھوٹے بھائی حسینی لشکر کے علمبردار، فنون جنگ کے زبردست

ماہر، نہایت دلیر، غصہ ور، بڑے قد آور اور بارعب جوان، وفا شعار کا مجسمہ بتیس سال کی عمر، (۲۰)

جب کہ ایسے صدیقی لکھتے ہیں کہ:

آپ حضرت علی کے فرزند تھے، اور امام حسین کے سوتیلے بھائی، آپ کی والدہ کا خطاب ام

البنین تھا۔

مرثیوں میں آپ کا کردار ایک بھائی سے زیادہ ایک وفادار اور جاٹار خادم کی حیثیت سے ابھرتا

ہے اس کردار کا دوسرا پہلو بہادری اور شجاعت ہے۔ ۲۱

صرف یہی نہیں کہ حضرت عباسؑ حضرت علی کے بیٹے تھے اور حضرت امام حسین کے سوتیلے بھائی

بلکہ عام رائے کے خلاف حضرت امام حسینؑ کو اپنے والد کی جگہ سمجھتے تھے اور ان سے حد درجہ محبت اور ان کا

بے پناہ احترام بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کربلا میں امام حسینؑ کے بچوں کو پیاس سے تڑپتا اور شدت

سے بیقرار دیکھ کر آپ نے مشک اٹھالی اور فرات کی جانب چل پڑے۔ لڑتے لڑتے دریا تک پہنچ گئے

گھاٹ پر جن یزیدی سپاہیوں کا پہرہ تھا ان کو ہٹا کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور مشک بھر لی۔ جب کہ خود بھی

دودن کے پیاسے تھے چلو میں پانی لے کر پینا چاہا لیکن یہ خیال کر کے کہ امام حسین اور ان کے بچوں کو

سیراب کرنے سے پہلے اپنی پیاس بجھا لینا وفاداری سے بعید ہے پانی پھینک دیا اور دریا سے نکل آئے

راستے میں دشمنوں نے گھیر لیا آپ بڑی دلیری سے لڑتے رہے یہاں تک کہ آپ کے دونوں بازو کوٹ

گئے اور ایک گرز کی سخت ضرب لگنے سے آپ شہید ہو گئے۔ یہ حضرت امام حسین اور اہل بیت سے انتہائی درجہ کا عشق و محبت کی اعلیٰ مثال ہے۔

گویا کہ مرثیہ نگاروں نے حضرت عباس سے متعلق کردار میں دو نمایاں خصوصیات بیان کی ہیں ایک ان کی وفاداری اور دوسری ان کی بہادری کی۔ جو عام طور پر رزمیہ شعراء کے ہیرو میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ غور کیا جائے تو حضرت عباس کا کردار ایک بھائی سے کہیں زیادہ ایک جانثار غلام کی شکل میں سامنے آتا ہے جو اپنے آقا کے لئے سب کچھ رضا و رغبت قربان کر دیتا ہے۔ مرزا دیر نے ان کے کردار کو یوں اُجاگر کیا ہے۔

افضل یہ ہنر میں ہوئے سب اہل ہنر سے جس طرح قمر تاروں سے اور شمس قمر سے
ہمت میں گراں قدر تھے یہ حسن بشر سے جس طرح گہر سنگ سے اور لعل گہر سے
یوں حسن میں برتر سے جو انان حسین سے

جس طرح بنی خلق سے اور عرش زمیں سے
یوں سنتے تھے ارشاد شہ ارض و سماں کو جس طرح جبرئیل امیں دجی خدا کو
یوں دیکھتے تھے پیار سے شاہ شہداء کو جیسے اسد اللہ رسول دوسرا کو
فاقوں میں وہ بھائی کی زیارت کا مزا تھا
جو روزے میں قرآن کی تلاوت کا مزا تھا

فرمائشیں ماں پر تھیں کہ اے پیروز ہرا یاں خدمت شبیر کے آداب ہیں کیا کیا
جا کر کسی محفل میں جو بیٹھا مرا آقا پیٹھوں میں روزا تو عقب سید والا
خدمت کو رہوں سامنے موجود کہ در پر
نعلین حضور آنکھوں پہ رکھوں کی میں سر پر“ ۲۲

مذکورہ بند کے ذریعہ مرزا دبیر نے حضرت عباسؑ کے کردار کی جملہ خوبیوں (محبت، الفت، جانبازی و جانثاری ہمت و شجاعت) کو ارتقاء کے منازل تک پہنچایا۔ بعد میں آنے والے مرثیہ نگاران نے صرف ان کی پیروی ہی کی ہے مزید اضافہ کچھ نہیں کیا اسی طرح میر انیس نے بھی حضرت عباس کے کردار کو بیان کرنے میں اپنے قلم کی جولانی دکھائی ہے۔

الٹی علی کے شیر نے بھی آستیں ادھر قبضے پہ ہاتھ ادھر گیا کانپی زمیں ادھر
ظاہر ہوا جلال جہاں آفریں ادھر آیا جلال میں اسد خشکیں ادھر

صف پر جو صف گری تو پیادہ سوار پر

گویا علی نے ہاتھ رکھا ذولفقار پر، ۲۳

مذکورہ بند میں میر انیس نے حضرت عباسؑ کے کردار میں ان صفات و کمالات کو ظاہر کیا ہے جو ان کے والد حضرت علیؑ میں تھیں گویا حضرت عباسؑ حضرت علیؑ کے بالمشابہ ہیں اور ان کی بہادری و شجاعت میں کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میر انیس نے حضرت عباسؑ کے کردار کو حبیب بن مظاہر جیسے بہادر کی زبانی امام حسینؑ کے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں قابل اسی کے دوش مبارک کے ہے نشان
بازوئے شاہ دیں جسد مرتضیٰ کی جاں ہیروں کا سر پرست جوانوں کا قدر داں

باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں ہیں

سب اس میں جمع ہیں صفتیں جو علیؑ میں ہیں

الفت وہی، حیا وہی، مہر وفا وہی طاعت وہی، وقار وہی، اتقاء وہی
بخشش وہی، کرم وہی، جود و سخا وہی جرأت وہی، جلال وہی، دبدبہ وہی

گنتی میں کوئی اور بھی ایسا دلیر ہے

خود تھا علیؑ کا قول کہ عباسؑ شیر ہے

بے مثل سب ہیں قبلہ عالم کے رشتہ دار لیکن خدا نے اس کو دیا ہے عجب وقار
جیسے نبی کی فوج میں تھے شیر کردگار ویسا ہی بے عدیل ہے یہ شبہ کا جانثار
سب فوج سے بڑھا ہوا رتبہ اسی کا ہے

شیر خدا کے بعد یہ حصہ اسی کا ہے،، ۲۴

مذکورہ بند کے ذریعہ میر انیس نے حضرت عباسؓ میں وہ تمام خوبیاں اور صفات و کمالات بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو حضرت علیؓ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

صرف بہادری و شجاعت ہی نہیں بلکہ الفت، شرم و حیا، مہر و وفا، بخشش و کرم، جود و سخا، جرأت و ہمت، جلال و رعب، دبدبہ و انقاء کے ذریعہ میر انیس نے جناب عباس کے کردار کو ایک اعلیٰ مقام و مرتبت عطا کیا کیونکہ حسینی فوج میں حضرت عباس جیسا دلیر و جری شخص کوئی دوسرا نظر نہیں آتا ہے۔

مرثیوں میں حضرت عباسؓ کا حقیقی اور یقینی کردار بھی یہی ہے۔ امام حسینؓ کی اقامت، الفت و محبت، جانثاری و جانبازی جو اس کردار کا اہم ترین پہلو ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے میر انیس نے امام حسینؓ کی زبانی یوں ادا کیا ہے۔

مشہور کائنات میں ہے بھائیوں کا پیار بچپن سے میں ہوں اس پہ فدا مجھ پہ یہ نثار
پہلو میں دل نہ ہو تو جگر کو کہاں قرار مجھ سے جدا ہوا نہیں دم بھر یہ نامدار
جب سے خدا کے شیر نے چھوڑا جہاں کو پالا ہے میں نے گود میں اس نو جوان کو
بازو یہی ہے ہاتھ یہی، تن کی جاں یہی قوت یہی، عصا یہی، تاب و تواں یہی
بھائی یہی، پیر یہی راحت رساں یہی خادم یہی، شفیق یہی، مہر باں یہی

پانی پلائے جب یہ بہشتی تو پیتے ہیں

ہم تو اسی جواں کے سہارے سے جیتے ہیں ۲۵

مذکورہ بندوں میں میر انیس نے حضرت امام حسینؓ کی زبانی حضرت عباسؓ کا جو کردار پیش کیا ہے

اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کو حضرت عباسؑ سے کس قدر الفت و محبت اور والہانہ لگاؤ تھا۔ یہ صرف عقیدت کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ مذکورہ مثالی کردار ان میں واقعی موجود تھیں۔ اگر وہ واقعہ کربلا میں شریک نہ بھی ہوتے تب بھی انھیں جیسے کردار کے مالک ہوتے۔ علاوہ ازیں حضرت عباسؑ کے کردار میں جو وفاداری و جانثاری اپنے آقا کے لئے تھیں (جسے تمام مرثیہ نگاروں نے بیان کیا ہے) اس کی ادنیٰ سی مثال وہ واقعہ ہے جب کہ حضرت عباسؑ دریا کے نگہبانوں کو پرے ہٹا کر دریا میں داخل ہوتے ہیں اور پانی کا مشک بھرتے ہیں جب کہ وہ وقت ان کے لئے سخت ترین امتحان کا تھا اس وقت آپ کے کردار کو میرانیس نے یوں قلم بند کیا ہے کہ۔

لب تشنہ تین دن سے ہیں اور ہے فرات پاس چاہیں تو ہاتھ بڑھا کر بجھائیں پیاس
پر زہر ہے بفرشہ آسماں اساس مرتے ہیں آبرو یہ غلامان حق شناس
آقا کی تشنگی پہ جگر چاک چاک ہے

بے ان کے آب خضر بھی گر ہو تو خاک ہے ۲۵

گرمی میں تشنگی سے کلیجہ تھا آب آب ٹپا رہا تھا قلب کو موجوں کا پیچ و تاب
آجاتے تھے قریب جو ساغر بکف جناب کہتا تھا منہ کو پھیر کے وہ آسماں جناب
عباس آبرو میں تری فرق آئے گا پانی پیا تو نام وفا ڈوب جائیگا
فرما کے یہ سمندر کو ڈالا فرات کو گویا خضر اتر گئے آب حیات میں
دریا دل ایسا کون ہوا کائنات میں تسمہ پکڑ کے مشک بھری ایک بات میں

سیراب جب تلک کہ شہ بحر و بر نہ ہوں

منظور تھا کہ ہاتھ بھی پانی سے تر نہ ہوں ۲۶

مذکورہ بندوں میں حضرت عباسؑ کے کردار کی بلندی و عظمت مکمل طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کیونکہ جب فرات میں پانی لینے گئے اور پینا ہی چاہتے تھے کہ اچانک خیال آیا کہ ابھی ہمارے آقا اور چھوٹے

چھوٹے معصوم بچے پیاسے ہیں یہی کیفیت ان کے کردار کی بلندی کو اعلیٰ مقام تک پہنچاتی ہے ورنہ جو شخص کئی دنوں سے پیاسا ہو اور سمندر اس کے سامنے ہو وہ پانی نہ پئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ عباس ہی تھے جنہوں نے قربانی کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے۔

حضرت عباسؓ کو ہمیشہ سے امام حسینؑ کی عظمت اور بزرگی کا خیال اپنی جان سے بھی بڑھ کر رہا ان کے دل میں امام حسینؑ کا احترام و اکرام اس قدر تھا کہ مرتے وقت آپ نے اپنا سر امام کے قدموں میں رکھنے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھا اس کیفیت کی منظر کشی مرزا دبیر نے اس طرح کی ہے۔

اس جاں شکنی میں جو سنا شیون مولا تعظیم کی نیت سے کٹے شانوں کو ٹیکا
پھر پاؤں سمیٹے کہ نہ ہو پائنتی آقا شہ بولے نہ تکلیف کرواے میرے شیدا

کی عرض میں پھیلانے ہوئے پاؤں پڑا ہوں

حضرت نے یہ فرمایا سر ہانے میں کھڑا ہوں ۷۷

مذکورہ بندوں میں حضرت عباسؓ کی وفاداری اور حضرت امام حسینؑ کے لئے جانثاری اور بے پناہ عقیدت و محبت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک قاری کے لئے اس سے بڑھ کر کردار کی عظمت و بلندی کی نمایاں مثال اور کہاں پیش کی جاسکتی ہے۔ اسی لئے حضرت عباس کے لئے تمام مرثیہ نگاروں نے وفاداری، جانثاری، وفا شعار، علمبردار، سقائے سکینہ جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ میر انیس کے مرثیوں میں حضرت عباسؓ کا کردار اس قدر سبق آموز اور خوبصورت دکھایا گیا ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص بھی جس کے اندر اہل بیت سے محبت و عقیدت اور ہمدردی ہے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حضرت عباسؓ امام حسینؑ کے چھوٹے بھائی ہونے اور حضرت علیؑ کے بالکل بالمشابہ ہونے کے علاوہ ان کی دلاوری بھی خاص طور پر آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ بیت نبی کا سارا انتظام آپ ہی کے تفویض تھا۔ جب امام حسین مدینے سے نکلنے کی تیاری کرتے ہیں تو سفر کی ساری تیاریوں کا انتظام واہتمام

اور انصرام آپ ہی کے ذمہ رہتا ہے۔ بہادری، شجاعت اور دلیری و جنگ جوئی کے ساتھ آپ میں اخلاق کریمانہ اور کسر نفسی بھی نمایاں تھی جو ایک حقیقی بہادر کے لئے ضروری ہے۔ حضرت عباس مجسمہ بہادری ہیں جب آپ کسی سے دوچار ہوتے ہیں تو پہلے سلام میں سبقت فرماتے ہیں بڑے بھائی کی عزت و احترام کا آپ کو ہمیشہ خاص طور پر خیال رہتا ہے خود کو امام حسین کا ایک ادنیٰ سا غلام اور فرمانبردار کہتے ہیں جب آپ کے بہنوئی حضرت مسلم کی شہادت کی خبر پہنچتی ہے تو آپ کی بہن اور بھانجیاں رونے لگتی ہیں اور اس وقت آپ بہن کو سمجھاتے ہیں کہ خدا پر نظر رکھو۔

سمجھیں گے ان سے قاتل مسلم نظر میں ہیں پیٹو نہ سر کو سید والا سفر میں ہیں
وابستہ جس کے دم سے ہو اس کا رہے خیال لازم نہیں تمہیں کہ بھرے گھر میں کھولو یاں
ہم سب غلام جس کے ہیں دیکھو تو ان کا حال مانگو دعا جہاں میں رہے فاطمہ کا لال
لازم ہے تم کو صبر کہ دنیا میں نام ہو اس کا زہے شرف کہ نثار امام ہو
جب امام حسینؑ کا قافلہ کر بلا پہنچتا ہے حضرت عباسؑ بڑے بھائی سے ہاتھ جوڑ کر دریافت کرتے ہیں کہ خیمہ کہاں پکا کیا جائے؟ امام حسینؑ فرماتے ہیں، زینبؑ جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو پیا۔
حضرت عباسؑ یہ سنتے ہی پیچھے ہٹتے ہیں اور بڑی بہن زینب کے پاس جا کر درخواست کرتے ہیں کہ۔

حاضر ہے جانثار امام غیور کا برپا کہاں ہو خیمہ اقدس حضور کا
اور جب زینبؑ فرماتی ہیں کہ تم جہاں مناسب سمجھو وہیں اتار لو لیکن اتنا خیال رہے کہ۔
دشمن بہت ہیں بادشہ خوش خصال کے بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو بھیا مجھے ڈر ہے کہ رد و بدل نہ ہو
اس پر پہلے تو عباسؑ اپنی مصلحت و خاکساری کے متعلق کہتے ہیں اور پھر اپنی فطری بہادری کے اقتضاء سے کہہ اٹھتے ہیں کہ۔

جس سرزمیں پر دلبر زہرا عمل کرے زہرا کسی کا کیا ہے کہ رد و بدل کرے
 مانع وہ ہوں تو دین نبی میں خلل کرے کافر ہے جو حسین سے جنگ و جدل کرے
 غرض لڑائی کا مقام پسند کر کے ابھی خیموں کو کھول ہی رہے تھے کہ ہمراہ بان حسین شام کی آمد آمد
 سے تشویش میں پڑ جاتے ہیں کہ اس وقت۔

کہنے لگے پکار کے عباس حق شناس ہاں ناصران قبیلہ کو نین باحواس
 دل میں نہ خوف ہو نہ زباں پر کلام یاس جیتے ہو تو حسین سے ہو قدر داں کے پاس
 گر مر گئے تو روضہ رضواں کی سیر ہے دونوں طرف مآل تمہارا بخیر ہے
 کیا ڈر فثون روم ہے یہ یا جنود شام ہم اپنے کام میں ہیں ہمیں کیا کسی سے کام
 جو مرد ہیں ہراس کے کرتے نہیں کلام ہوتے دو گر ہیں سرخ علم یا سیاہ فام
 سر سبز ہیں وہی جو علی کے نشان ہیں خود جھک کے وہ ملیں گے کہ ہم مہمان ہیں
 حضرت عباسؑ یہ فرماتے ہیں کہ شام کی فوج کا سپہ سالار آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ ہمارے امیر کا حکم
 ہے کہ آپ کو دریا کے قریب مقام نہ کرنے دیں۔ دس ہزار کوئی اس وقت ہمارے ساتھ ہیں اور ابھی لاکھوں
 ہیں جن میں قبل و بعد آئے گا۔ اس قدر سننے کے بعد حضرت عباس کا جوش میں نہ آنا ممکن نہ تھا چنانچہ۔

غصہ میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق و دم نعرہ کیا اسد نے کہ تم۔ سے بٹے گے ہم
 گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم گرتا ہے کٹ کے سرد ہیں جس جا جئے قدم
 بھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی
 تم کون ہو حسین ہے ممتاز خشک و تر ان کے سوا ہے کوئی ہے شہنشاہ بحر و بر
 دیکھو فساد ہو گا بڑھو گے اگر ادھر شیروں کا یاں عمل ہے تمہیں کیا نہیں خبر
 سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں
 اس کے بعد آپ نہایت نرمی سے سمجھاتے ہیں کہ نبی کے نواسے سے لڑنا گناہ عظیم ہے ہم تو
 تمہیں سیدوں کا خیر خواہ سمجھتے تھے تمہارے شہر میں مہمانوں کی کیا خوب دعوت و تواضع ہے۔ واہ واہ اگرچہ

7855

ہم لوگ خاکسار ہیں لیکن اگر کوئی سرکشی کرے تو اس کی تاب نہیں، ہم اسے فوراً پسپا کر دیں گے۔
 حضرت عباسؓ ابھی شاہی فوجوں کو سمجھا ہی رہے تھے کہ شامیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور جناب
 عباسؓ بھی جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت عباسؓ کا حملہ کے لئے بڑھنا ہی تھا کہ سارے لشکر میں غل
 پڑ گیا اہل بیت نبی پریشان ہو گئے حضرت امام حسینؑ نے آواز دی کہ بھائی جان واپس آ جاؤ یہ نہر کیا ہے
 جس کے لئے جنگ و جدل کی ضرورت ہے یہ سنتے ہی اطاعت گزار اور فرمانبردار بھائی غصہ کو پی جاتے
 ہیں اور سر جھکا کر واپس آتے ہیں یہ ہے وہ فرمانبرداری اور اطاعت گزاری جس کا گہرا سبق میرا نہیں
 کے مرثیہ کا حاصل ہو سکتا ہے۔

غصہ میں انسان کو بھلے برے کی تمیز باقی نہیں رہتی اور پھر ایک جنگ جو شخص کا غصہ حضرت عباسؓ
 سخت جوش کی حالت میں بھی بھائی کی بات پر لیک کہتے ہوئے سر جھکا دیتے ہیں اور جب وہ آپ کو
 سمجھاتے ہوئے خیمے میں لے جاتے ہیں تو آپ کی بیوی آپ کے والہانہ کردار کو کس قدر عمدگی سے
 بیان کرتی ہیں۔

کہنے لگی یہ زوجہ عباس خوش بیاں غصہ میں ان کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
 ہر بات ہے شیر الہی کی آن بان یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان
 آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں یہ تو فقط حسین کے صدقے میں جیتے ہیں
 تمام ہمراہان شہید ہو چکے ہیں اور صرف حضرت عباسؓ کو جنگ سے روکنے والے صرف ان
 کے بڑے بھائی کا حکم تھا جس کے لئے بار بار درخواست کی گئی تھی لیکن ہر دفعہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

حضرت علی اکبرؑ دم حضرت عباسؓ سے کہتے ہیں کہ ہم شہ دیں سے رخصت کو عرض کرتے ہیں تو
 فرماتے تھے اشارے سے عباسؓ ذی حشم کھیو نہ کچھ تمھیں سر شبیر کی قسم
 پہلے فدا وہ ہوگا جو خدمت گزار ہے مرنے پہ جانثار تو پھر اختیار ہے
 یہ کہہ کر امام حسینؑ کے قدموں پر سر رکھ دیتے ہیں جب وہ سب دریافت کرتے ہیں تو عرض

کرتے ہیں کہ صاحبزادی سکی نہ پیاس سے سخت بے چین ہے اگر اجازت ہو تو ان کے لئے نہر سے پانی لاؤں۔ حضرت عباس کو یقین تھا کہ مہربان و شفیق بھائی یوں تو جنگ کی اجازت دیتے نظر نہیں آتے اس حیلہ سے بھی تو کامیابی حاصل ہوگی غرض اجازت ملتی ہے اور جنگ کے لئے نکلتے ہیں اور ایک عظیم الشان شہادت حاصل کرتے ہیں۔

میر انیس نے جہاں جہاں حضرت عباس کی معرکہ آرائیاں دکھائی ہیں رزمیہ نگاری کی معراج کو کمال تک پہنچا دیا ہے آپ کی لڑائی کا تفصیلی ذکر انیس کی رزمیہ نگاری کے موضوع سے متعلق ہے یہاں ہمیں صرف آپ کی سیرت و کردار کو پیش کرنا مقصود تھا جس کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ایک بہادر اور وفادار نو جوان اپنی شخصیت کو اپنے بھائی کی عظمت مآب ہستی میں محو کر دیتا ہے اور دنیا والوں کے لئے زندہ و جاوید نمونہ بن جاتا ہے۔

حضرت اکبر یا علی اکبر کا کردار

علی اکبر امام حسینؑ کے نو جوان فرزند ارجمند اٹھارہ سال کی عمر، آپ کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی،، ام لیلیٰ،، تھا لیکن اکثر مرثیہ نگاروں نے آپ کو حضرت شہر بانو کا بیٹا قرار دیا ہے آپ کی پرورش آپ کی پھوپھی جان حضرت زینبؑ نے کی تھی اور آپ کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ آپ صورت و شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہ تھے اسی لئے آپ کو شبیہ رسول، ہم شکل نبی، ہم صورت پیغمبر وغیرہ جیسے القاب سے پکارتے تھے۔ کربلا کی جنگ میں آپ نے خوب داد شجاعت دی آخر حصین بن نمیر کی برچھی سینے کے پار ہو گئی اور آپ شہید ہو گئے۔

چونکہ حضرت علی اکبرؑ بہت خوبصورت اور انتہائی خوب رو نو جوان تھے اس لئے مرزا دبیر نے جہاں ان کے اوصاف و کمالات کو کردار کے آئینے میں بیان کیا ہے وہیں ان کی خوبصورتی کی بھی حد درجہ تعریف کی ہے بقول مرزا دبیر۔

لو اب زیارت علی اکبر کرو بہم کنعانیوں کو حضرت یوسف کی دو قسم
اکبر سوا ہے حسن میں یوسف سے یا کہ ہم عمرانیوں سے پوچھو یہ موسیٰ کا تھا حشم
مثل کلیم ہے ید بیضا بھی بات میں
اعجاز بھی مسیح کا ہے بات بات میں

یعقوب ان کو دیکھے تو یوسف کو بھول جائے مریم کو ان کے آگے نہ عیسیٰ کی یاد آئے
داؤد ذکر اوج سلیمان نہ لب بہ لائے آئینہ طاق دل سے سکندر یہاں گرائے
بانی قدر باغ و گل کی، نہ خورشید و ماہ کی تصویر خاص ہیں یہ رسالت پناہ کی
رخ بوستان خلد کا بے داغ لالہ ہے یا خوبی رسول خدا کا رسالہ ہے
قرآن میں اس رسالہ کا اکثر حوالہ ہے اس مصحف جلال میں یکسر جلالہ ہی
کیونکہ نہ ہوئے فخر یہ ام الکتاب کا اس میں رقم نہیں کوئی آیت عذاب کا ۲۸
مندرجہ بالا اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علی اکبر کے اندر کردار کی مناسبت سے جتنی
خوبیاں مرزا دبیر نے بیان کی ہیں وہ یا تو کسی مبالغہ سے کم نہیں یا صرف اہل بیت سے عقیدت و محبت کی
بنیاد پر کہی ہیں کیونکہ کسی شخص کو پیغمبر کی شبیہ قرار دینا اور بات ہے اور کسی شخص کے ذاتی اوصاف و کمالات کو
پیغمبر کے جیسا بیان کرنا اور بات۔ بہر کیف مرزا دبیر نے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ ایک شخص کردار کو
پیغمبر کی مناسبت سے بیان کیا ہے جس سے اس کے شخص کردار کی بلندی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔
حضرت علی اکبر کے کردار میں ایک صابر و شاکر انسان بھی نظر آتا ہے مگر یہی صابر و شاکر انسان
کہیں کہیں رعب دار اور غیظ و غضب والے انسان کی شکل میں بھی رونما ہوتا ہے جس کا اظہار میر انیس کی
زبانی یوں ہوتا ہے کہ

اکبر نے کی غضب کی نظر سوئے فوج شام کانپے یہ غیظ سے کہ اگلنے لگی حسام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے قبلہ انام سنتے ہیں لشکر اعداء کے یہ کلام
خون تن میں جوش کھاتا ہے ہنگام جنگ ہی مولا بس اب تو حوصلہ صبر تنگ ہی

ان کے کلام سننے کی کس کے جگر میں تاب
 کیا اپنے دل میں سمجھتے ہیں یہ خانما خراب
 آداب شاہ سے نہیں ہم بول سکتے ہیں
 ہم کو یہ طعن وطن کی باتیں نہیں پسند
 ہونٹوں پہ غم سے اب ہی یہاں جان درد مند
 کاٹیں تیر سے ، تیغ سے ، خنجر سے ، بند بند
 ہنس ہنس کے جسم پر تیر کھائیں گے

تیغ زبان کے زخم اٹھائے نہ جائیں گے ۲۹

مندرجہ بالا اشعار کے ذریعہ میر انیس نے حضرت علی اکبر کے کردار میں ایک غیرت مند انسان کی کیفیت کو بیان کیا ہے جو وقت و حالات کی مناسبت سے مخالف افواج کو لرزہ بر انداختہ کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

اکثر مرثیہ نگاروں نے میدان کربلا کے مجاہدین کا اپنے عزیز واقارب سے رخصت کو انتہائی دلگیر اور دلسوزی کے انداز میں بیان کیا ہے مگر حضرت علی اکبر کو اس انداز سے رخصت کیا ہے کہ قاری کا دل بے قرار ہوا اٹھتا ہے۔ میر انیس نے ایک جوان بیٹے کا اپنے باپ سے میدان جنگ کے لئے اجازت طلب کرنے کو کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے۔

حضرت نے مسکرا کے نظر کی سوئے پسر
 فرمایا کیا ارادہ ہے اے غیرت قمر
 عباس کے فراق نے مارا غلام کو
 شہ نے کہا تمہیں میرے دل کی نہیں خبر
 ہے باپ کا عصائے ضعیفی جواں پسر
 نعلین عرش سا پہ جھکایا پسر نے سر
 کی عرض اذن دیجئے یا شاہ بحر و بر
 بس اب نہیں ہے صبر کا یارا غلام کو
 پیارے کہاں سے لاؤں میں اس طرح کا جگر
 جب تم نہ ہو گے پاس تو مر جائے گا پدر

کیونکہ جدا نگاہ سے بیٹا کریں تمہیں
آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ دیکھا کریں تمہیں ۳۰

پھر جب حضرت علی اکبر اپنی پھوپھی جان حضرت زینب سے جنگ کی اجازت طلب کرتے ہیں تو میرانیس نے ان کی شخصیت کو حضرت زینب کے حضور یوں پیش کیا ہے۔

روتے ہوئے گئے علی اکبر پھوپھی کے پاس دیکھا کہ غش پڑی ہیں زمیں پر وہ حق شناس
زانو پہ سر ہے ہوئے اکبر الہی بے حواس اس حال میں بھی لب پہ یہی ہے کلام یاس
آب و تاب و طاقت جسد و روح و دل گئی کیوں صاحبو رضا علی اکبر کو مل گئی
اکبر سے مجھ کو یہ نہ توقع تھی، ہے غضب اتنا نہیں خیال کہ ہے کون جان بلب
اس گل نے ہائے میرے ریاضت بھلائی سب نام خدا جواں ہوئے کیا ہم سے کام اب
ہیں محورن کے شوق میں، رخصت کے دھیان میں سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہاں میں ۳۱

مذکورہ بندوں کے ذریعہ میرانیس نے حضرت علی کے کردار میں ایک ایسے جانثار اور جانباز بیٹے کی تصویر کشی کی ہے جو قربانی اور شہادت کے جذبے سے لبریز ہے جو پہلے اپنے باپ اور پھر پھوپھی سے صرف اس لئے جنگ کی اجازت طلب کر رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے ہم عصر مجاہدین اس سے سبقت لے جائیں اور وہ اس جانبازی و جانثاری کے لئے مختلف شکلیں بھی اختیار کرتا ہے تاکہ اس کی بلندی عظمت و حرمت پر کوئی فرق نہ آئے اور اس کا نام ایک جانثار بیٹے اور حق شناس انسان کی شکل میں رہتی دنیا تک امر ہو جائے۔

مختلف مرثیہ نگاروں نے علی اکبر کے کردار میں ہمت اور شجاعت کو بھی انتہائی خوبصورتی کے ساتھ اپنے مرثیوں میں جگہ دی ہے۔ میرانیس نے بھی ان کی بہادری اور شجاعت و ہمت کو بخوبی بیان کیا ہے۔

بڑھنے کو اس طرف سے عدو سب کے سب بڑھے تنہا ادھر سے اکبر علی عالی نسب بڑھے
چومے قدم نہیب نے جھک کر یہ جب بڑھے گویا پے جہاد امیر عرس بڑھے

دہشت سے فوج شام کی بدلی سمٹ گئی
جماء کی زرہ پہ جو لگے جب کئی خدنگ
چمکا ایک آئینہ کی ہوئی فوج شام دنگ
تھی کسی کو تاب صاعقہ شعلہ بار کی
نعم نعم کے یوں گیا صف اعداء پہ وہ دلیر
غازی جو بھوک و پیاس میں تھا زندگی سے سیر
ایک سیل زور و شور سے آئی گذر گئی
جو ہر شناسی، تیغ زباں، دھیان ادھر کریں
دشمن ہزار سینے کو اپنے سپر کریں
بیٹوں میں ذولفقار کی سب آب و تاب ہی
قدرت خدا کی دن جو بڑھارات گھٹ گئی
صفدر نے بڑھ کے فاتحہ، لی تیغ شعلہ رنگ
دکھلائے تیغ تیر نے بجلی کے رنگ و ڈھنگ
یاد آ گئی ہر ایک کو چمک ذولفقار کی
جاتا ہے داؤں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر
کشتوں کے لپٹتے ہو گئے دم میں بڑوں کے ڈھیر
ثابت نہ یہ ہوا صف اول کدھر گئی
تیزی کو حرف حرف کی مد نظر کریں
مصرعے وہ جاں گزا ہیں ٹکڑے جگر کریں
بین السطور تیغ حسینی کی تاب ہی ۳۲

مندرجہ بالا ایک ایک بند میں حضرت علی اکبر کی شجاعت، جرأت و بہادری عیاں ہوتی ہے جو اپنے اعلیٰ اور بلند کردار کے ذریعہ صرف اپنے عزیزوں و رشتہ داروں اور دوستوں ہی میں نہیں بلکہ غیروں کے دلوں میں بھی محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے مزید ہم شکل رسول ہونے کی وجہ سے پوری امت مسلمہ کے لئے باعث فخر و احترام ہیں۔ جب حضرت علی اکبر کی شہادت ہوتی ہے تو اکثر مرثیہ نگاروں نے ان کے اس درد کو محسوس کیا ہے اور اپنے احساسات کو قلمی جامہ پہنا کر اس واقعہ سے متعلق جملہ کیفیات کو اپنے اپنے مرثیوں میں مختلف انداز سے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے اس سلسلے میں بھلا میر انیس جیسا با کمال شاعر کیسے پیچھے رہ سکتا ہے اس نے بھی اس جائگاہ واقعہ کی دردناک تصویر پیش کی ہے۔

جب اس جری نے قتل کئے سینکڑوں جوان
ہر صف سے ہر پرے سے اٹھا شور الامان
چلایا ابن سعد سیہ قلب و سخت جان
نکلیں وہ دس ہزار کماں دار ہیں کہاں
برچھی کا اب ہے کام نہ تلوار چاہئے
اس نوجواں پہ تیروں کی بوچھاڑ چاہیے

یہ سن کے تشنہ لب پہ چلے چار سو سے تیر
آتے تھے فوج فوج سپاہ عدو سے تیر
تیروں کا کیا ہجوم تھا اس نور عین پر
نکلے کماں کشوں کے جو حلقے سے وہ جناب
ڈوبے لہو میں کٹنے لگا گلشن شباب
مجروح بشریچ میں تھا اس ہجوم کے
طے کر کے معرکہ پہ پھرے تھے، کہ ناگہاں
دل توڑ کر آئی جو ہوئی پشت سے عیاں
نکلے جگر کے خون کے ڈریڈوں سے بہہ گئے

گھوڑے پہ یا علی ولی کہہ کے رہ گئے ۳۳

مذکورہ بندوں سے یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ حضرت علی اکبر کے کردار میں پاک طینت، سراپا بصیرت، نیک دل و باطل کے مابین امتیاز رکھنے والا شخص نظر آتا ہے جو سچائی اور دیانت داری کی راہ مستقیم پر چلتے ہوئے اللہ کی رضا و رغبت کی حصولیابی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے اور زبان سے اف تک نہیں کرتا۔

عون و محمدؐ کا کردار۔

حضرت زینبؓ کے صاحبزادے، حضرت جعفر طیار کے پوتے اور حضرت علیؓ کے نواسے ہیں۔ نو دس برس کی عمر تھی مگر انتہائی شجاع و بہادر تھے۔ بعض لوگوں نے ان کے نام ”عون و جعفر“ بتلائے ہیں مرثیہ میں ان دونوں بھائیوں کی جنگی حالات اور ان کی بہادرانہ شجاعت و جوانمردی ایک ساتھ لکھی جاتی ہے اور یہ بات اکثر و بیشتر بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ ان کے دادا جعفر طیار اور نانا حضرت علیؓ دونوں حضرات لشکر رسول کے علمبردار تھے اس لئے کربلا کی جنگ میں وہ خود کو حسینی فوج کی علم برداری کی وراثت کے مستحق

سمجھتے جاتے تھے اور علم نہ ملنے سے نہایت رنجیدہ تھے مگر اپنی مادر گرامی کے سمجھانے پر راضی ہو گئے۔
 عون و محمد کو حضرت زینب کربلا کے میدان میں اپنے عزیز ترین بھائی پر قربان کر دینا چاہتی تھیں
 گرچہ یہ دونوں ابھی نوعمر ہی تھے مگر کوئی بھی مرثیہ اٹھا کر دیکھ لیجے ان دونوں کے کردار میں آپ کو کہیں بھی
 بچوں والی بات نظر نہیں آتی بلکہ با حوصلہ اور باشعور کردار ہی نظر آتا ہے کیونکہ یہ معمولی بچے تو تھے نہیں بلکہ
 ایک بہادر اور صابر ماں کے بیٹے تھے جن کی پرورش ہی با حوصلہ اور باشعور ہاتھوں نے کی تھی جب یہ
 دونوں میدان جنگ کے لئے جاتے ہیں تو ان کی ماں اپنے لاڈلوں کو یہ نصیحت دیتی ہیں جسے میر انیس
 نے کتنی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اعداء کو میرے دودھ کی تاثیر دکھانا	دادا کی طرح جوہر شمشیر دکھانا
اجلال حسن ، شوکت شبیر دکھانا	تن تن کے ید اللہ کی تصویر دکھانا
نیزوں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آنا	خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آنا
نیزوں کی طرح چھاتیاں تانے ہوئے جانا	ہاں تیروں کی بارش میں سپر منہ پہ نہ لانا
ہنس ہنس کے میں قربان گئی، برچھیاں کھانا	لازم ہے وہ ہمت کہ معرف ہو زمانہ

اس جنگ کا چرچہ سحر و شام رہے گا

دنیا میں اگر تم نہ رہے، نام رہے گا

میلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہنر ہیں جس کے ہیں بس اس کے ہیں، جدھر ہیں بس اٹھ رہیں
 کہ عطر میں ڈوبے ہیں، گہے خون میں تر ہیں صحبت میں مصاحب ہیں لڑائی میں سپر ہیں
 وہ اور کسی سے نہ جھکیں گے نہ جھکے ہیں

عزت میں نہ فرق آئے کہ سر بیچ چکے ہیں

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی گر شیر بھی جھپٹے، تو سرکتے نہیں غازی
 تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی بجلی بھی گرے گر تو جھپکتے نہیں غازی

دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی
مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی ۳۴

مذکورہ بندوں کے ذریعہ حضرت زینب نے اپنے کم سن اور نو عمر بچوں کو جو ہمت و شجاعت کی تلقین کی ہے وہ قابل تعریف ہے اور انھیں یہ بھی سمجھایا کہ جنگ کے میدان میں کسی بھی مرحلے پر پیچھے مت ہٹنا بلکہ ہنس ہنس کر اپنی چھاتیوں پر برچھیاں کھانا اور دین حق کی حفاظت اور اہل بیت کی معیت میں اپنی جان قربان کر دینا تاکہ جب بھی شب و روز، صبح و شام اس کا تذکرہ ہو تو دنیاں والوں کے لئے تمہارا ہی نام باقی رہے کیونکہ اگر تم نے جام شہادت نوش کیا تو تمہارے لئے اخروی منازل کی ترقیاں تمہارا راستہ دیکھ رہی ہیں اور اگر غازی بن کر لوٹے تو تمہارے لئے دنیوی منازل کے بلند ترین دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

حضرت زینب نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو جو تربیتی سبق دیا تھا اس کا بھرپور مظاہرہ انھوں نے میدان جنگ میں کیا اور اپنے شجاعانہ و بہادرانہ کردار کے ذریعہ اپنی مثال آپ قائم کی جنگ کے میدان میں ان کے اس کردار کی نمائندگی میر انیس نے یوں پیش کیا ہے۔

کڑکیں وہ کمانیں وہ ہوا فوج میں کڑ کا	تیغوں کی سفیدی تھی، کہ تھا نور کا تڑ کا
گہہ بجھ گیا خورشید کا کبھی شعلہ سا بھڑ کا	ہر دل کو ہلا دیتا تھا سر کٹنے کا دھڑ کا
نعرے تھے کہ حیدر کے دلیروں سے دغا ہے	گھوڑے بھی بھڑکتے تھے کہ شیروں سے دغا ہے
دانتوں میں شجاعان عرب ڈاڑھیاں دا بے	وہ صورتیں خوں خوار وہ گھوڑے دو رکا بے
وہ گردنیں وہ سر تھے کہ معکوس قرا بے	وہ آگ کے پتلے تھے، تو شبدریز شتا بے

خون آل محمد کا بہایا تو انھیں نے

سادات کے خیموں کو جلایا تو انھیں نے

قبضوں پہ ادھر ہاتھ سلحشوروں نے ڈالے	تیر آئے کمانوں سے، پڑھے ظلم کے بھالے
یاں پنجے شیروں نے نیاموں سے نکالے	فوجوں پہ چلے شاد کے آغوش کے پالے ۳۵

مذکورہ بندوں میں میر انیس نے حضرت عون و محمد کی بہادری کے کارنامے اور جوش و ولولہ، ہمت و شجاعت کو کتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ کس طرح عون و محمد نے کربلا کے میدان میں دشمنوں کی فوج پر یلغار کی اور ان کی فوج کے پاؤں اکھاڑ کر رکھ دیا۔

زیادہ تر دیکھا گیا ہے کہ معصوم بچوں میں صبر و برداشت اور استقامت کا مادہ بہت کم نظر آتا ہے مگر ان دونوں بچوں کے کردار پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تین دن کے فاقوں کے باوجود ان دونوں نے جنگ لڑی اور کہیں سے بھی صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑا اور پائے استقامت میں لرزش پیدا نہیں ہوئی آخر کار میدان جنگ میں لڑتے لڑتے جام شہادت نوش فرمائی ان کی شہادت کو مرزا دبیر نے اس انداز میں پیش کیا ہے۔

اعدا کی صدا کان میں شیروں کے جو آئی بس کانپ کے موقوف کی دونوں نے لڑائی
اور عون نے یہ بات محمد کو سنائی کی خوب دغا بھوک میں اور پیاس میں بھائی

وہ کام ہوں اب جو شہید مہر وفا ہوں

امت پہ فدا ہوں شہ بیکس پہ فدا ہوں

ان تیروں کا رکنا کہ بڑھے ظلم و گمراہ پھر کونسا حربہ تھا وہ ان پر نہ چلا آہ
چلائے سوئے خیمہ کہ اے مادر ذی جاہ جرأت سے تو واقف ہوئیں غربت سے ہوا گاہ

دکھلا چکے ہم فوج کو شمشیر کا جلوہ

اب دیکھئے مظلومی شبیر کا جلوہ

وہ تو سوئے خیمہ پہ ابھی کرتے تھے تقریر جو جام اجل آیا لئے ساقی تقدیر
اکبر کے اور اصغر کے جو فدیے تھے وہ دلگیر ایک برجھی سے بسل ہوا اور الگ ہدف تیر

گھوڑوں پہ بغل گیر ہوئے پیار سے دونوں

اور ساتھ گرے خاک پہ رہوار سے دونوں

بالائے زمیں گر کے یہ چلائے وہ غمناک ہے وقت مدد اے پسر سید لولاک
 ہاں فوج سے نکلا عمر مرتد و ناپاک دیکھا کہ جگر گوشے ہیں زینب کے سر خاک
 زخموں کی پروا ہے نہ کچھ خوف قضا ہے
 ہے لب پہ ہنسی ورد زباں شکر خدا ہے ۳۶

مندرجہ بالا بندوں کے ذریعہ مرزا دبیر نے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ عون و محمد نے اپنی کم
 سنی اور نوعمری کے باوجود اللہ کی رضا کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا اور شہادت کے وقت ان کے
 چہروں پر کسی طرح کا کوئی خوف و ہراس نہ تھا بلکہ ان کا چہرہ روشن آفتاب کے مانند تھا جس نے حق و باطل
 کی لڑائی میں نیک دلی، جانبازی اور انتہائی حوصلہ و ہمت کا اعلیٰ ثبوت پیش کیا۔
 جناب قاسم کا کردار

حضرت امام حسنؑ کے بڑے صاحبزادے تھے اور امام حسینؑ کے بھتیجے، تیرہ برس کی عمر تھی کہ بلا
 کے میدان میں آپ کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے شام کے ایک نامی و گرامی پہلوان ازرق اور اس
 کے چار بیٹوں کو انتہائی شجاعت و بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے بے دردی کے ساتھ قتل کیا۔ میدان جنگ
 میں دلیری کے ساتھ لڑتے لڑتے آخر کار شہید ہو گئے اور لاش مبارک گھوڑوں کے درمیان اس طرح
 پامال کی گئی کہ جسم مبارک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے حضرت قاسم کم سنی کے باوجود انتہائی خوبصورت بھی
 تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے سراپا خوبصورتی کو تقریباً ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے اور میر
 انیس نے تو اس صنف میں کمال کر دکھایا ان کی خوبصورتی اور سراپا کی دلکشی کچھ اس طرح کی ہے۔

وہ باغ عمر قاسم نو شاہ کی بہار سنبل سی زلفیں، سرو قد، پھول سے عذار
 آنکھیں وہ جن پہ کیجیے نرگس کو بھی نثار نازک لب اس قدر، رگ گل جن کے آگے خار
 گیسو ہلے ہوا سے، تو جنگل چمک گئے
 جب ہنس کے بات کی تو ستارے چمک گئے

کچھ حسن بچنے کا تو کچھ آمد شباب وہ گل سا جسم اور وہ چہرے کی آب و تاب
اپنی جگہ پہ خال کے نقطے ہیں انتخاب پتلی کا نور جن کی سیاہی سے بہرہ یاب
گردن کی ضوء میں طور تجلی طور کے

سب عضوتن ڈھلے ہوئے سانچے میں نور کے سچے

مذکورہ بندوں کے ذریعہ میر انیس نے حضرت قاسم کی خوبصورتی اور ان کے سراپا کی منظر نگاری
بے حد خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے گویا کہ ہر ایک شی کا وصف (آنکھیں، زلفیں، لب، قد، گیسو، جسم،
چہرہ، گردن وغیرہ) حسین ترین پیرایہ میں بیان کیا ہے ایک عمدہ اور کہنہ مشق شاعر کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ
جب کسی شے کی خوبصورتی و دلکشی کو بیان کرے تو اس میں اس سے متعلق ہر ایک چیز کا ذکر کیا جائے تاکہ
قارئین کو اس کی سیرت اور سراپا کی تمام خوبیوں سے واقفیت ہو جائے اور کوئی چیز پردہ خفی میں نہ رہے۔

حضرت قاسم کی شادی کو ابھی ایک ہی دن ہوا تھا کہ ۳۸ انھوں نے راہ حق پر چلتے ہوئے اپنے
چچا کی معیت میں جان نثار کرنے کا فیصلہ کیا میر انیس نے اس سے متعلق واقعہ کو بھی اپنے مرثیہ کا موضوع
بنایا اور خوبصورت انداز میں اپنی نئی نویلی دہن سے رخصتی کی کیفیت کو قارئین کے روبرو کیا جب کہ اس طرح
کے نازک نفسیاتی حالات اور کیفیات کو اشعار کے پیرایہ میں پیش کرنا مشکل عمل تھا۔ بقول میر انیس

یہ کہہ کے آئے سر کو جھکائے دہن کے پاس آنکھوں میں اشک، درد کلیجے میں، جی اداس
فرمایا ہم کو ہائے یہ شادی نہ آئی راس سب مر گئے عزیز، شہنشاہ حق شناس
بستی تمام لٹ گئی، ویرانہ ہو گیا
شادی کا گھر جو تھا وہ عز خانہ ہو گیا

کس سے کہیں جو حال دل درد ناک ہے تلوار چل رہی ہے جگر چاک چاک ہے
اس زندگی پہ حیف ہے، دنیا پہ خاک ہے اب کوئی دم میں دلبر زہرا ہلاک ہے
آئی تباہی آل نبی کے جہاز پر
نزعہ ہے شامیوں کا امام حجاز پر

تم بھی کچھ اپنے باپ کی اس دم کرو مدد آفت میں آج ہے پسر ضیغم صد
دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے یہ روز بد صدقے کرو ہمیں کہ بلا ان کی ہوئی رد

راضی رضائے حق پہ بصد آرزو رہو

حیدر سے ہم بتول سے تم سرخ رو رہو

سوچو تمہیں گلا نہ کٹائیں تو کیا کریں فریاد فاطمہ کی صدائیں سنا کریں ؟
رخصت کرو تو فوج ستم سے دغا کریں کھولو جو لعل لب ، تو گھر ہم خدا کریں

صاحب ہمیں سپرد عروس اجل کرو

مشکل کشا بیٹی ہو ، مشکل کو حل کرو

گھونگھٹ ہٹا کے ہم کو دکھاؤ تورخ کا نور پاس اب نہ آسکیں گے کہ ہوتے ہیں تم سے دور
آنکھوں پہ ہیں ہتھیلیاں ، رقت کا ہے وفور نرگس کے پھول ہاتھوں سے ملنا ، یہ کیا ضرور

جینے کی اس چمن میں خوشی دل سے فوت ہے

بلبل جو گل کی شکل نہ دیکھے ، تو موت ہے ۳۹

مذکورہ بندوں کے ذریعہ میر انیس نے پہلی ملاقات کی (خصوصاً اپنی نئی نویلی دلہن) کی نفسیاتی
کیفیت اور اس کی جدائی کی بے بسی اور کشمکش کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور کردار کی اعلیٰ خوبیوں کو
اجاگر کیا ہے ساتھ ہی یہ پیغام بھی دیا ہے کہ میں جنگ کے میدان سے واپس آؤں یا نہ آؤں تم ہمیشہ حق
کا دامن مت چھوڑنا۔

اکثر مرثیوں میں حضرت قاسم کے کردار میں بے پناہ رفاقت ، جانثاری اور جرأت مندی اور
بہادری کے نمونے پائے جاتے ہیں مرزا دبیر نے بھی انکی بہادری سے متعلق لکھا ہے کہ

گردار کر کے بیٹھ گیا کوئی نابکار قاسم نے واں کیا ہنر جنگ آشکار
گھٹنوں کے بل زمین پہ بٹھا کے راہوار اور توں کر حسام شرر ریز و آبدار

قربت لگائی آپ نے یوں اس لعین پر
 ایک پاؤں تھارکاب میں اور ایک زمین پر
 کاٹا جو تیر کو تو سناں سے لپٹ گئی
 پرزے پھر ہرے کر کے نشاں سے لپٹ گئی
 کیا جانے دل میں جا کے کہاں سے لپٹ گئی
 چھوڑ بدن تو روح رواں سے لپٹ گئی
 چپید گئی تیغ سے دل عذر کیا کرے
 ناخن کو کوئی گوشت سے کیوں کر جدا کرے
 چمکی سنان نیزہ جو قاسم کی ایک بار
 چوتھے فلک پہ جا کے چھپا مہر نیزہ دار
 دن مثل موج ہو گیا ہیبت سے بیقرار
 تن ظالموں کے خوف سے تھرائے پیدوار
 بے دل فقط نہ دن میں گروہ شقی ہوا

نقارہ وہ دہل کا بھی قالب لی ہوا

مذکورہ تینوں بندوں میں مرزا دبیر نے حضرت قاسم کی دلیرانہ شجاعت و بہادری اور جوش و غیظ و غضب کو اعلیٰ کردار کی شکل میں پیش کیا ہے اور جو کردار کی نمایاں خوبی ہے اسے حتی الامکان اجاگر کیا ہے اس کے علاوہ مرزا دبیر نے حضرت قاسم کا بہادری کے ساتھ جنگ کرنا اثنائے جنگ شہید ہو جانا اور ذرہ برابر چہرے پر شکن تک نہ آنا کو بھی ان کے کردار کی خوبیوں میں شمار کیا ہے۔ بقول مرزا دبیر

طاقت پکارنے کی نہ قاسم میں تھی ذرا روح حسن نے دی شہ بیکس کو نہ ندا
 بھائی غلام آپ کا رن میں ہوا فدا شکر خدا مراد ملی ، مدعا ملا
 ہے اب دعا کہ یہ کرم کردگار ہو

عبد اللہ صغیر بھی تم پر نثار ہو

پہچان کر حسن کی صدائے حزیں کو شاہ بولے عمامہ پھینک کر فریاد یا الہ
 قاسم کی ماں سے کہنے لگے بھر کر سرد آہ لے بھائی تیرا آج ہوا اور گھر تباہ

فرزند تیرا مر گیا تقدیر سو گئی
 بیکس تو تھی پر اور بھی بیکس تو ہو گئی

پھر رو کے شہ نے اکبر و عباس سے کہا دو ہاتھ میرے لعلوں میں تم دیکھتے ہو کیا
طاقت نہیں ہے نور بھی آنکھوں کا جا چکا نوشاہ کے قریب مجھے لے چلو ذرا
ہو ہو کے بے قرار مرے بھائی روتے ہیں

ابن حسن مگر وہاں پاہل ہوتے ہیں
یہ کہہ کے شاہ رن کو چلے وا مصیبتا نہ روشنی تھی چشم میں نہ دل میں صبر تھا
کم طاقتی سے کانپتے تھے شہ کے دست و پا کہتے تھے اے یتیم حسن تجھ پہ میں فدا
ہم کو بلاؤ جلد کی مشکل حیات ہے
لوٹی کہاں قضا سے تمہاری برات ہے

مذکورہ بندوں میں صاف ظاہر ہے کہ جناب قاسم نے راہ حق پر اپنی جان نچھاور کر دی، ان کی
بہادری جوش و ہمت اللہ سے محبت و رغبت اور دین اسلام پر مرنے کا جذبہ ان میں بھرپور موجود تھا اور یہ
کسی شخصی کردار کی بلندی کی علامت ہے علاوہ ازیں ان کے کردار میں ایک نیک دل انسان اور اپنے
بڑوں کی عزت و احترام اور چھوٹوں پر شفقت و محبت کرنے والا انسان نظر آتا ہے۔

حبیب ابن مظاہر کا کردار

حبیب ابن مظاہر کی عمر تقریباً اسی برس کی تھی حسینی فوج کے سب سے ضعیف اور ناتواں سپاہی۔
کربلا کے سفر میں ہمیشہ امام حسین کے ساتھ رہے محبت و عشق کا یہ عالم تھا کہ امام حسین سے فرمایا کہ جب
تک میں میدان کربلا میں شہید نہ ہو جاؤں آپ کو جنگ کے لئے جانے نہ دوں گا اکثر مرثیہ نگاروں نے
انہیں انتہائی بوڑھا دکھایا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ امام حسین کے سچے اور وفادار سپاہی ہونے کے
ساتھ ساتھ عبادت گزاروں میں سے تھے۔ میدان کربلا میں امام حسین کے ساتھ اپنی سچی عقیدت و محبت
کا ثبوت اس طرح پیش کیا کہ امام حسین کے لئے اپنی جان تک قربان کر دی مرزا دبیر نے ان کے کردار
کی منظر کشی انتہائی درد آمیز طریقہ پر کی ہے مثلاً

پیری میں جواں بخت حبیب ابن مظاہر غازی ، اسدی ، نیک نصیب ابن مظاہر
حیدر کے حبیبوں کے حبیب ابن مظاہر بیچارہ و مظلوم و غریب ابن مظاہر
سردے کے یہ پیری میں سبکدوش ہوئے ہیں
بالوں کی سفیدی سے کفن پوش ہوئے ہیں

جس پیر کا اقبال ضعیفی میں جواں ہے حقا وہ حبیب شہ فردوس مکاں ہے
ثابت قدم ایسا کوئی پیروں میں کہاں ہے ثابت قدمی پاؤں کی رعشہ میں عیاں ہے
سرہلتا ہے ، پر کیف پارن میں جمی ہے جنبش میں ہے لوشع کو ثابت قدمی ہے
ہے بے سرو ساماں کوئی ایسا شہداء میں سرفن ہے کعبہ میں بدن خاک شفا میں
سب جسم ہے دربار شہ ارض و سما میں سر ابن مظاہر کا ہے سرکار خدا میں
کیونکر نہ وہ سر قابل درگاہ خدا ہو

جو خالق کونین کے فدیہ پر فدا ہو ۴۲

مذکورہ بندوں کے ذریعہ مرزا دبیر نے ان کی پیری میں جواں بختی کے نمونے کردار کے آئینہ میں
پیش کئے ہیں کہ انھوں نے اسی سال کی عمر میں بھی عشق حسین کا دامن نہیں چھوڑا اور حق و باطل کی لڑائی
میں بے جھجک دوڑ پڑے۔

حبیب ابن مظاہر کے کردار میں امام حسین سے سچی محبت ، گہری عقیدت اور ان کے لئے
وفاداری و جانثاری کا سچا جذبہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ آگے چل کر مرزا دبیر نے ان کے اسی والہانہ جذبہ کی
ترجمانی ان اشعار کے ذریعہ کی ہے۔

ظاہر میں حبیب ابن مظاہر کے فضائل محبوب نبی کا ہے یہ فرخندہ شمائل
شبیر کی الفت میں جو دیکھا اسے کامل اس مصحف ناظم نے کیا بر میں حمائل
پر خود غلطیوں نے وطن آوارہ کیا ہے ہر جز و بدن تیغوں سے کیا ہے
بچپن میں جو گھر سے شہ دین کھیلنے آتے یہ مٹھیوں میں خاک قدم ان کی اٹھاتے

کچھ آنکھوں میں انگلی کی سلائی سے لگاتے کچھ خاک کو گلو نہ رخسار بناتے

اس خاک سے سوحسن کا طالب وہ جری تھا

صندل تھا یہی ، سرمہ یہی ، عطر یہی تھا

بے وجہ نہیں منہ پہ ملی خاک وہ اصلاً بچپن میں یتیم تھا پئے طاعت مولا

اور عہد ضعیفی میں حضور شر تہنا آب دم خنجر سے کیا مسح سرو پا

منہ خون سے دھویا تو ہاتھ آب بقا سے

اس تازہ وضو سے گئے ملنے کو خدا سے

بچوں کی ضعیفی کھیلنے میں کرتے تھے بسیار شبیر کو ان سب میں بناتے تھے وہ سردار

شبیر انھیں میسرہ کا کرتے تھے مختار نفا سے جو ہم جوئی کوئی کرتا تھا تکرار

ہاتھ ان کا علم ہوتا تھا شمشیر کے بدلے

بچوں سے لڑا کرتے تھے شبیر کے بدلے ۳۳

مذکورہ بندوں کے ذریعہ مرزا دبیر نے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ حبیب ابن مظاہر اور امام

حسین کی دوستی بچپن سے تھی جس کو انھوں نے آخری ایام تک نبھایا یہاں تک کہ آپ نے کربلا میں جام

شہادت نوش فرمائی۔

حبیب ابن مظاہر کے کردار میں جو بنیادی خوبی ہے وہ یہ ہے کہ اسی سال کی عمر کے باوجود انکی

شجاعت و بہادری کے وہ جوہر جو انھوں نے کربلا کے میدان میں مخالف فوجوں کے درمیان دکھائی۔ مرزا

دبیر نے کربلا کے میدان میں جنگ کے لئے آنا کے اسی کردار کو کتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے

دامان قبا شاہ کے یاور نے سنبھالے دو صاعقہ برق اجل فوج پہ ڈالے

اک تیغ اور اک اسپ ہنر جس کے نرالے ہر صف کی صفائی تھی تو پرزے تھے رسالے

ارشاد کیا تیغ سے ایک ایک کے دو کر

تو سن سے کیا یاں ، ہر پکار پہ ٹھوکر

تلوار تھی قتل پہ بیداد گروں کے کیا حصے برابر کئے ان بد گروں کے
اک بال کا تھا فرق نہ حصے میں سروں کے مرکب نے پراگندہ کئے ہوش پروں کے

مدت سے یہ تھا دانت لعینوں پہ لگائے

ابرو کی طرح نعل حبیبوں پہ لگائے

تھا ضرب کے عالم میں عجب حسن کا عالم اک سمت وہ تلوار کا بل اور وہ
اور ایک طرف آپ کا وہ قامت پر خم ہر موئے بدن جو ہر شمشیر کا ہدم
جس صف پہ جھکے ساتھ چلی تیغ ولی کی

غل تھا کہ یہ شمشیر دو پیکر ہے علی کی

تیار کس آہن سے یہ شمشیر ہوئی تھی اعجاز نما الفت شبیر ہوئی تھی
کیا جنگ میں سیدھی کمر پیر ہوئی تھی اللہ کی قدرت سے کماں تیر ہوئی تھی

اس طنطنے سے پیروں کو تننتے نہیں دیکھا

نبرہ کسی تلوار کو پہنتے نہیں دیکھا ۴۴

مذکورہ بندوں کے ذریعہ مرزا دبیر نے ان کی شجاعت و بہادری کے کارناموں کو پیش کیا ہے اور یہ
بتلایا کہ میدان جنگ میں جب ان کی تلوار چلتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت علی کی تلوار گرج رہی ہے
دیکھنے والوں نے ایسا ہولناک منظر نہ کبھی دیکھا اور نہ سنا ہوگا۔ یہ تمام چیزیں امام حسین کے ساتھ وفاداری،
ایمان داری، بہادری و جانثاری اور محبت و خلوص کا نتیجہ تھیں۔ مرتے وقت آپ نے امام حسین کے پیروں
کی خاک اٹھا کر اپنی آنکھوں میں لگایا اور داعی اجل کو لبیک کہا۔ بقول دبیر

ہر حملے میں تھا ابن مظاہر کا یہ عنوان شمشیر بکف آتے تھے لرزشہ ذیشان

سب زخم دکھا کر انہیں کہتے تھے میں قرباں آقا مرے راضی ہوئے فرماتے تھے وہ ہاں

پھر سنتے تھے حیدر کی صدایاں سے پلٹ کر

ہم کو نہیں خوش کرتے ہو سینے سے لپٹ کر

تھی بارسوم آہ کہ رن کو جو سدھارے برچھی لگی گھوڑے گرے خوف کے مارے
دیراک کے جو آنے میں ہوئی شاہ پکارے عباس ، حبیب ابن مظاہر گئے مارے
فدیہ مرا بیکس ہے اور آوارہ وطن ہے
یاں اس کی نہ بیٹی ہے نہ ماں ہے نہ بہن ہے ۴۵

مذکورہ دونوں بندوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ حبیب ابن مظاہر نے ضعیفی کے عالم میں یہ عظیم الشان کارنامہ کر دکھایا کہ اس حالت میں بھی جواں دل انسانوں کی طرح جنگ کی اور کسی مرحلے میں بھی انھوں نے اپنے آپ کو ان سے کمتر نہیں سمجھا۔ بہر کیف غور کیا جائے تو حبیب ابن مظاہر کے کردار میں ایک سچا محبت، جانثار، وفادار، ایماندار اور سچی عقیدت و محبت رکھنے والا انسان نظر آتا ہے۔

حرکا کردار:

پہلے یزیدی لشکر کا سپہ سالار تھا اور خاص طور پر امام حسینؑ کو کوفہ جانے سے روکنے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن راستے میں امام حسینؑ کو حرکا لشکر اس حالت میں ملا جب کہ وہ پیاس کی شدت سے بے قرار تھا اور پانی کا تاحد نظر کوئی امکان نہ تھا۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حضرت امام حسینؑ کی غیرت رنگ لائی دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک، ہمدردی اور صلہ رحمی کی جو تعلیم ان کے نانا نے انھیں دی تھی اسی کے پیش نظر انھوں نے یہ گوارہ نہ کیا کہ اس کے پاس پانی ہو اور کوئی شخص پیاسا مر جائے۔ اس لئے اپنی لشکر کا سارا پانی حرکے لشکر کو دے دیا اس عظیم واقعہ کا حرکے دل پر گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ جب کربلا کے میدان میں یزیدی فوجیں آپس میں ٹکرانے کے لئے جمع ہوئیں تو اس کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑا اور اس نے یہ گوارہ نہ کیا کہ جس نے اس کو اس کے تمام لشکر کو ایسی بیقراری کی حالت میں پانی پلایا ہو کہ اگر اس وقت پانی نہ ملتا تو فوج کی کثیر تعداد پیاسی جاں بحق ہو جاتی، اس سے کیونکر جنگ کیا جائے اسی کا نتیجہ تھا کہ یوم عاشورہ حرام امام حسینؑ کی طرف آگیا اور سب سے پہلے یزیدی لشکر سے مقابل ہو کر جام شہادت نوش فرمایا۔ میرانیس نے حرکا ابن سعد

کے ساتھ گفتگو اور بات چیت کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ عمر سعد نے کی مڑ کر رخ حر پہ نگاہ
 بولا وہ اشہد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ محسن و منعم و آقا ہے مرا یہ ذی جاہ
 ان کے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے

نخن حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے
 ایک میں کیا ہوں زمانہ پہ ہے احساں انکا اکبر رحمت ہیں، خطا پوش ہے داماں ان کا
 خشک وتر پر ہے کرم خلق میں یکساں ان کا اے خوشحال، جو غربت میں ہو مہماں ان کا
 جنتی ہے جسے حاصل یہ شرف ہوئے گا

جو ادھر ہوگا، خدا اس کی طرف ہوئے گا
 ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گھر دیتے ہیں ہیں سخی ابن سخی بات پہ سر دیتے ہیں
 پیٹ سائل کا یہ فاقوں میں بھی بھر دیتے ہیں یاں تو زرد دیتے ہیں، فردوس میں گھر دیتے ہیں
 آس مجرم کی، گنہگار کی امید ہیں یہ

ذرہ پرور جنھیں کہتے ہیں وہ خورشید ہیں یہ
 یہ ابھی ہاتھ اٹھا کر جو دعا فرمائیں جتنے عالم کے گنہگار ہیں بخشے جائیں
 حق سے جس شے کے طلب گار ہوں، فوراً پائیں جام کوثر نہیں فردوس سے حوریں لائیں
 مثل خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے

یہ وہ بندے ہیں کہ اللہ یہ حق جن کا ہے ۴۵
 مذکورہ بندوں کے ذریعہ میرا نیس نے کتنی خوبصورتی کے ساتھ حرکی زبان سے امام حسین اور اہل
 بیت کی جملہ خوبیوں اور ان کی عظمت و بلندی کو اجاگر کیا ہے۔ حضرت امام حسین کے حسن سلوک کی
 بدولت حر کے کردار و عمل میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کے دل نے حق و باطل کے مابین امتیاز کو

باور کرایا نہتچتا اس نے باطل کا راستہ چھوڑ کر حق کے راستے پر چلنے کی راہ اپنائی اور اپنا سب کچھ حسین کے قدموں میں ڈال دیا۔ یہ امر حر کے کردار میں زبردست تبدیلی کا مظہر ہے۔

حر کے افکار و خیالات میں زبردست انقلاب آنے اور امام حسینؑ کا ساتھ دینے اور ساتھ دیتے ہوئے شہید ہو جانے تک کے جملہ کردار کی خوبیوں اور اس کی مدح سرائی کو میرا نیس نے اس انداز میں بیان کیا ہے۔

بخدا فارس میدان تہور تھا حر ایک دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حر
نار دوزخ سے ابوذر کی طرح حر تھا حر گوہر تاج سرعرش ہو ، وہ در تھا حر

ڈھونڈ کی راہ خدا کام بھی کیا نیک ہوا

پاک طینت تھی ، تو انجام بھی کیا نیک ہوا

نار سے نور کی جانب اسے لائی تقدیر ابھی ذرہ تھا ابھی ہو گیا خورشید منیر
شافع حشر نے خوش ہو کے بجل کی تقصیر تکیہ زانوے شبیر ملا وقت اخیر

اوج و اقبال وحشم فوج خدا میں پایا

جب ہوا خاک ، تو گھر خاک شفا میں پایا

آیا کس شان سے کعبے کی طرف چھوڑ کے دیر کوئی حضرت کا یگانہ بھی نہ سمجھا اسے غیر
حق نے لکھ دی تھی ہو تقدیر میں فردوس کی سیر فتنہ و شر سے بچا ، ہو گیا انجام بخیر

ذکر خیر اس کے موئے پر بھی ہوئے جاتے ہیں

عمل نیک ہر وقت میں کام آتے ہیں ۴۶

مذکورہ بندوں کے ذریعہ میرا نیس نے اولاً اس کی بہادری اور شجاعت کے نمونے پیش کئے پھر یہ بتانے کی کوشش کی کہ چوں کہ اس کی طبیعت میں پاکیزگی اور شرافت تھی جس نے اس کو اخیر وقت میں پاکیزگی کی جانب مائل کیا اور دوزخ سے خلاصی ولا جواب موتی بنا دیا۔ یہ تمام چیزیں یونہی اچانک نہیں

ہو گئیں بلکہ تقدیر کو یہ سب منظور تھا اس لئے وہ ذرہ سے آفتاب بن گیا شافع محشر نے اس ایک نیک عمل کے بدلے اس کی زندگی کے تمام گناہ معاف فرمادئے اور جب شہید ہوا تو شبیر کا زانو بطور تکیہ نصیب ہوا اور خدا کی فوج کا اقبال اور بھی بلند ہو گیا۔
حسینی فوج کے سپاہی۔

تاریخ اسلام میں امام حسینؑ کے سپاہیوں کا کردار بھی اعلیٰ مرتبت کا حامل ہے جس میں اہل بیت کے علاوہ مختلف مکی و مدنی قبیلے کے جانثار اور جانباز افراد کا ایک ہجوم تھا جو حق و باطل کی لڑائی میں امام حسینؑ کی معیت میں اپنا گھر بار و اہل و عیال کو چھوڑ کر راہ خدا میں نکل پڑا تھا جو پاکیزہ اعمال و کردار سے متصف تھے۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کے سپاہی انتہائی عبادت گزار و پرہیزگار، نیکی و بدی میں تمیز کرنے والے، نیک دل و نیک سیرت اور دنیاوی نعمتوں کو ٹھکرا دینے والے افراد کی جیتی و جاگتی تصویر ہیں جنہوں نے حق و باطل کی معرکہ آرائی میں حق کا ساتھ دیا۔ میر انیس نے (انصار کا جہاد) کے عنوان کے تحت ان کے کردار و اوصاف کو انتہائی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

کیا عاشق صادق تھے وہ کیا مومن کامل دی تھی انھیں خالق نے تمیز حق و باطل
کیا عقل تھی کیا فہم تھی کیا جوش تھا کیا دل کس حسن سے طے کر گئے وہ عشق کی منزل
وصف گل تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے

محبوب کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے
چوے لب سو بار، جو سینے پہ لگے تیر دم عشق کا بھرتے رہے زیر دم شمشیر
زخموں کو یہ سمجھے کہ ملا گلشن تو قیر تکبیر کا نعرہ تھا زباں پر دم تکبیر
محراب عبادت خم شمشیر کو سمجھے
جادہ وہ مسافر دم شمشیر کو سمجھے

مسلم پسر عوجہ انصار میں تھے فرد دنیا میں کسے ملتے ہیں اس طرح کے ہمدرد
 اعداء کے لئے تیغ ہلالی دم نادر پیری میں اولوالعزم، بڑھاپے میں جواں مرد
 جو عشق تھا سلمان و ابوذر کو نبی سے
 ان کو وہی الفت تھی حسین بن علی سے ۷۲

مذکورہ بندوں کے ذریعہ میر انیس نے حسینی فوج کے سپاہیوں کے کردار میں امام حسین سے جو
 محبت و لگاؤ تھی اسے پیش کیا ہے غور کریں تو حسینی فوج کے سپاہیوں کے کردار میں مومن اور جری بہادر
 انسان کی تصویر بھی نظر آتی ہے جس نے ہمت و جوانمردی سے مخالف فوجوں کا سامنا کیا اور آخر وقت تک
 امام حسین کا دامن نہیں چھوڑا۔ میر انیس نے بیان کیا ہے کہ امام حسین ان جانباز سپاہیوں کو جس عظیم مقصد
 کے لئے اپنے ساتھ لائے تھے اس مقصد میں انھوں نے آخر وقت تک امام حسین کا ساتھ دیا یہاں تک
 کہ اپنی جان بھی قربان کر دی۔

ضرغامہ و وہب و انس و مالک دین دار حجاج و زہیر و جبلہ عامر و عمار
 عمران و شیب و عمر و عابس ابرار قرباں حسین بن علی ہو گئے اک بار
 جس سمت یہ جانباز تھے خالی وہ پڑا تھا
 دو روز تک دشت ستم خوں سے بھرا تھا

اللہ رے وفا رے رفقا شہ ذی جاہ دل سینوں میں لبریز دلائے شہ ذی جاہ
 سردیتے تھے ہنس ہنس کے برائے شہ ذی جاہ کرتے تھے سفر چوم کے پائے شہ ذی جاہ
 دنیا کی نہ جانب تھی، نہ دریا کی طرف تھیں
 مرتے ہوئے آنکھیں شہ والا کی طرف تھیں

جب ایسے رفیقوں کا پرا ہو گیا خالی بھرتا تھا دم سرد وہ کونین کا والی
 پھر تھا کوئی مولا کا نہ ہدم نہ موالی لاشوں کو لگاتے تھے گلے سرور عالی

بے تاب تھے اس طرح ہر ایک دوست کے غم میں
جیسے کوئی روتا ہے برادر کے الم میں ۴۸

مذکورہ بندوں میں میر انیس نے اصحاب حسین کے شجاعانہ کارناموں اور ان سے سچی الفت
و محبت اور عقیدت کو کردار کے آئینہ میں پیش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ امام حسین کو اپنے اصحاب اور عزیزوں
کے شہید ہو جانے کا کافی رنج و غم تھا آگے چل کر مزید میر انیس نے ان کے شجاعانہ اور بہادرانہ کارناموں
کو بیان کیا ہے۔

ایک ایک جواں ملک شجاعت کا شہنشاہ بچے وہ اولوالعزم کہ العظمت اللہ
ذی قدر سرفراز ، وفاکیش دل آگاہ شیران کی نظر دیکھ کے بن جاتے تھے روباہ
پیارا یہ تہور سے کہ لاکھوں ہیں تو کیا ہیں

دعویٰ تھا ہر ایک کو کہ ہمیں شیر خدا ہیں
کھولے ہوئے راہت، کوئی تو لے ہوئے شمشیر بے تاب کہ تلوار کے چلنے میں ہے کیوں دیر
فاقوں میں زبردست کہ لاکھوں سے نہ ہوزیر پیشے میں پلے جو اسد اللہ کے وہ شیر
جز سجدہ حق سر کبھی ان کے نہ جھکے تھے

یہ قبلہ عالم کا ادب تھا جو رکے تھے ۴۹

مذکورہ بند کے ذریعہ میر انیس نے تشبیہ، کنایہ و استعارہ کے ذریعہ الفاظ کے استعمال کا کمال دکھایا
ہے اور حسینی افواج کے سپاہیوں کی بہادری کو بیان کرنے میں اپنی بہترین فنی کمالات کا مظاہرہ کیا ہے
مزید اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ حسینی افواج کا ایک ایک سپاہی مخالف فوج کے لاکھوں پر بھاری تھا۔ یہ
ایسا استعارہ ہے جو میر انیس جیسا شاعر ہی استعمال کر سکتا تھا۔

یزیدی افواج:

جہاں مختلف مرثیہ نگاروں نے حسینی جماعت کے افراد کے کرداروں کو ان کی شجاعت و بہادری،

دلیری، جفاکشی، جاٹاری و جانبازی کے آئینہ میں منظر کشی کی ہے اور ان کی جملہ خوبیوں اور اوصاف و کمالات کو بدرجہ کمال تک پہنچایا ہے وہیں مرثیہ نگاروں نے ان کے بالمقابل یزیدی افواج کے افراد کے بے رحمانہ اور مہیبانہ کرداروں کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ جن کے نام حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ عبید اللہ بن زیاد یزیدی کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا اسی کے حکم سے امام حسین شہید کئے گئے
- ۲۔ عمر بن سعد اس یزیدی لشکر کا سپہ سالار جو کربلا میں امام حسین کے قتل کے لئے جمع ہوا تھا
- ۳۔ شمر ذی الجوشن یزیدی فوج کا ایک سردار نہایت ظالم، بے رحم، حریص، احسان فراموش اسی نے امام حسین کو اپنے ہاتھوں سے شہید کیا
- ۴۔ حصین بن نمیر یزیدی فوج کا ایک سردار اس کی برچھی نے امام حسین کے نوجوان بیٹے علی اکبر کا کام تمام کیا
- ۵۔ حرمہ بن کاہل اسدی یزید فوج کا ایک مشاق تیر انداز امام حسین کا چھ مہینے کا بچہ علی اصغر اسی کے تیر سے شہید ہوا
- ۶۔ خولی یزیدی فوج کا ایک سپاہی امام حسین کی شہادت کے بعد جب یزیدی فوج آپ کے اہل حرم کو قید کر کے یزید کے دربار کو لے چلی تو امام حسین کا سر مبارک اسی کے نیزے پر بلند تھا
- ۷۔ ازرق ملک شام کا ایک نامی پہلوان جو حضرت قاسم سے لڑا اور مارا گیا اس کے چار بیٹے بھی جنگ آزما جوان تھے وہ سب ازرق سے پہلے حضرت قاسم کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے
- ۸۔ ہندیا ہندہ یزیدی بیوی اس کو رسول کے خاندان سے بڑی عقیدت تھی جب اسے معلوم ہوا کہ امام حسین شہید ہو گئے اور ان کے اہل حرم زندان شام میں مقید ہیں تو اس نے یزید سے سفارش کر کے انھیں رہا کروادیا
- ۹۔ حارث۔ کوفہ کا باشندہ حضرت مسلم کے دونوں بیٹوں کا قاتل
- ۱۰۔ جمال یزیدی فوج کا ایک بے حمیت بندہ حریف جس نے بعد شہادت امام حسین کا پٹکا اور

انگوٹھی لینے کے لئے آپ کا ہاتھ اور انگلی کاٹ لی۔ ۱۵

عمر بن سعد کا کردار:

حضرت امام حسینؑ سے لڑنے کے لئے کربلا کے میدان میں ایک عظیم لشکر لے کر آیا تھا پہلے امام حسین کے خیمے دریا فرات کے کنارے خیمہ زن تھے اس نے زبردستی امام حسین کے خیمے وہاں سے ہٹوا دئے اور اپنے خیمے نصب کروائے تاکہ پانی کی قلت نہ ہو اور امام حسین اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کروا دیا۔ اس کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ امام حسین مجبور ہو کر اور اپنے اصحاب کی حالت زار دیکھ کر یزید کی بیعت قبول فرمالیں اسی وجہ سے اس نے امام حسین کو طرح طرح کی تکلیفیں و مصیبتیں اور پریشانیاں پہنچائیں لیکن امام حسین نے کسی بھی طرح اس فاسق و فاجر کی بیعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

میدان کربلا میں عمر بن سعد اپنے لشکر کو امام حسین کے قتل کے ہنر و طریقے بتلاتا ہے کہ کس طرح امام حسین کو قتل کیا جائے مرزا دیر نے اس واقعہ کی منظر کشی کچھ اس انداز میں کی ہے۔

ہاں اے نمک حلاوت نہ ہمت کو ہاریو بھوکے کو بھوکا، پیاسے کو پیاسا ہی ماریو
ابن معاویہ کی خلافت سنواریو سید کے سر کو سینے پہ چڑھ کر اتاریو

اب تو ہے غلہ کل زدو جاگر و مال ہے

شبیر کو جو رنج کر و سب حلال ہے

پھر غلہ دے کے سب کو مخاطب ہوا عمر کھالو کہ اب غذا نہ ملے گی کئی پہر

اس جنگ میں ہر اس و تردد ہے سر بسر ایمان کا نقص، جاں کا خوف آبرو کا ڈر

امت سے سامنا ہے امام جلیل کا

کاٹا ہے جس کے باپ نے سر جبریل کا

ایک ایک ان میں خسرو صاحب قرآن ہے آج مینارہ حسینوں کا ہے جو پہلوں ہے آج

ایک ایک علی کی طرح شجاع جہاں ہے آج شیروں میں ان کی جنگ کا سکھ رواں ہے آج

یاں وقت ہے قریب نہ کھانے میں دیر ہو
 ان بھوکے پیاسے شیروں سے لڑنا ہے سیر ہو
 بڑھ کر عمر سے کہنے لگی بانی ستم اپنی تو یہ غذا ہے کہ بھوکے رہیں حرم
 نوفل پکارا سیر ہیں آب و غذا سے ہم کھائی ہے آج قتل علمدار کی قسم
 چلایا شمر ہم تو اس وقت کھائیں گے
 جب تین دن کے پیاسے کا سرکاٹ لائیں گے، ۵۲

مذکورہ بندوں سے یہ انکشاف ہوتا ہے۔ کہ عمر بن سعد کا کردار شر کے نمائندہ کا سا ہے جو ہمہ وقت فساد پر آمادہ ہے اس کے کردار میں برائی ہی برائی نظر آتی ہے اس کی باتوں کا طنزیہ اور مسخرانہ انداز اس کی خود غرضی، سوچ کی پراگندگی، اور رتبہ کی کم ظرفی کا پتہ دیتا ہے۔ اس کے جملہ کردار میں بہیمانہ اور وحشیانہ پن جھلکتا ہے اس کا صرف اور صرف مقصد جس کے لئے اس نے قسم کھائی تھی کہ امام حسین کو بھوکا و پیاسا قتل کرنا اور اس کا سرکاٹ کر لانے کے سوا کچھ نہیں تھا اور وہ اس میں کہاں تک کامیاب رہا یہ تمام چیزیں مرزا دبیر نے اس کے کردار کے تیئں پیش کیا ہے اور یہ اس بختگی کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا اس نے ارادہ کر رکھا تھا ایک حد تک وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہا۔ جہاں تمام مرثیہ نگاروں نے حضرت امام حسین کے کردار کے تیئں ایک سچا اور نیک دل انسان کو پیش کیا ہے وہیں عمر بن سعد کے کردار میں ایک ظالم و جابر، سفاک و قاتل اور اپنے ارادوں کا پختہ انسان نظر آتا ہے۔

ایک موقع پر جب حضرت قاسم جنگ کے لئے میدان کربلا میں تشریف لاتے ہیں تو عمر بن سعد ازرق سے یہ کہتا ہے کہ حضرت قاسم کے مقابلہ کے لئے جاؤ اس موقع پر مرزا دبیر نے عمر بن سعد کا کردار کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

ازرق پکارا عقل ہوئی تم سبھوں کی کیا کیا اس کی اصل طفل حسن ہے یا مہ لقا
 بولا عمر کہ پھر تو ذرا کہیو کیا کیا لڑکا سہی تو جا کے بھلا سر تو کاٹ لا

چاروں پسر بھی ہیں تیرے تیغ آزمائی کو
 بھیج اس جواں نچتن کی لڑائی کو
 ہنگامہ مری فوج میں ہے ہر طرف ہپا کیا دیکھتا ہے جا کے سر اس کا اتار لا
 ہنس کر لگا وہ کہنے کہ شامت ہی مری کیا لڑکے سے لڑکے اپنی حقارت کروں بھلا
 پیدا جو ہوئی ہے آبرو اہل جدال سے
 سو لڑکے کھودوں، اک زن بیوہ کے لال سے ۵۳

مذکورہ بندوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمر بن سعد نے ازرق جیسے بہادر پہلوان کو حضرت قاسم جیسے
 لڑکے سے لڑنے کے لئے ابھارا ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ ایک مشہور زمانہ پہلوان کو کسی نامور پہلوان کے مقابل
 بھیجنا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوا اس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ عمر بن سعد ایک ظالم و جابر اور بے رحم انسان تھا۔
 مرزا دبیر عمر بن سعد ہی کی زبان سے ایسے الفاظ ادا کروائے جس نے اس کے کردار کو پوری طرح اجاگر کر دیا
 اور یہ بھی بتلا دیا کہ اس کے کردار میں جو وحشی پن تھا وہ اس کے قول و عمل سے صاف ظاہر ہے۔

شمر ذی الجوشن کا کردار:

انتہائی ظالم و جابر شخص تھا اس کے سفاکانہ کردار اور بربریت کا عالم یہ تھا کہ زخمی حالت میں امام
 حسینؑ کے سینے پر چڑھ کر ان کا سر قلم کیا اور ان کے سر کو نیزہ پر چڑھایا عمامہ کو اپنے سر پر باندھا اسی نے
 حضرت سکینہؑ کے دونوں گوشوارے چھینے جس سے ان کے دونوں کان زخمی ہو گئے۔ حسینی قافلہ کا کربلا
 کے میدان میں پہنچنے اور اس موقع پر شمر کے کردار کو مرزا دبیر نے اس انداز میں پیش کیا ہے۔

نہ شمر سے پوچھا نہ ابن سعد سے پوچھا پھر حکم سے کس کے یہاں خیمے ہوئے برپا
 کیا جانے کیا دل میں ہے سمجھے شہ والا حاکم سے عداوت کا بڑھانا نہیں اچھا
 اس نہر پہ تل رکھنے کی بھی جانہ ملے گی
 اتریں گی جو فوجیں تو زمین یاں کی ہلے گی

ہم کو تو یہی حکم ہے حاکم کا ہمارے سب فوج فروکش ہو یہیں نہر کے کنارے
سیراب ہوں دریا سے جواں فوج کے سارے گرمی میں تلف ہونہ کوئی پیاس کے مارے

وہ دھوپ کی شدت ہی زمیں شعلہ فشاں ہے

آرام ترائی کے سوا اور کہاں ہے

شبیر کہاں ہیں انھیں یاں جلد بلاؤ کھدو لب دریا سے قیام اپنے ہٹاؤ
کہتا تھا یہی شمر لعین خوف نہ کھاؤ یاں قطع طنائیں کرو ، خیموں کو گراؤ

جز صبر و رضا ، کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں شبیر

ہم اتریں گے اسی جا نہیں رہ سکتے ہیں شبیر ۵۴

مذکورہ بندوں میں مرزا دبیر نے شمر کے کردار میں ایک ضدی پن اور ہٹ دھرم انسان دکھایا ہے
خواہ وہ موقع امام حسین کے خیمے دریا فرات کے کنارے سے ہٹوانے کا ہو خواہ اپنے خیمے نہر کے کنارے
لگوانے کا ہو۔ دبیر نے شمر کے کردار میں ہر جگہ ایک ضدی اور بد اخلاق انسان کی تصویر کشی کی ہے۔

علاوہ ازیں میر انیس نے بھی اسی انداز میں شمر کا کردار پیش کیا ہے جب کہ حضرت عباس
میدان کر بلا پہنچتے ہیں اور پیاس کی شدت کی وجہ سے پانی طلب کرتے ہیں اس وقت شمر کا کردار یوں
منظر عام پر آتا ہے۔

چلایا شمر تب کہ عبث ہے سوال آب دیں گے زبان تیغ سے ہم آپ کو جواب

بچوں کی پیاس سے ہے جو حضرت کو اضطراب پھر کس لئے ہے بیعت حاکم سے اجتناب

خیمے سے گھٹنوں اگر اصغر بھی آئے گا

جز آب تر پانی کا قطرہ نہ پائے گا ۵۵

مذکورہ بندوں میں شمر کا کردار عمر بن سعد ہی جیسا ظالم ، بدکار ، بے رحم و بے مروت اور
بد اخلاق نظر آتا ہے جو اپنے آقا کے حکم کی بجا آوری کے مقصد کی حصولیابی کے لئے ہر ممکن جدوجہد

اور تک و دو کر سکتا ہے۔

میر انیس نے شمر کے کردار میں جہاں پختہ ارادوں کا مالک شخص دکھایا ہے تو وہیں اس کی جملہ برائیوں کی بھی جانب نشاندہی کی ہے چہ جائے کہ اپنے پختہ ارادوں کی تکمیل کے لئے انسان کی کوششوں کو سراہا ہے جو کسی کامیاب شخص کے لئے نیک شگون ہے۔ جیسا کہ ماقبل ذکر ہوا کہ جب امام حسین جنگ لڑتے لڑتے زخمی ہو جاتے ہیں تو اس حالت میں شمر آپ کے سینے پر چڑھ کر آپ کا تن سر سے جدا کر دیتا ہے۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر مرزا دبیر نے انتہائی درد انگیز لہجہ میں شمر کے کردار کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔

مشاق بڑھے ذبح بڑھے دشمنان دیں قاتل کئی کھڑے ہوئے شبیر کے قریں
کوئی پکارا یاں کوئی بولا ابھی نہیں اب دیر کیا ہے سجدے میں رکھ لینے دو جبیں
آواز دی عمر نے ہے گردن ڈھلی ہوئی
قاتل پکارا آنکھ ذرا ہے کھلی ہوئی
سب تھم گئے مگر نہ تھا شمر لا بد شیم سر پیٹنے کی جا ہے دھرا کس جگہ قدم
سینہ دبا تو اور بھی تڑپے شہ ام شور فغاں سنا اسی حالت میں دم بدم
قاتل سے پوچھا دیکھ کدھر غل یہ ہوتا ہے
ہے ہے حسین کہہ کے کوئی رن میں روتا ہے ۵۶

مذکورہ بندوں کے ذریعہ مرزا دبیر نے شمر کے وحشیانہ اور سفاکانہ کردار کی ایک جھلک دکھلائی ہے ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ اس سے زیادہ بے رحم، بے درد، ظالم و جابر شخص روئے زمین پر موجود نہیں تھا۔ اور انتہا تو اس وقت ہو گئی جب اس بے مروت شخص نے ناموس رسول اور اہل بیت کی عظیم شخصیت حضرت سیکنہ کے نازک کانوں سے گوشوارے چھینے۔

شمر لعین سیکنہ سے لینے لگا گھر مجروح کان ہو گئے کرتہ لہو میں تر
کانوں کے درد سے ہوئی مضطرب وہ نوحہ گر اپنے پدر کو کرنے لگی یاد بے پدر
طفلی میں اس کو داغ دکھایا شریر نے
روئی جو وہ طمانچہ لگایا شریر نے ۷۵

مذکورہ بندوں میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ شمر کے کردار میں ایک بے درد بے رحم انسان
نظر آتا ہے جو وقت پڑنے پر بے رحمی کے ساتھ بچی کے گوشوارے چھین سکتا ہے، اسے طمانچہ مار سکتا ہے
اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں چھوٹوں کے لئے ذرہ برابر بھی شفقت کا مادہ نہ ہو اس لئے
یہ کہا جاسکتا ہے کہ شمر جیسا وحشی جاہل، بدکار بدطینت کوئی نظر نہیں آتا پھر اپنے ارادے کی پختگی میں وہ
اپنی مثال آپ تھا۔

حواشی

۱. تفصیل کے لئے دیکھیے: باب اول، اردو مرثیہ کافن
۲. صدیقی: مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری ص ۳۵۱ دسمبر ۱۹۸۰ء ممبئی
۳. صالحہ عابد حسین، انیس کے مرثیے ص ۵۱ ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۴. حوالہ سابق
۵. تفصیل کے لئے دیکھیے، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب، روح انیس ص ۲۳-۲۸ مطبوعہ کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ ۱۹۶۴ء صالحہ عابد حسین، انیس کے مرثیے ۱/۳۶-۳۷
۶. میر انیس کا خاندانی مذہب شیعہ تھا ان کی والدہ ایک تعلیم یافتہ اور پابند مذہب خاتون تھیں اور شرعی مسائل سے بخوبی واقف تھیں۔ میر انیس کے والد بھی ایک مذہبی آدمی تھے میر انیس کا کلام بخوبی سمجھنے کے لئے ان کے مذہب کو سمجھ لینا ضروری ہے تفصیل کے لئے دیکھیے، ادیب، روح انیس ص ۳۲-۳۳
۷. مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری ص ۳۵۱ دسمبر ۱۹۸۰ء ممبئی
۸. مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری ص ۲۵۲
۹. دبستان عشق کی مرثیہ گوئی ص ۱۷۳
۱۰. مرثیہ مہذب لکھنوی، شعاردبیر ۱/۱۲۸-۱۸۹ لکھنؤ ۱۹۵۱ء
۱۱. ادیب صاحب کا یہ قول کہ سیرت نگاری تو انیس سے پہلے گویا اردو میں تھی ہی نہیں کسی مبالغہ سے کم نہیں جب کہ خود انھوں نے میر حسن کا نام لیا اور شاید کہہ کر سیرت و کردار نگاری کے امکانات

ماقبل بھی روشن کر دئے البتہ یہ ضرور ہے کہ میرا نیس نے جس حسن و خوبی جدت پسندی، نازک خیالی، لطیف کیفیات و اشارات، کنایات و تشبیہات کا استعمال اپنی مرثیہ میں کیا ہے وہ دیگر مرثیہ نگاران کے یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ روح انیس ص ۴۰

- ۱۲ ایضاً.....
- ۱۳ انیس کے مرثیے ۴۴/۱
- ۱۴ ایضاً.....
- ۱۵ ادیب مسعود حسن رزم نامہ انیس ص ۳۳۸
- ۱۶ مسعود حسن رضوی ادیب رزم نامہ انیس ص ۲۳۷ لکھنؤ ۱۹۵۷ء
- ۱۷ مہذب لکھنوی بشعار دبیر ۱۵۰-۱۵۱
- ۱۸ رزم نامہ انیس ص ۲۵۳
- ۱۹ امام حسین کا جہاد، رزم نامہ انیس ص ۲۵۴
- ۲۰ روح انیس ص ۲۴
- ۲۱ مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری ص ۳۶۱
- ۲۳ ادیب مسعود حسن رزم نامہ انیس ص ۱۶۹
- ۲۴ مولانا سید علی حیدر براتی انیس ۱/۱۷۱
- ۲۵ مولانا سید علی حیدر براتی انیس ج ۱
- ۲۶ مولانا سید علی حیدر براتی انیس - ج ۲/۲۸۳
- ۲۷ مہذب لکھنوی اشعار دبیر ۱۳۰/۱
- ۲۸ مہذب لکھنوی اشعار دبیر ص ۳۲
- ۲۹ مسعود حسن رضوی ادیب رزم نامہ انیس ص ۱۹۲-۱۹۳

۳۰	رزم نامہ ص ۱۹۳
۳۱	رزم نامہ انیس ص ۱۹۷
۳۲	رزم نامہ انیس ص ۳۰۵
۳۳	رزم نامہ انیس ص ۲۱۷
۳۴	رزم نامہ انیس ص ۱۲۲-۱۲۳
۳۵	رزم نامہ انیس ص ۱۲۶-۱۲۷
۳۶	اشعار دبیر ص ۱۰۰
۳۷	رزم نامہ انیس ص ۱۴۰ (قاسم نوشاد کا جہاد)
۳۸	پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا کہنا ہے کہ حال کے محقق اس روایت کو مستند نہیں مانتے دیکھے روح انیس ص ۲۵۔
۳۹	رزم نامہ انیس ص ۱۴۱-۱۴۲
۴۰	رزم نامہ دبیر ص ۱۵۸-۱۵۹
۴۱	ایضا ص ۱۶۴-۱۶۵
۴۲	رزم نامہ دبیر ص ۱۱۳-۱۱۴
۴۳	رزم نامہ انیس ص ۱۴
۴۴	رزم نامہ دبیر ص ۱۱۸
۴۵	رزم نامہ انیس ص ۹۵
۴۶	رزم نامہ انیس ص ۱۰۸-۱۰۹ (حرکی مدح)
۴۷	رزم نامہ انیس ص ۱۱۲-۱۱۳
۴۸	رزم نامہ انیس ص ۱۱۳-۱۱۴

-
- ۴۹ رزم نامہ انیس ص ۱۱۵
- ۵۰ جن میں ہم صرف دو لوگوں کا (عمر بن سعد اور شمر ذی الجوشن) تفصیلی ذکر کریں گے۔ راقم
- ۵۱ مسعود حسن رضوی روح انیس ص ۲۷-۲۸
- ۵۲ رزم نامہ دبیر ص ۸۷-۸۸
- ۵۳ رزم نامہ دبیر ص ۱۴۰
- ۵۴ رزم نامہ دبیر ص ۷۱
- ۵۵ رزم نامہ انیس ص ۱۷۱
- ۵۶ رزم نامہ دبیر ص ۲۵۸
- ۵۷ ص ۱۶۰
-

باب سوّم

خواتین کربلا

☆ جناب فاطمہ ☆ جناب زینب ☆ شہر بانو
☆ ام کلثوم ☆ ام فروہ ☆ جناب سکینہ
☆ فاطمہ کبریٰ ☆ اُم لیلیٰ ☆ جناب رباب
☆ کنیزانِ اہلبیت

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے ویس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینسل

عبداللہ عتیق : 03478848884

صدرہ طاہر : 03340120123

حسینہ بالوی : 03056406067

www.emarsiya.com

باب سوئم خواتین کربلا

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کا کیا مقام تھا؟ اور عورت کے وجود اور روئے زمین میں اس کی ہستی کو کیونکر بد فال سمجھا جاتا تھا؟ ان دونوں باتوں کا اگر ہمیں تشفی بخش جواب چاہئے تو ہمیں تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا اور وہ جملہ اسباب کا حل تلاش کرنا ہوگا جہاں نہ صرف عورت کے وجود و ہستی کو ناگوار، ناقابل برداشت اور ذلیل و حقیر نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا بلکہ اگر غلطی سے بھی کسی کے گھر میں لڑکی پیدا ہو جائے تو اسے بدشگون سمجھا جاتا تھا اور اس کے گھر میں ماتم کا ساما حول نظر آتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ لڑکی کے پیدا ہوتے ہی عرب اپنی ذلت و خفت کو مٹانے کیلئے اسے قبر میں زندہ دفن کر دیتے تھے جس کے بارے میں قرآن شاہد ہے بایٰ ذنب قتلت (کس گناہ کے بدلے قتل کیا گیا ہے) گویا عورت کے وجود کو سماج میں ایک بدنما داغ سمجھا جاتا تھا جس کا مداوا اس دور جاہلیت میں مشکل ترین عمل تھا۔ وہیں دوسری جانب اسلام نے عورت کی راہ میں تمام تر رکاوٹیں ہی ختم نہیں کیں بلکہ عورت کو اس کا مقام اور اس کے جملہ حقوق متعین کئے عورت کو مرد کے برابر سمجھا گیا جو چیزیں مردوں کے لئے ضروری و لازمی سمجھی گئیں وہی عورتوں کے لئے بھی ضروری قرار دی گئیں۔ اسلام نے عورتوں اور مردوں کے مابین مساوات کا حکم دیا اور اس کے نتیجے میں جو معاشرہ پروان چڑھا وہ اعلیٰ ترین معاشرہ بن گیا ایسے معاشرہ و ماحول میں بڑی قابل قدر اور نامور خواتین سامنے آئیں جن کی طول و طویل تاریخ ان کے کارناموں اور ان کے بلند کرداروں سے بھری پڑی ہیں۔

جن کا تذکرہ یہاں بے محل ہے:

ان بلند اقدار و اخلاق کی خواتین میں خواتین کر بلا کو ایک اہم مقام حاصل ہے جو مرثیہ نگاران کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں ہمیں ان خواتین کر بلا کا تعارف اس انداز سے کرنا ہے کہ ان کی ولادت وفات اور ان کے اپنے رشتے ابھر کر سامنے آجائیں۔

واقعہ کر بلا انسانی تاریخ کا عظیم ترین واقعہ اور حق و باطل و خیر و شر کے معرکوں میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے اس معرکے میں مرد جہاں حق و صداقت کے طرف دار نظر آتے ہیں وہیں دوسری جانب عورتیں بھی حق و صداقت کی طرف دار نظر آتیں ہیں۔

واقعہ کر بلا جہاں امام حسینؑ کے بہادر و جانثار و جانباز رفیقوں کی قربانی و سرفروشی کا مرقع اور بے مثال نمونہ ہے وہاں اس یادگار واقعہ میں امام حسینؑ کے خاندان کی عورتیں اور ان کا اعلیٰ کردار بھی تاریخ میں بے مثال ہے۔ مرثیہ نگاران میں خصوصاً میر انیس نے ان صاحب عزم و ایثار خواتین کی سیرت نگاری اور ان کے کردار کو بیان کرنے میں اپنے قلم کا سارا زور صرف کر کے حسن بیان و حسن ادا کا وہ کرشمہ دکھایا کہ ہر تصویر بزبان بولنے لگی۔ یوں تو ہر مداح اہل بیت کے لئے ان کی بلند شخصیت قابل احترام رہی ہے مگر انھوں نے خاندان نبوت کی خواتین کی سیرت نگاری ان کے شایان شان ہی نہ کی بلکہ کردار نگاری کا بھی حق بخوبی ادا کیا مدینہ سے کر بلا تک کا سفر اور پھر محرم کے دس دنوں میں پیش آنے والے واقعات و حادثات کی مرقع کشی کر کے دکھا دیا کہ وہ کسی اعلیٰ اخلاق و بلند کردار کی بیویاں تھیں اور جو کچھ انھوں نے جھیلا وہ کسی مجبوری یا بے بسی کی وجہ سے نہیں وہ چاہتیں تو رنج و مصیبت کے اس سفر میں امام حسینؑ کے ساتھ نہ جاتیں یا پھر جب امام حسینؑ نے شب عاشورہ اپنے رفیقوں اور عزیزوں پر سے اپنی بیعت اٹھالی تھی اور اصرار سے کہا تھا کہ جو جانا چاہتا ہے وہ بخوشی چلا جائے۔ اس وقت یہ بیویاں اپنے بیٹوں اور شوہروں کو مجبور کر کے وہاں سے لے جاسکتی تھیں کہ اپنے پیاروں کی موت سامنے دیکھ کر عورت اور سب کچھ بھلا دیتی ہے مگر نہیں۔ ان حق اور ایمان پر جان قربان کر دینے والی عورتوں نے اپنی جان

سے زیادہ پیاری ہستیوں کو امام حسینؑ اور ان کے اعلیٰ مقصد پر قربان کر کے اپنی شخصیت کی مضبوطی اور سیرت کی بلندی کا بے نظیر مظاہرہ کیا کوئی شک نہیں کہ انھیں دکھ بھی ہوتا تھا اور صدمہ بھی، اور وہ پیاروں کی موت پر گریہ وزاری بھی کرتی تھیں مگر یہ تو انسانی جذبے ہیں جو قدرت نے ہر انسان کو عطا کئے ہیں دل کی اس تڑپ اور پیاروں کی اس جدائی پر گریہ و ماتم سے ان کے کردار کی عظمت اور مقصد کی لگن پر کوئی حرف نہیں آتا۔

خواتین کو عام طور سے کمزور، ناتواں، نازک، بزدل اور جذباتی سمجھا جاتا ہے مشکل وقت اور خوفناک ماحول میں خواتین جلد ہار جاتی ہیں مگر خواتین کر بلا نے جن مشکل حالات اور قیامت خیز ماحول میں حالات کا بھرپور سامنا کیا، جس طرح ہر مقام پر ثابت قدمی، دینی حمیت، ضبط و تحمل، شجاعت و بہادری اور حق گوئی کا مظاہرہ کیا ایسا عام مردوں کے لئے بھی کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن تھا۔

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کے مقصد کی تکمیل کا فرض انھوں نے اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھالیا اور اس راہ میں ہر طرح کی جسمانی و ذہنی اور روحانی کرب جھیلا مگر ان کے قدم راہ رضاء الہی سے نہیں ڈگمگائے اور باطل کی تمام کوششیں بھی انکو ڈرانے یا جھکانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

جن گھرانوں میں انیس کا کلام پڑھایا سنا جاتا ہے وہاں سیدۃ النساء فاطمہ زہرہ، زینب اور ام کلثوم، صغرا اور کبرا، شہر بانو، سکینہ، ام البنین اور زوجہ عباس بڑی محبوب اور دلکش ہستیاں ہیں اور ان کے ساتھ فضہ، ہندہ، شیریں، زوجہ حارث اور بنی اسد کی عورتوں سے بھی انہیں لگاؤ ہوتا ہے وہ ان کو اپنی ہی جیسی محبت اہل بیت سمجھ کر دوست اور عزیز رکھتے ہیں۔

جناب فاطمہ زہرا کا واقعہ کر بلا سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن وہ حسین و زینب کی والدہ ہیں اسی گود میں ان عظیم ہستیوں نے پرورش و تربیت پائی اس لئے اس تذکرہ کو ہم ان کی ذات گرامی سے شروع کریں گے اور دوسری خواتین میں سے بعض کو الگ الگ اور تفصیل سے اور بعض کو اختصار سے دکھائیں گے۔

سیدۃ النساء فاطمہ بنت محمدؑ

سیدۃ النساء العالمین، جگر گوشہ رسول، ام الحنین، حضرت فاطمہ زہرا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر آپ کی سب سے پہلی زوجہ محترمہ و مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی چار صاحبزادیوں میں سے ایک ۳

حضرت فاطمہ زہرا پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اور دنیا اسلام کی وہ عظیم شخصیت ہیں جن کا احترام بلا استثناء ہر عقیدے اور ہر فرقے کے مسلمان کرتے ہیں صرف اس لئے نہیں کہ وہ ان کے ہادی و رہنما کی لخت جگر ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ زہد و اتقاء، علم و فضل، ایثار و قربانی، خدمت و جفا کشی، خدا ترسی اور فیاضی، صبر و برداشت کی بے بہا صفات کی حامل تھیں جس طرح پیغمبر اسلام کی ذات قدسی صفات، اعلیٰ اور اخلاقی خوبیوں کا مجموعہ اور مسلمانوں کے لئے نمونہ تھیں۔ ان کی بیٹی بھی اپنے والد کی تعلیم و تربیت کی بدولت عورتوں کے لئے نمونہ بن گئیں تھیں۔

نام و لقب

فاطمہ نام، سیدہ طاہرہ زہرا لقب تھیں حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سیدۃ النساء فخر کائنات کی صاحبزادیوں میں سب سے کم سن تھیں ۵

ولادت

حضرت فاطمہ زہرا کی ولادت کے سلسلے میں اختلاف ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ نبوت کے پہلے سال ماہ جمادی الاخر کی بیس تاریخ کو پیدا ہوئیں۔ لیکن بعض راوی کہتے ہیں کہ وہ اس تاریخ سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں تھیں ۶

مولانا زاہد القادری نے لکھا ہے کہ آپ کا نور رسالت کے ساتھ خلقت کائنات سے بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا البتہ آپ کے ظاہری نمود و شہود کے لئے علماء نے لکھا ہے کہ آپ معراج رسالت ماب کے بعد سنہ ۵ بعثت میں تاریخ ۲۰ جمادی الثانی یوم جمعہ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئیں آپ کا سال ولادت عام الفیل

کے لحاظ سے سنہ ۴۶ھ اور عیسوی نقطہ نگاہ سے ۶۱۴-۶۱۵ تھا۔

بعض حضرات لکھتے ہیں کہ ۲۰ جمادی الثانی سنہ ۶۱۴ میں آپ کی ولادت ہوئی ۸۔ چونکہ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا نے ۲۸- یا ۳۰ برس کی عمر میں وفات پائی اور ان کی ولادت مبارک اس وقت ہوئی جب قریش تعمیر کعبہ میں مصروف تھے۔ یہ واقعہ بعثت سے پانچ برس پہلے کا ہے اور اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۵ برس تھی ۹۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کے بعد اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ اور الوراغ کو مکہ بھیجا اور ان کے ذریعہ ام المومنین حضرت سودہ اور اپنی صاحبزادیوں حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ کو مدینہ بلوایا تھا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جو زندگی گزاری اس میں حضرت فاطمہؑ اپنی والدہ محترمہ حضرت خدیجہ کی ایک عزیز یادگار کے طور نمایاں رہیں اور امہات المومنین انھیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھیں۔

جب حضرت فاطمہؑ شادی کی عمر کو پہنچیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے رشتوں کو رد کر دیا تھا اور یہ فرمایا کہ آپ اس بارے میں اشارہ ایزدی کے منتظر ہیں۔ ۱۰۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی پسند فرمایا کہ حضرت فاطمہؑ کی شادی اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی ابن ابی طالب سے کی جائے۔ روایت ہے کہ اس بارے میں آپ نے حضرت عمر سے مشورہ بھی کیا تھا اور انھوں نے بھی حضرت علی کو موزوں اور مناسب سمجھا تھا لہذا حضرت فاطمہ کا نکاح حضرت علی سے غزوہ بدر کے بعد ماہ صفر (بقول بعض ذوالقعدہ یا ذی الحجہ سنہ ۲ھ) میں ہوا اور پانچ سو درہم (بقول بعض ۴۸۰ یا چار سو درہم) مہر مقرر ہوا البتہ رخصتی جنگ احد کے بعد ہوئی ۱۱۔ رسم نکاح مسجد نبوی میں بہت سادہ طریقہ پر ادا ہوئی اور نکاح کے بعد حاضرین کو شہد کا شربت اور کھجوریں تقسیم کی گئیں۔ جہیز کے طور پر حضرت فاطمہ کو ایک انتہائی سادہ ساز و سامان کا گھر کرایہ پر لے کر دیا گیا تھا ۱۲۔

جہیز میں جو سامان دیا گیا تھا وہ ایک تخت خواب، دو تو شکلیں، ایک گرم چادر، تکیہ پانی کی چھاگل (مشکیزہ) لوٹا وغیرہ پر مشتمل تھا۔ دعوت ولیمہ جو اسی سال حضرت فاطمہ کی رسم نکاح کے بہت دنوں بعد دی گئی وہ بھی اسی طرح سادہ اور پاکیزہ تھی۔ ۳۱

شادی کے بعد حضرت فاطمہ کی ازدواجی زندگی مکمل خوشی و سکون سے گذری۔ حضرت علی حضرت فاطمہ کی بڑی قدر و عزت کیا کرتے تھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کو ہمیشہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ وہ اپنے شوہر کی ہر طرح اطاعت و فرمانبرداری کریں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گہرے قلبی تعلق کی وجہ سے حضرت فاطمہ کا گھر تواضع، سادگی، پاکیزگی اور اطمینان کا نمونہ بن گیا تھا جس پر ہر طرف مسرت و سعادت چھائی ہوئی تھی۔

وفات

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ اور اپنے نواسوں حضرت حسنین اور ان کے والد ماجد کے ساتھ وقت گزارنے میں بڑی مسرت محسوس کرتے تھے آپ کی وفات کے بعد خاندان نبوی اس مسرت و سعادت سے محروم ہو گیا۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ حضرت فاطمہ بھی وفات پا گئیں وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تین یا چھ مہینے اور زندہ رہیں۔ اور بقول واقدی ان کا انتقال ۳/ رمضان سنہ ۱۱ھ منگل کی رات کو ہوا ۱۲ ایک روایت کے مطابق وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اٹھارہ مہینے زندہ رہیں ۱۵ اعام طور پر مشہور قول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ ماہ بعد حضرت فاطمہ نے وفات پائی ۱۶

وفات سے پہلے حضرت فاطمہ نے حضرت اسماء بنت عمیس کو یہ وصیت کی کہ ان کے جسد مبارک کو اس طرح اٹھایا جائے کہ کوئی شخص یہ نہ جان سکے کہ یہ جنازہ عورت کا ہے یا مرد کا، نیز یہ کہ آپ کو رات کے وقت دفن کیا جائے اس لئے لعش کے اوپر کے حصے کو کھجور کی شاخوں سے اس طرح ڈھانپ دیا گیا کہ آپ کا جسم دکھائی نہ دے سکے۔ غسل میت وصیت کے مطابق حضرت اسماء بنت عمیس اور حضرت

علی و حضرت سلمیٰ ام رافع نے دیا۔ نماز جنازہ حضرت علی (یا بروایت دیگر حضرت عباس) نے پڑھائی۔ ۱۷

حضرت فاطمہ کے مزار مبارک کی جگہ کی تعیین میں بھی اختلاف ہے۔ واقدی کا قول ہے کہ ان کی قبر عقیل ابن ابی طالب کے گھر کے ایک گوشہ میں تھی اور قبر و سڑک کے درمیان ۷ گز کا فاصلہ تھا ۱۸۔ دوسری روایت کے مطابق آپ کی قبر حضرت عباس کے مقبرے کے اندر ہے (جسے جنت البقیع کا قبرستان کہتے ہیں) اور ایک روایت کے مطابق آپ کی قبر روضہ مطہرہ کے پاس ہونا لازمی ہے ۱۹

فضیلت

حضرت فاطمہؑ کی شخصیت تعظیم و تکریم اور عزت و شرف کے اعتبار سے عورتوں میں سب سے افضل و اشرف مانی جاتی ہے۔ حضرت فاطمہ جو دنیا میں مواہب الہیہ کا مظہر تھیں آخرت میں بھی تاج سعادت پہنیں گی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتے کے ذریعہ اطلاع پا کر ”سیدۃ النساء اہل الجنتہ کی خوشخبری دی“ ۲۰ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جنتی عورتوں میں حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ افضل ہیں ۲۱ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے دنیا بھر کی عورتوں میں چار خواتین کو بہترین قرار دیا۔ حضرت خدیجہ، حضرت فاطمہ، حضرت مریم اور حضرت آسیہ ۲۲ چنانچہ ان کی کنیت ام ایہا جو ایک طرف کریمۃ الطرفین ہونے پر دلالت کرتی ہے تو دوسری طرف آپ سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتی ہے ان کے خطابات اشرف النساء، ام الائمۃ الاصفیاء، البضعة الطاہرہ اور سیدۃ النساء ان کا لقب ان کے چہرے کے آب و تاب کے سبب الزہرۃ، حضرت حسینؑ کی صاحبزادی فاطمہ سے آپ کو ممیز کرنے کے لئے لقب الکبریٰ، اور خدا سے لولگانے کی وجہ سے بتول الزوا، نیز ان کے القاب الراضیۃ، المرصیۃ، المیمونہ اور التزلکیۃ ہیں یہ سب ان کے فضائل و صفات حسنہ کو بخوبی واضح کر دیتے ہیں۔

شماٹل

حضرت فاطمہؑ کی رفتار و گفتار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ ملتی جلتی تھی۔ جب حضرت فاطمہؑ کسی ایسی مجلس میں آتیں جہاں آپ بیٹھے ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبت شفقت اور پیار سے کھڑے ہو جاتے اور انھیں اپنے پہلو میں جگہ دیا کرتے تھے ۲۳ شکل و صورت میں حضرت فاطمہؑ اپنی والدہ حضرت خدیجہ سے بہت مشابہ تھیں وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ احد میں بھی شریک ہوئیں اور وہاں مجاہدین اسلام کو پانی پلاتی رہیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی رہیں آپ جب اس غزوہ میں زخمی ہوئے تو حضرت فاطمہؑ آپ کی خدمت میں موجود تھیں ۲۴۔ اور انھوں نے آپ کے روئے مبارک سے زخم کو صاف کر کے مرہم پٹی کی حضرت فاطمہؑ شعر بھی کہتی تھیں۔ ۲۵

اولاد

حضرت فاطمہؑ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں یعنی کل پانچ بچے تھے حضرت حسن، حسین، محسن، زینب، اور ام کلثوم۔ حضرت محسن تو بچپن میں وفات پا گئے تھے۔ حضرت زینب کی شادی حضرت عبداللہ ابن جعفر بن ابی طالب سے ہوئی اور ام کلثوم کی شادی حضرت عمر فاروق سے ہوئی تھی مگر حضرت فاطمہؑ کی نسل صرف حضرت حسن و حسین کے ذریعہ دنیا میں باقی رہی۔

کردار

حضرت فاطمہؑ زہراؑ کی سیرت طیبہ اور حالات حسنہ کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان کے کردار حسنہ میں ایک صابر و شاکر عورت کا روپ نظر آتا ہے جو دنیا و اسلام کی جملہ خواتین کو اس بات کا درس دیتی اور پیغام پہنچاتی ہے کہ کتنا ہی مشکل وقت و حالات کیوں نہ ہو ہمیشہ صبر و سکون اور استقامت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہئے اور ہر حال میں راضی برضاء الہی ہونا چاہئے۔

جناب ربابؑ

تاریخ کربلا میں جن عورتوں کے نام نمایاں اور ان کی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہیں ان میں ایک نام جناب رباب کا بھی ہے جنہوں نے احیاء دین حق کے لئے امام حسینؑ کے شانہ بشانہ کربلا کے لئے عازم سفر ہوئی تھیں اور وہاں پر نمایاں خدمات پیش کی تھیں۔ جناب رباب حضرت حسینؑ کی زوجہ محترمہ تھیں ان کا جذبہ قربانی اور صبر و شکر دونوں بے مثال ہے۔ واقعہ کربلا کے بعد تقریباً ایک سال تک بقید حیات رہیں بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد آپ کبھی چھت کے نیچے نہیں بیٹھیں نہ چٹا دھوپ کی تیزی سے ان کا جسم مبارک اس قدر متاثر ہوا کہ تمام جسم اور چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور اسی سبب سے ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا تعلق قبیلہ بنو کلب سے تھا آپ کے والد محترم کا نام امراؤ القیس تھا جو عرب کے بہت معروف و مشہور شخصیت کے مالک تھے۔

جناب ام فروہؑ

بیوہ عورت کو اپنے بیٹے سے جو اتھاہ محبت و لگاؤ ہوتا ہے اور اس کی ذات سے جو امیدیں وہ وابستہ کرتی ہے وہ زبان زد عام ہے ام فروہ بھی جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں جب ان کے بیٹے بہت کم سن تھے اور قدرتی طور پر انھیں اپنے بیٹوں، خاص کر بڑے بیٹے قاسم سے بے پناہ محبت تھی۔ مگر روز عاشورہ ایثار و قربانی کا جو مقابلہ خاندان نبوت کی عورتوں میں ہو رہا تھا اس میں ام فروہ کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ اور اپنے دو بیٹوں کو اپنے دیور پر جو ان کے ہادی اور امام بھی تھے قربان کر دیا۔ ام فروہ ایک عاشق زار ماں، چاہنے والی ساس، فرض شناس عورت اور سچی مسلمان بی بی تھیں۔ روح فرساجدائی کے صدمہ کے ساتھ ساتھ ان کو شدت سے اپنی بدنصیب بہو کی مصیبت کا احساس ان کی بلند شخصیت کا خاص پہلو ہے اور یہ احساس انھیں اس عظیم الشان فیصلے سے ہٹانہ سکا، جو بیٹے کو حق پر قربان کرنے کے لئے وہ کر چکی تھیں چونکہ خاندان نبوت کی سبھی عورتوں کو اپنی عزت اور وقار کا بڑا پاس تھا اس لئے وہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ایثار کرنا چاہتی تھیں۔ عورت کی فطرت میں رشک کا جو مادہ ہوتا ہے اسے انھوں نے شعوری طور پر

ابھار کر دکھایا ہے۔

روز عاشورہ حق و باطل کا بازار گرم ہو چکا رفیق و انصار شہادت پا چکے عزیزوں میں سے بھی کئی قربان ہو چکے یہاں تک کہ حضرت زینب کے دونوں بچے جام شہادت نوش کر چکے تھے اب فوج حسینی میں تین جوان باقی ہیں عباس علی اکبر اور قاسم، اس وقت ام فروہ نے جو شجاعت و جوانمردی کا ثبوت پیش کیا وہ تاریخ کے صفحات پر سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں، اپنی مامتا کو کچل ڈالا، اور آرزوؤں اور تمناؤں کو خاک میں ملا دیا۔ بیٹے کو مرنے کی صرف اجازت ہی نہ دی بلکہ اس کو اکسایا بھی کہ موت کو لبیک کہو۔ چچا کا حق محبت ادا کرو حق پر جان قربان کر دو۔ انھیں اس بات کا خدشہ بھی ہے کہ ابھی جوانی کی عمر ہے کل ہی تو بیاہ ہوا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عزم و حوصلہ کمزور ہو کر متزلزل نہ ہو جائے علی اکبر سے پہلے شہید ہونے کی تربیت دیتی ہیں اور آخر میں یہ کہتی ہیں کہ اگر ایسا نہ ہوا تو قیامت میں ہم تم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے۔

انھیں اس بات کا بھی علم ہے کہ اس معرکہ حق و باطل میں بہت سے جا چکے اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی نہ بچیں گے مگر ان کا لخت جگر ان دونوں سے پہلے قربان ہو تو وہ کنبے میں سر بلند اور قیامت میں سرخ رو ہوں۔

جناب فاطمہ کبریٰ

فاطمہ کبریٰ امام حسینؑ کی نو عمر بیٹی ہیں جو ایک رات کے لئے دلہن بنیں اور صبح کو بیوہ ہو گئیں۔ فاطمہ کبریٰ عرب کی حوصلہ مند، بہادر اور سادہ لڑکی ہی نہیں بلکہ شرم و حیاء کی پوٹ، رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہیں اور ریت رسمیں، دولہا دولہن کی بات چیت، دولہن کا حجاب، گھونگھٹ، دلہا کی لاش پر اس کے بین سبھی صفات عالیہ کی حامل ہیں۔ خاندان نبوت کی سیرت میں یہ پہلو کہ ساس بہو کے رشتے میں بھی محبت و خلوص ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ ماں اور ایک رات کی بیاہی دلہن نے کس طرح عزم سے قاسم کو حسین پر قربان کر دیا۔

حضرت زینب کبریٰ

حضرت فاطمہ زہرا بنت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اور تاریخ اسلام کی ایک نہایت محترم شخصیت ہیں۔ ام کلثوم اور ام الحسن ان کی کنیت تھی صدیقہ صغریٰ ان کا لقب تھا۔

ولادت

۵/ جمادی الاولیٰ سنہ ۵ھ یا سنہ ۶ھ کو آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ ۲۶ حضرت زینب حضرت علی کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرا ہوا گھر حضرت زینب کبریٰ کا خاندان تھا۔ نانا رسول آخر الزماں محمد مصطفیٰ، والد بزرگوار حضرت علی مرتضیٰ، والدہ محترمہ حضرت فاطمہ زہرا بھائی حسن حسین تھے۔ ولادت کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام زینب رکھا ساتویں دن حضور ﷺ نے عقیقہ فرمایا۔ حضرت زینب نے انتہائی پاکیزہ وارفع ماحول میں چھ سات سال گزارے۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اپنی والدہ ماجدہ کی جدائی کا داغ دیکھا۔

حضرت فاطمہؑ کے بعد جناب زینب کو ام النبیین اور اسماء جیسی بلند مرتبہ خواتین کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں ہر شخص اولاد حضرت فاطمہ زہرا کی زیادہ سے زیادہ عزت کرتا تھا۔ اس گھرانے میں تعلیمات رسول کا عملی چرچا تھا۔ سچی مازنی مدینے میں حضرت علی کے پڑوس میں رہتے تھے انھوں نے نہ کبھی حضرت زینب کا قد و قامت دیکھا اور نہ باہر آواز کی گونج سنی۔ ۲۷

وفات

حضرت زینبؑ نے کب وفات پائی یہ سوال محل بحث ہے۔ شیخ جعفر نقدی نے ایک قول نقل کیا ہے کہ یکشنبہ ۱۵/ رجب سنہ ۶۲ھ آپ کی تاریخ وفات ہے۔ ۲۸

حالات و کیفیات

حضرت امام حسین علیہ السلام حضرت زینب کی تعظیم فرماتے تھے۔ جب آپ تشریف لاتی تو

آپ کھڑے ہو جاتے اور اپنی جگہ بٹھاتے تھے۔ ۲۹

جناب زینب اپنی والدہ محترمہ کی وفات کے بعد خاندان میں امیر المومنین کی سب سے بڑی صاحبزادی ہونے کی بنا پر گھر کے تمام معاملات کی ذمہ دار قرار پائیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ دینی معاملات اور دوسرے گھریلو مشاغل میں بھی ہر ایک کی نظر ان ہی کی سمت جاتی تھی۔

شادی

جناب زینب کے لئے جب رشتے کا سوال اٹھا تو امیر المومنین کے ہر درخواست کو مسترد کر کے اپنے بڑے بھائی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی حضرت جعفر طیار کے بیٹے عبد اللہ کو دامادی کا شرف بخشا اور وہی مہر مقرر فرمایا جو حضرت فاطمہ کا مہر تھا۔ حضرت عبد اللہ اور جعفر عرب کے مشہور جواد اور کریم اور حضرت علی کے جانثار تھے

حضرت عبد اللہ بن جعفر سے جو اولادیں ہوئیں ان کے نام یہ ہیں۔ علی، عون، اکبر، ام کلثوم، جعفر

اکبر، محمد۔ ۳۰

حضرت زینب نے استقامت، عبادت ایثار اور حمایت دین کا جو مظاہرہ فرمایا اس کی مثال ملنی مشکل ہے ان کا امام حسینؑ کے ساتھ مکہ سے مدینہ اور مدینہ سے کربلا تک کا سفر کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا پھر دس محرم سنہ ۶۱ھ کو امام حسین کی امداد اور بھرے گھر کے شہید ہو جانے کے بعد یتیموں، بیواؤں، بچوں جوانوں اور عورتوں و مردوں کی نگرانی، دشمنوں کے مقابلے میں صبر و تحمل کا مظاہرہ لئے ہوئے قافلے کا قید ہونا اور ان کی لا جواب تقریریں اور عبد اللہ بن زیاد کی گستاخیوں کا جواب ۳۱ اس کے بعد شام کا سفر شام کے بازار اور یزید کے دربار میں اپنی حقانیت اور واقعہ کربلا کا اعلان، فصیح و بلیغ خطبے اور برجستہ جوابات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی خطبہ دے رہے ہیں۔ امام زین العابدین کو ابن زیاد کے بے رحم ہاتھوں سے زندہ بچالانا بھی ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے دمشق سے رہا ہو کر مدینہ تشریف لائیں تو واقعہ کربلا کو مؤثر انداز میں بیان فرمایا۔ ایک خاتون عالی نسب نے جس کا پورا خاندان شہید ہو چکا تھا جو طویل سفر اور شدید

تکلیفوں کے بعد جابر حکمرانوں کے سامنے اظہار حق کرتی رہیں۔ خواتین عالم کے لئے درخشاں مثال پیش کی ہے اور پھر ان کا دشمنوں کو رسوا کر کے پورے قافلے کو بچالے جانا عورتوں کے لئے فتح مندی و حق گوئی و توکل اور جہاد کی قابل تقلید مثال ہے۔ ۳۲

کرامت و سخاوت

حضرت زینب کی کرامت و سخاوت کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جب سیدہ مدینہ کے قریب پہنچیں تو انھوں نے لوٹ کے واپس شدہ زیور اور سامان میں سے قیمتی چیزوں کو لے کر اس شخص کو دیدیں جو شام سے مدینہ تک بطور محافظ ساتھ آیا تھا اور معذرت فرمائی کہ ہمارے پاس مال دنیا سے کچھ نہیں ورنہ ہم اور خدمت کرتے ۳۳

حضرت زینب کا کردار شہادت حسین تک

حضرت زینب کا کردار اور شخصیت اسی طرح عظیم و منفرد ہے جس طرح امام حسین علیہ السلام کی ہے اور کیوں نہ ہو دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں، ایک ہی ڈالی کے دو ثمر، ایک ہی پھول کی دو پتھڑیاں ہیں زینب و حسین نے ایک ہی آغوش میں پرورش پائی ہے ایک ہی دریائے علم سے فیض یاب ہوئے ہیں اور سیراب ہوئے ہیں دونوں نے اپنے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش محبت میں آنکھیں کھولیں اور اس عظیم شخصیت کی اعلیٰ صفات کو سب سے قیمتی و مایہ ناز ورثہ جانا۔

۳۲۔ تفصیل کے لئے دیکھیے۔ النقدی۔ زینب الکبریٰ مطبوعہ نجف، محمد عباس زیدی۔ کربلا کی

شیردل خاتون، لاہور ۱۹۶۱۔ اسد علی، صدیقہ صغریٰ۔ لاہور منتخب التواریخ، طہران ۱۳۸۷ھ سید محمد جعفر

زیدی ثانیہ زہرا، لاہور، مرتضیٰ حسین فاضل، جہاد حسین، کراچی ۱۹۵۷ء، دائرۃ ۱/۵۶۸-۵۷۰

یہ شاعرانہ انداز بیان نہیں حقیقت بھی ہے کہ سعادت مند بیٹی ماں کی صفات عالیہ کی وارث دار ہوتی ہے اور اس سے کسب فیض بھی کرتی ہے انھوں نے اپنے بحر العلوم والد سے علم کی دولت عظمیٰ حاصل کی تھی اور تاریخ کربلا میں ان کے فصیح و بلیغ خطبات ثابت کرتے ہیں کہ وہ بڑی عالم و فاضل خاتون تھیں

لیکن میرا نینب کی ان اعلیٰ خصوصیات و امتیازات کا کہیں کہیں صرف اشارہ کرتے ہیں غالباً ان کے پیش نظر ایک تو بھائی بہن کی گہری محبت دکھانا ہے اور دوسرے نینب کو ان کے مقصد سے گہرا لگاؤ ہے اس کی بھرپور وضاحت کرنا ہے وہ نینب میں ایک عاشق زار بہن اور سچی مسلمان عورت کا کردار ابھارتے ہیں۔ ۳۶۔

شہادت حسینؑ کے بعد

خاندان کا ہیر و سر پرست جام شہادت نوش کر چکا ہے، فوج ختم، بیٹے، بھائی اور بھتیجے خدا کو پیارے ہوئے، اب خاندان نبوت میں مردوں میں صرف ایک بیمار نو جوان سید سجاد باقی ہیں جو نحیف و بیہوش ہیں باقی سب بیوہ عورتیں ہیں، ننھے یتیم بچے ہیں نو عمر بے سہارا لڑکیاں اور یتیم بچی سکینہؑ ہے، بوڑھی خادمہ فضہؑ ہے اور حضرت حسینؑ کی دو بہنیں نینب اور کلثومؑ ہیں، نینب عمرؑ میں بہن سے بڑی ہیں اور عزم و ثبات میں بھی، ان کی شخصیت بھی زیادہ مضبوط ہے اس لئے اگرچہ خاندان کی حفاظت کا کام دونوں انجام دیتی ہیں مگر اس کا زیادہ بار اور پوری ذمہ داری حضرت نینب ہی کے سر ہے۔ امام حسینؑ کو شہید کرنے کے بعد بھی یزیدی فوجوں کی دشمنی کی آگ ٹھنڈی نہیں پڑی بلکہ وہ اور بھی زیادہ بے باکی سے اہل بیت کو ستانے پر تل گئے۔ وہ خاندان نبوت کے خیموں میں درانہ گھسے۔ عورتوں کے سروں سے چادریں چھینیں۔ بچے اور بچیوں کو نیزوں کے نوکوں سے زخمی کیا اور بعد میں سب کے خیموں میں آگ لگادی ۳۷۔

پھر کیا تعجب ہے کہ جس محمدؐ کے نواسے نے ان کے دین کی حفاظت کے لئے اپنا سب کچھ راہ خدا میں لٹا دیا ہو اس کی بہن نے بھی اپنا سب سرمایہ اسی طرح لٹا دیا جو عورت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اس کو راہ حق میں قربان کر دیا۔ جس عظیم مقصد کے لئے حضرت حسینؑ نے جان قربان کی اسی اہم مقصد کی تکمیل کے لئے نینب نے زندہ رہنا گوارا کیا۔ حضرت حسینؑ پر جو مصائب توڑے گئے ان کا خاتمہ شہادت پر فائز ہونے کے بعد شام عاشورہ تک ہو گیا لیکن حضرت نینبؑ کی مصیبتیں یہاں بھی ختم نہ

ہوئیں بلکہ مصائب کی سختی اور ظلم و ستم اور زیادہ بڑھ گیا۔ ۳۴

اور پھر روز عاشورہ تک جو کچھ جھیلا تھا اس روش میں حسین جیسا مخلص بھائی ساتھ تھا۔ اب جو سہا تن و تنہا سہا، مگر اس عظیم مقصد کی تکمیل کی خاطر ہر جان لیوا دکھ، ہر روح فرسا ستم انھوں نے اس عزم و وقار اور صبر و ضبط کے ساتھ سہا جو تاریخ انسانی و اسلامی روداد کے بیان میں ایک منفرد واقعہ بن گیا۔ وہ عورت کی عظمت کا ایک ایسا ستون ہیں جسے حادثات کی کوئی آندھی، کوئی زلزلہ ڈھانہ نہیں سکتا۔ انھوں نے مدینہ کے سفر سے لے کر واپس مدینہ جانے تک جو کچھ کیا جو کچھ برداشت کیا وہ اتنی طویل داستان ہے جس کے لئے خود ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے اور میر انیس کے کلام میں تو زینب کا کردار سب سے محبوب موضوع ہے اگر یہ کہا جائے کہ انیس کا کوئی مرثیہ کوئی سلام اس ذکر سے خالی نہیں تو یہ ایک حقیقت ہوگی۔ دراصل واقعات کر بلا میں زینب کی شخصیت اور کردار امام حسین کے کردار کی طرح ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے دونوں بھائی بہن روح و جان کی طرح ہیں۔ ان کی ذات سورج کی طرح ہے اور باقی لوگ ان کے ارد گرد گھومنے والے سیارے ۳۵

میر انیس اپنے ایک مرثیے میں حضرت زینب کا تعارف یوں کراتے ہیں۔

آفاق میں زہرا کا نہیں ہے کوئی ہمسر ز وجہ اسد اللہ کی اور بنت پیہر
حوا کا شرف، نور خدا عرش کا زیور قرآن میں جسے یاد کرے خالق اکبر
ثانی کوئی زہرا کا نہ ہو گا نہ ہوا ہے ہاں حضرت زینب کو جو کہے تو بجا ہے

حضرت حسینؑ کے پورے گھرانے نے یہ درد بھری رات جلع خیموں کے پاس جھلستی ریت پر گزاری۔ تاریخی روایتوں میں یہ واقعات مجمل طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ میر انیس نے بھی شاعرانہ تخیل کی آنکھ سے یہ سب واقعات دیکھے اور متعدد مرثیوں میں ان واقعات کو اس طرح نظم کیا گویا شاعر وہاں موجود اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ اور سن رہا ہے۔ ان مرثیوں میں یوں تو ذکر سبھی کا آتا ہے مگر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پورے ماحول پر جو ہستی چھائی ہوئی ہے وہ حضرت زینب کی ہے ۳۸

حضرت زین العابدین سے روایت ہے کہ جس رات کی صبح میرے والد شہید ہوئے ہیں میں بیٹھا تھا اور میری پھوپھی زینب میری تیمارداری کر رہی تھیں۔ اچانک میرے والد نے خیمہ میں اپنے ساتھیوں کو دیکھا اس وقت خیمہ میں ابوذر غفاری کے غلام خولی تلوار صاف کر رہے تھے اس وقت میرے والد چند اشعار پڑھ رہے تھے اور سارا معاملہ اللہ کے سپرد کر رکھا تھا۔ تین چار مرتبہ آپ نے اشعار دھرائے میرا دل بھر آیا آنکھیں ڈبڈبائیں مگر میں نے آنسو روک لئے میں سمجھ گیا کہ مصیبت ٹلنے والی نہیں ہے میری پھوپھی نے یہ شعر سنے تو وہ بے قابو ہو گئیں بے اختیار روتی ہوئی آئیں اور فریاد کرنے لگیں۔ حضرت امام نے یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اے بہن۔ یہ کیا حال ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس و شیطان کی بے صبریاں ہمارے ایمان و استقامت پر غالب آجائیں، انھوں نے روتے ہوئے کہا کہ،، کیونکر اس حالت میں صبر کیا جاسکے گا کہ آپ اپنوں کے ہاتھ قتل ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مشیت کا یہی فیصلہ ہے۔ اس پر ان کی بے قراریاں اور مزید بڑھ گئیں اور شدت غم سے بے حال ہو گئیں۔ یہ حالت دیکھ کر آپ نے ایک طویل طولانی تقریر صبر و استقامت پر فرمائی۔ آپ نے کہا بہن خدا سے ڈر، خدائی تعریف سے تسلی حاصل کر، موت دنیا میں ہر زندگی کے لئے ہے آسمان والے بھی ہمیشہ جیتے نہ رہیں گے اور ہر چیز فنا ہونے والی ہے پھر موت کے ڈر و خیال سے اس قدر رنج و بیقراری کیوں ہو۔

دیکھ ہمارے اور ہر مسلمان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اسوہ حسنہ ہے یہ نمونہ ہمیں کیا سکھاتا ہے کہ ہمیں ہر حال میں صبر و ثبات اور توکل و رضا کی تعلیم دیتا ہے۔ چاہئے کہ کسی حال میں بھی اس سے منحرف نہ ہوں۔ ۳۹

حضرت قرۃ بن قیس (یعنی شاہد) روایت کرتے ہیں کہ کوفہ کی عورتوں نے جب حضرت حسینؑ اور ان کے عزیزوں کی پامال لاش دیکھی تو ضبط نہ کر سکیں اور آہ و فریاد کی صدائیں بلند ہو گئیں میں گھوڑا دوڑا کر ان کے پاس پہنچا۔ میں نے کبھی اتنی حسین عورتیں نہیں دیکھی تھیں مجھے حضرت زینب بنت فاطمہ کا یہ بین کسی طرح نہیں بھولتا۔،، اے محمد تجھ پر آسمان کے فرشتوں کا درود و سلام۔ یہ دیکھ حسین ریگستان

میں پڑا ہے۔ تیری اولاد مقتول ہے ہوا ان پر خاک ڈال رہی ہے، راوی کہتا ہے کہ دوست و دشمن کوئی نہیں تھا جو ان کے بین پر رونے نہ لگا ہو۔ ۴۰

راوی کہتا ہے کہ جب اہل بیت کی خواتین اور بچے عبد اللہ کے سامنے پہنچے تو حضرت زینب نے نہایت ہی حقیر لباس زیب تن کیا ہوا تھا وہ پہچانی نہیں جاتی تھیں ان کی کنیریں ان کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھیں۔ عبید اللہ نے پوچھا یہ کون بیٹھی ہیں؟ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تین مرتبہ یہی سوال کیا مگر وہ خاموش رہیں آخر ان کی ایک کنیر نے کہا یہ زینب بنت فاطمہ ہیں۔

عبد اللہ شامت سے چلایا۔ اس خدا کی ستائش جس نے تم لوگوں کو رسوا کیا اور ہلاک کیا اور تمہارے نام کو بٹہ لگایا اس حضرت زینب نے جواب دیا کہ ہزار ستائش اس خدا کے لئے جس نے ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عزت بخشی اور ہمیں پاک کیا نہ کہ جیسا تو کہتا ہے۔ فاسق رسوا ہوتے ہیں۔ فاجروں کے نام کو بٹہ لگتا ہے۔ ابن زیاد نے کہا کہ تو نے دیکھا کہ خدا نے تیرے خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ حضرت زینب نے کہا کہ ان کی قسمت میں قتل کی موت لکھی تھی اس لئے وہ مقتل میں پہنچ گئے۔ عنقریب خدا تجھے اور انھیں جمع کر دے گا اور تم باہم اس کے حضور سوال و جواب کر لو گے۔ ابن زیاد غضب ناک ہوا اس کا غصہ دیکھ کر عمر و ابن حریث نے کہا، خدا امیر کو سنوارے، یہ تو محض ایک عورت ہے عورتوں کی بات کا خیال نہیں کرنا چاہیے۔ پھر کچھ امیر کے بعد ابن زیاد نے کہا، خدا نے تیرے سرکش سردار اور تیرے اہل بیت کے نافرمان باغیوں کی طرف سے میرا دل ٹھنڈا کر دیا۔ اس پر حضرت زینب اپنے تئیں سنبھال نہ سکیں بے اختیار رو پڑیں۔ انھوں نے کہا واللہ تو نے میرے سردار کو قتل کر ڈالا۔ میری شاخیں کاٹ دیں، میری جڑیں اکھاڑ دیں، مگر اس سے تیرا دل ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو ٹھنڈا ہو جائے۔ ۴۱

جناب ام کلثومؓ

نام ام کلثوم بنت علیؓ ہے آپ کی ولادت ۱۸/ربیع الاول سنہ ۶ھ کو ہوئی۔ امام حسین کی سب سے چھوٹی بہن جو اپنی بڑی بہن زینب کے ساتھ واقعہ کربلا میں اہم کردار ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

حضرت فاطمہ زہرا جیسی ماں، حضرت علی جیسا باپ، حسین جیسا بھائی، زینب جیسی بہن جن میں ہر ایک اپنے مقام و عظمت کی وجہ سے لاٹانی۔ ان مقدس ہستیوں کے مابین آپ کا وجود یقیناً آپ کی شخصیت کو عظیم و ممتاز بنا دیا تھا۔ ۴۲

جب آپ سن بلوغ کو پہنچ گئیں تو آپ کی شادی عبداللہ بن جعفر کے چھوٹے بھائی محمد بن جعفر سے کر دی گئی مگر اچانک عالم جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیغام نکاح بھیجا جسے شرف قبولیت مل گئی اور آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آ گئیں آپ کی شادی کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ،، اور اسی سال ۷ اسنہ میں حضرت عمر نے حضرت علی و فاطمہ کی بیٹی اور رسول اللہ کی نواسی جناب ام کلثوم سے اپنی شادی کی اور ماہ ذوالقعدہ میں دونوں اکٹھے ہو گئے۔ ۴۳ واقعہ کربلا کے اس غم اندوز سفر میں حضرت زینب کے ساتھ ام کلثوم بھی تھیں۔ حضرت زینب کی سربراہی میں جناب ام کلثوم نے اپنے بھائی حضرت حسین کے عظیم مقصد کے برآوری کے لئے کربلا کے سفر میں شریک تھیں جو عظمت کردار میں کسی طرح بھی حضرت زینب یا دیگر خواتین کربلا سے کم نہیں تھیں کیونکہ جہاں حضرت زینب نے اپنے زبردست خطبوں اور تقریروں سے ابن زیاد کے تخت کو ہلا کر رکھ دیا تھا وہیں ام کلثوم نے بھی اپنے خطبوں سے دشمن کو زیر کیا۔ اور کربلا کے میدان میں شہیدان کربلا کے ساتھ مل کر جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

حضرت عمر کے ساتھ سیدہ کے نکاح کو شیعہ تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ام کلثوم کی پہلی شادی عون بن جعفر بن ابی طالب سے ہوئی۔ سیدہ نے اپنے والد ماجد حضرت علی سے بعض روایات نقل کی ہیں۔

جناب سیکنہ بنت حسینؑ

حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی ہیں جن کا نام اردو، عربی اور فارسی رثائی ادب میں اکثر آتا ہے۔ اور عوام میں اس کا تلفظ،، سیکنہ بروزن سفینہ ہے لیکن صحیح تلفظ سیکنہ بروزن جہینہ ہے

(القاموس) ان کی زندگی کے مستند حالات نہ صرف یہ کہ بہت کم ملتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں شیعہ اور غیر شیعہ مصنفین کے یہاں بے حد اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ بہر حال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کی والدہ رباب بنو کلب کی شاخ بنو عدی کے نامور سردار امرؤ القیس بن عدی بن اوس کی دختر نیک اختر تھیں جو حضرت عمر فاروق کے خلافت کے زمانے میں امام حسین کے عقد میں آئیں تھیں اور شہادت امام حسین کے وقت وہ کربلا میں موجود تھیں۔ اس کے بعد اہل حرم قید ہو کر کوفہ و شام گئے اور رہائی کے بعد مدینہ واپس ہوئے۔ ان کی مفصل حالات و سوانح پردہ خفایں ہیں لیکن تذکروں سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیکنہ سوگ نشیں ہو گئیں تھیں اور انھوں نے اسی غم میں وفات پائی ۳۳ھ

اسی کے برعکس شیعہ مؤرخین کا بیان ہے کہ جناب سیکنہ کربلا کے غم و اندوہ سانحہ کے وقت زیادہ عمر کی نہ تھیں۔ مقاتل میں متعدد واقعات ایسے ہیں جن میں آپ کا نام آتا ہے۔ اسعاف الراعیین میں امام حسین کا یہ جملہ بھی مذکور ہے کہ سیکنہ پر استغراق مع اللہ غالب ہے۔ مدینہ منورہ میں بنات امام حسین کی زندگی کی جملہ تفصیلات نہیں ملتی لیکن جناب سیکنہ کے بارے میں، کتاب الاغانی، سے چند روایات نے رواج پایا جس پر رد و مناظرہ شروع ہو گیا لیکن واقعہ کربلا کے بعد ان کی زندگی کے جو واقعات ملتے ہیں وہ معتبر و مستند طریقے سے ثابت نہیں ۴۵ھ

شیخ مفید اور ابن شہر آشوب وغیرہ اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ دمشق میں ایک مزار جناب سیکنہ کی طرف منسوب ہے۔ اور عوام الناس کا خیال ہے کہ انھوں نے قید شام میں وفات پائی۔ ۴۶ھ

غیر شیعہ مؤرخین کی رو سے جناب سیکنہ نے طویل عمر پائی اور ان کا عقد یکے بعد دیگرے ابو بکر عبد اللہ بن حسین، مصعب بن زبیر، عبد اللہ بن عثمان خزاعی اور زید بن عمرو بن عثمان بن عفان سے ہوا۔ عبد اللہ سے ان کے یہاں ایک بیٹی رباب پیدا ہوئی اور زید سے ایک بیٹا عثمان۔ رباب نے کم سنی ہی میں وفات پائی عثمان مدینہ منورہ میں، قرین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مگر ان کے مزید حالات نہیں ملتے۔ ان سب مؤرخین نے حضرت سیکنہ کی شرافت و نجابت، حسن صورت و سیرت، سخن پروری، بذلہ سخی، جرات

اور کریم انفسی کی تعریف و توصیف کی ہے، زرکلی نے انھیں سیدۃ النساء عصرہا، قرار دیا ہے انھوں نے اپنے عہد کے جن نامور شعراء اور مغنیوں کی سرپرستی کی ہے ان میں جریر، فرزدق، جمیل، کثیر، اور ابن سریتج کا نام لیا جاسکتا ہے۔ بقول ابن خلکان جناب سیکنہ نے ۵/ ربيع الاول سنہ ۱۱ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ۴۴

جناب ام لیلیٰ

حضرت امام حسینؑ کی زوجہ محترمہ تھیں اور کربلا کے سفر میں شریک کار تھیں انکی ماں کے نام کے سلسلے میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ ان کی ماں کا نام میمونہ بنت ابوسفیان تھا اور بعض کہتے ہیں کہ ان کی ماں کا نام مرہ سقط تھا ۴۵

تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے فرزند ارجمند جو شبیہ رسول تھے خدا کی راہ میں اعلاء کلمۃ اللہ اور اثبات دین حق کے لئے ہنسی خوشی قربان کر دیا اور جب انکے جوان بیٹے کی لاش خیمہ میں لائی گئی تو جناب ام لیلیٰ نے علی اکبر کے بوسے لئے اور سجدہ شکر ادا کیا کہ خدا نے ان کی یہ قربانی قبول کر لی۔ کربلا کے ہولناک سفر سے واپسی کے بعد ان کی تمام زندگی عبادت میں گزری۔

۴۵۔ آغا مہدی، سیکنہ بنت حسین،

۴۶۔ ابن خلکان، ۱/ ۲۱۱

۴۷۔ تاریخ التواتر

جناب شہربانوؑ

امام حسین علیہ السلام کی پہلی بیوی کا نام ہے جو شاہ ایران کی بیٹی تھی حضرت عمر کے زمانے میں جب ایران فتح ہوا تو بندی میں جو عورتیں اور لڑکیاں آئیں ان میں شہربانو بھی تھیں۔ شجاعان عرب نے اس شریف و نجیب شہزادی کی عزت کا پاس کیا اور کئی لوگ ان سے عقد کے خواہش مند ہوئے۔ حضرت علی

نے ان کو آزاد کرا کے اپنے بیٹے حسین سے ان کا عقد کر دیا۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ اس قید و بند سے پہلے شہر بانو نے خواب میں فاطمہ زہرا کو دیکھا تھا اور خواب ہی میں اسلام بھی قبول کر لیا تھا اور بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنے بہو کے روپ میں قبول بھی کر لیا تھا اور اسی وقت سے وہ نادیدہ شہزادہ اسلام کی پرستار ہو چکی تھیں۔ قید و بند میں مدینہ آنے کے بعد اس خواب کی تعبیر رونما ہوئی۔

امام حسین اور شہر بانو میں گہری محبت اور سچی رفاقت تھی۔ بانو کو اپنے شوہر کی عظمت و رفعت کا احساس بھی تھا اور ان سے گہری عقیدت بھی اور اس پر ناز بھی کہ قسمت نے انھیں اتنے اونچے مرتبہ تک پہنچا دیا۔

حضرت امام حسینؑ کی بیوی شہر بانو ایک عاشق زار و فاشعار بیوی، چاہنے والی جانثار ماں، حق پرست اور ایثار و توکل پرست مومن عورت تھیں۔ جہاں جہاں انکا ذکر آتا ہے وہاں میاں بیوی کی محبت اور یک جہتی، ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا پاس اس پر اثر اور فطری رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ قدسی صفات ہستیاں ہمارے اور آپ کے جیسے انسان کے لئے نمونہ ہے اور دل سے اور زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں ۲۸

تفصیل کے لئے دیکھئے۔ صالحہ عابد حسین۔ خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں ص ۱۲۴ تا ۱۸۲۔

کنیران اہل بیت

کربلا کے صحیح تاریخی واقعات میں جن عام عورتوں کا تذکرہ ملتا ہے ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو کسی زمانہ میں کسی نہ کسی طرح خاندان رسول سے وابستہ رہ چکی تھیں اور قدرتی طور پر ان کے دل میں اس خاندان سے عقیدت و محبت اور الفت کا جذبہ بھر پور تھا۔ اور ظاہر ہے ان پر خاندان اہل بیت کا اثر بھی تھا، فضہ، ہندہ، اور شیریں اسی میں سے ہیں۔ کچھ وہ عام عورتیں بھی ہیں جو غائبانہ رسول اور اہل بیت رسول سے محبت کرتی اور اسلام کی پرستار ہیں۔ ان میں سب سے بلند اور پر اثر کردار فاطمہ زہرا کی کنیر فضہ کا ہے جس کی سیرت میں فاطمہ زہرا کی صفات کا پرتو، جس کے استقلال میں خاندان نبوت کے عزم کی جھلک اور جس کی محبت و ایثار کے جذبہ میں سچی مومنہ کی شان نظر آتی ہے۔

فضہ کی ساری محبت کا مرکز اپنی بی بی سیدۃ النساء کی ذات اور ان کی اولاد سے رہتا ہے واقعہ کربلا کے وقت قافلے کے ساتھ انکا جانا اور ہر موقع پر ان کا موجود ہونا اور حصہ لینا ثابت کرتا ہے کہ سفر میں امام حسینؑ نے جب اپنی والدہ محترمہ کی اس چہیتی کنیز کو ساتھ لیا ہوگا تو وہ جانتے ہوں گے کہ فضہ کس شخصیت کی مالکہ ہیں اور فضہ نے ان کے اعتماد کا حق ادا کر کے دکھا دیا کہ اعلیٰ مقاصد میں ساتھ دینے اور اہل بیت رسول پر جان وارنے میں وہ کسی سے کم نہیں۔ انھوں نے دکھ جھیلے، صدمے اٹھائے مگر صبر و برداشت میں فرق نہیں آیا۔ حق گوئی اور سچائی کا درس دینے میں بھی وہ ہمیں اہل بیت کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔

جناب شیریں

شیریں بھی ایک کنیز ہیں وہ ایرانی النسل ہیں بہت کم سنی میں وہ شہر بانو کے ساتھ بندی ہو کر آئی تھی۔ شہر بانو نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا پھر آزاد کر کے ایک دمشق کے رئیس سے شادی کر دی۔ شادی کے وقت شیریں سے امام حسینؑ نے وعدہ لیا تھا کہ ہم کبھی تیرے گھر آئیں گے وہ سالہا سال تک اپنے اس آقا کے اس وعدہ کے پورا ہونے کا انتظار کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ واقعہ کربلا کے بعد جب اہل بیت کا لٹا ہوا قافلہ اسکی ریاست کے قریب سے گذرا تو اسے سر امام مظلوم اور بدنصیب رائٹوں کی مہمانی کا شرف حاصل ہوا۔ ایک کنیز یا خادمہ کے لئے جو کسی بڑے گھرانے میں عزت و محبت سے رکھی جائے اس سے بڑھ کر فخر و مسرت کی کوئی اور بات نہیں ہوتی کہ وہ خود ان کی میزبان بنے، ان کی خاطر و تواضع کرے اور اس طرح اس احسان سے سبکدوش ہو جو انھوں نے اس پر کیا تھا۔ اور ساتھ ہی خود اپنی نظروں میں اپنی وقعت بڑھائے۔ برسوں بیت جاتے ہیں اور امام حسینؑ تشریف نہیں لاتے مگر شیریں کی آس نہیں ٹوٹی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ قول کے سچے اور وعدہ کے پکے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ اس کے آقا ایک نہ ایک دن آئیں گے اور سارے خاندان کے ساتھ آئیں گے اس لمبی مدت میں کیا کیا انقلاب رونما ہو چکے دور دیس کی رہنے اور گھر میں بیٹھنے والی شیریں ان تمام حالات و کیفیات سے یکسر بے خبر اور انجان ہے۔ مدینہ سے بہت دور دمشق کے ایک اندرونی حصے میں اس کے شوہر کی جاگیر ہے

جہاں دور کی خبریں نہیں پہنچتی اس لئے اس کا شوہر بھی نہیں جانتا کہ مدینہ و کربلا میں کس قسم کے واقعات پیش آئے اور کیا کیا ہوا۔ شیریں یہاں حسین کی یاد میں ہے اور وہاں ان سے مدینہ چھوٹا۔ کربلا کے میدان میں آئے اور تمام اہل بیت کے مردوں سمیت شہید کردئے گئے۔ البتہ شیریں نے ان کے جن بیٹے سید سجاد کو پالا تھا۔ جو بیماری کے باعث جہاد میں شریک نہ ہو پائے تھے اور زندہ بچ گئے تھے اور ان کو مع اہل حرم قید کر کے کربلا سے دمشق لے جایا جا رہا تھا جس کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں، گلے میں خاردار طوق ہے، ہاتھ میں ماں بہنوں کے اونٹوں کی مہار ہے وہ جلتی جھلکتی ریت پر ننگے پاؤں اس کے گھر کے سمت سفر کی کڑی منزلیں طے کر رہی ہیں۔ مگر وہ بدنصیب تو اپنے امام کا انتظار کر رہی ہے اور اس کے لئے اہتمام بھی کر رہی۔ ادھر اہل بیت کا لٹا ہوا قافلہ دشمنوں کے نیزوں اور تلواروں کے سائے میں شیریں کے گھر سے قریب تر آ رہا ہے اور ہر بی بی کے اونٹ کے قریب اس کے چہیتے کا سر بریدہ نیزے پر ساتھ ساتھ رکھا ہے۔ شیریں ان تمام دلسوز واقعات و حالات سے بے خبر ہے مگر سچی محبت کرنے والوں کی چھٹی حس پہلے ہی کچھ اس قسم کا احساس دلادیا کرتی ہے اور وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ نچتا شیریں کئی دن سے بے چین و بے قرار ہے خواب میں وہ امام حسین کی شہادت دیکھ لیتی ہے وعدہ بھی دہراتے سن لیتی ہے اس کی بیقراری و بدحواسی کو دیکھ کر اور خواب سن کر ان کا شوہر تسلی اور دلاسا دیتا ہے کہ یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں بھلا کس کی مجال ہے جو نواسہ رسول کو مار سکے، مگر شیریں کی بیقراری بڑھ رہی ہے۔ اچانک اسے یہ خبر ملتی ہے کہ اس قلعے کے قریب کوئی بڑا لشکر اتر رہا ہے لوگوں کا خیال ہے کہ امام حسین اپنے لشکر کے ساتھ تشریف لائے ہیں جب محلے و پڑوس کے لوگ شیریں تک کو اس قافلے کی روداد سناتے ہیں تو شیریں کے سارے اندیشے ہوا ہو جاتے ہیں دل جوش مسرت سے سرشار ہو جاتا ہے لیکن جب اپنے بعض عزیز و شوہر جسے خود امام حسین سے عقیدت و محبت ہے جب لشکر کے جملہ حالات اور وہاں سے امام حسین کی شہادت اور بربادی اہل بیت کی خبر سنتی ہیں تو دیوانہ وار سر پیٹتی ہیں سالہا سال کی امیدیں لمحہ بھر میں خاک میں مل جاتی ہیں شیریں پر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے، اور شدت غم سے بے حال ہو جاتی ہیں مگر پھر

اپنی خوزادیوں کی مصیبت و الم کا احساس ہوتا ہے اور سر سے چادر پھینک دیتی ہیں زیور نوچ ڈالتی ہیں اور روتی پیٹتی اسی حال میں لٹے ہوئے قافلے کے پاس جاتی ہیں شیریں کو دیکھ کر اہل حرم کا ماتم اور جوش غم میں ہوش کھونا بالکل فطرتی بات ہے۔

انہیں کنیران اہل بیت میں ہندہ بھی شامل ہے جنہوں نے خاندان حسینؑ میں پرورش پائی اور پھر ان کی شادی یزید بن معاویہ سے کر دی گئی جب قافلہ شام پہنچا اور تمام اہل بیت کو قید کر دیا گیا تو یہ خبر ان کے لئے بہت جان لیوا ثابت ہوئی جب ہندہ کے زندان میں آنے کی خبر پہنچتی ہے۔ ہندہ اپنی کنیروں کے ساتھ زنداں میں آتی ہے تو دربان و پہریدار زن حاکم کے احترام میں سر جھکا کر وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ عام انسانوں کے غم میں بے چین ہے اور نہیں جانتی کہ اس قید خانے میں اس کی آقا زادیاں مصائب جھیل رہی ہیں۔ در زنداں کے قریب اسے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں بندھے بھاری طوق پہنے امام چہارم سید سجاد نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑے نظر آتے ہیں۔ کنیریں اس نوجوان کے ملکوتی حسن اور اس کی حیا و شرافت دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں اور آپس میں اس کی تعریف و توصیف کر رہی ہیں مگر ہندہ کا دل خوف سے کانپ رہا ہے وہ اس مقدس چہرے کی زیارت کر رہی ہیں۔ ہندہ پریشان و گریاں دروازے سے آگے بڑھتی ہیں تو اسے خاک نشیں، برہنہ سر، زخمی بازو، سوگوار عورتیں ادھر ادھر سر جھکائے بیٹھی نظر آتی ہیں کسی کی گود میں بچہ ہے اور کسی کے پہلو میں بچی، جن کے چہروں پر بھوک، مصیبت، یتیمی اور ظلم و ستم کے نشانات ہیں لیکن خواتین کے چہروں پر اس حالت میں بھی شرافت کا نور عیاں ہے۔ ہندہ ان تمام قیدیوں کو قید سے آزاد کرتی ہیں اور اپنے شوہر کی غلطی کی ان تمام اہل بیت سے معافی مانگتی ہیں ہندہ اپنے عمل سے صاف ظاہر کر دیتی ہیں کہ وہ اہل بیت سے کتنی محبت اور عقیدت رکھتی ہیں۔ جن خواتین کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور ان تمام خواتین کی مختصر سی تاریخ پیش کی گئی ہے یہ تمام وہ خواتین ہیں جنہوں نے کربلا کے عظیم واقعہ میں امام حسینؑ کا ساتھ دیا۔ ان خواتین کی مختصر سی تاریخ یہاں لکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ مرثیوں میں ان کا ذکر آتے ہی کسی تعارف کی ضرورت نہ پڑے۔

حواشی

۱۔ لیکن محض مذہبی عقیدت اتنی محبت اور احترام پیدا نہیں کر سکتی جب تک وہ ہستیاں جن سے آپ کو عقیدت ہے ایسے جیتے جاگتے کردار بنا کر نہ پیش کئے جائیں کہ گویا زبان و مکان کا بعد مٹ جائے۔

خواتین اہل بیت کے پہلو بہ پہلو ہمیں عام عورتوں کے کردار بھی ملتے ہیں۔ ان عورتوں میں خاندان نبوت کی کنیریں ہیں عام شہری و بدوی عورتیں ہیں حاکم شاعر کی بیوی ہندہ ہے امام حسین کی بیوی شہربانو کی آزاد کردہ کنیر شیریں ہے قاتلان حسین کی عورتیں ہیں جو اپنے سفاک مردوں کے برعکس سچی مسلمان اور بانی اسلام کے چہیتے نواسے کی فدائی ہیں۔ صالحہ عابد حسین۔ خواتین کربلا ص ۲۲

۲۔ اس دوران یہ عرض کرتی چلوں کہ میرا نیس نے واقعہ کربلا کے تقریباً ڈیڑھ سو کرداروں کو مرثیہ کے ذریعہ بیان کر کے زندگی کی ایسی دلکش اور پر اثر تصویر دکھائی ہے۔ درد و غم کے واقعات کی ایسی مرقع کشی کی ہے کہ یہ سب جیتی جاگتی ہستیاں بن کر ہمارے دل کے تاروں کو چھوتے اور دماغ میں ان مٹ اثرات چھوڑ جاتے ہیں مگر ان تصویروں میں ہندوستانی رنگ و روپ بخوبی نظر آتا ہے خاص طور خاندان نبوت کی تہذیب اور رہن سہن کو ہندوستانی روپ میں پیش کرنے کی شعوری کوشش کی یہی حال تقریباً مرزا دبیر کے یہاں رہا کہ انھوں نے ان کرداروں میں لکھنوی تہذیب و رسم و رواج کو دکھایا۔ تفصیل کے لئے صالحہ عابد حسین خواتین کربلا ص ۲۵-۲۸

۳۔ صاحب مصنف،، چودہ ستارے،، میں لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام اور حضرت خدیجہ

الکبریٰ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بقول موصوف،، حضرت فاطمہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ اور جناب خدیجہ الکبریٰ کی اکلوتی بیٹی، حضرت علی کی رفیقہ حیات اور امام حسن حسین، جناب زینب و ام کلثوم کی مادر گرامی اور نوا ماموں کی جدہ ماجدہ تھیں۔ چودہ ستارے ص ۹۱ جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ کے لطن سے آپ کی چار صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کے نام یہ ہیں۔ حضرت زینب، ام کلثوم، فاطمہ اور رقیہ غالباً موصوف سے سہو ہو گیا یا اپنے عقیدہ شیعہ کی بناء پر یہ بات کہی ہے تفصیل کے لئے دیکھئے دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۵/۹۱ و متعلق حوالا جات

زابد القادری خاتون جنت ص ۱۹ ابن سعد طبقات ۸، ۱۱، ۱۷ مطبوعہ زخاؤ، زرقانی۔ شرح مواہب ۳/۱۰۳ مصر سنہ ۱۳۲۶ھ

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کی پیدائش کے سلسلے میں دیکھئے۔ ابن ہشام سیرۃ الرسول ۱/۲۰۶ طبع محی الدین عبد الحمید۔ ابن اسیر اسد الغابہ ۵/۵۱۹ مصر ۱۲۸ھ۔ چودہ ستارے ۹۱۔ ۸۔ محقق بخشائش۔ مختصر سوانح حیات اہل بیت ۵۶ مطبوعہ سنہ ۱۴۰۵۔ ۹۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (اردو) ۵، ۹۱

حوالہ مذکور ۵

ابن سعد طبقات ۸/۱۱، ۱۷، مطبوعہ زخاؤ، زرقانی شرح مواہب ۳/۱۰۳ مصر ۱۳۲۶ھ رسول اکرم ﷺ کی بیٹیوں کی پیدائش کے سنن کے سلسلے میں دیکھئے۔ ابن ہشام سیرۃ الرسول ۱/۲۰۶ طبع محی الدین عبد الحمید ابن اثیر اسد الغابہ ۵/۵۱۹ مصر ۱۲۸ھ

چودہ ستارے ص ۹۱ ۷

محقق بخشائش مختصر سوانح حیات اہل بیت ص ۵۶ مطبوعہ ۱۴۰۵ھ ۸

دائرۃ المعارف الاسلامیہ (اردو) ۵/۹۱ ۹

ابن سعد طبقات ۸/۱۱ یعقوبی تاریخ ۲/۲۲ زرقانی شرح المواہب ۳/۱۰۳ ۱۰

- ۱۱ بقول ابن کثیر شادی کے وقت حضرت فاطمہ کی عمر پندرہ برس پانچ ماہ تھی اور بعض دیگر روایتوں کے مطابق ان کی عمر اٹھارہ انیس برس تھی۔ اس نکاح کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا اس کے لئے دیکھیے سیوطی، الآسنی المصنوعہ ۲۰۶/۱، مصر ۱۳۱۷ھ البدایہ والنہایہ ۳۳۲/۶
- ۱۲ ابن حجر الاصابہ ۱۵۸/۸، ابن ملک، مبارق الازہار ۱/۱۵۸، استنبول ۱۳۲۸ھ السہودی، خلاصۃ الوفا ص ۲ طبع مکہ مکرمہ ۱۳۱۶ھ عمر رضا اسلام تاریخی (حضرت علی) ۲۴/۹ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۹۱/۵
- ۱۳ ابن ماجہ سنن ۱۳۹/۱
- ۱۴ ذہبی، سیر اعلام النبلاء ۹۳/۲
- ۱۵ ابن سعد طبقات ۱۸/۸، ابن عبد البر ۳۸۰/۲
- ۱۶ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ۳۳۲/۶، ابن حزم، جوامع السیرۃ ص ۴۰
- ۱۷ دیکھیے طحاوی، حاشیہ علی مراقع الفلاح ص ۳۱۳ مصر ۱۳۰۴ھ کامل مراش، ترجمہ زبدۃ البخاری ص ۳۳۳، ابن کثیر البدایہ ۳۳۳/۶
- ۱۸ ابن سعد ز ۱۹/۸
- ۱۹ تفصیل کے لئے دیکھیے، ایوب صبری پاشا، مراۃ مدینہ ۹۷۶/۲
- ۲۰ ابن کثیر البدایہ ۳۳۲/۶
- ۲۱ ذہبی، سیر اعلام النبلاء ۹۰/۲
- ۲۲ حوالہ مذکور
- ۲۳ ترمذی ۲۴۷/۲
- ۲۴ واقدی ص ۱۲۵ بخاری، غزوہ احد، مسلم ۱۷۸/۵
- ۲۵ علی فہمی، حسن الصحابہ ص ۱۲۶، استنبول ۱۳۲۸ھ

- ۲۶ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۵۶۹/۱۰
- ۲۷ ایضاً.....
- ۲۸ زینب الکبریٰ ص ۱۲۲۔
- ۲۹ ۲۹ ایضاً
- ۳۰ ان حضرات میں حضرت علی کی اولاد باقی رہی اور زینب کہلائی۔ عون اکبر اور محمد دو فرزند کربلا میں شہید ہوئے۔ ص ۳۶ عمدة الطالب
- ۳۱ منتخب التواریخ ۹۴۔ زینب الکبریٰ ۱۲۶۔ الاحتجاج ۱۵۸، جہاد حسینی ص ۵۱
- ۳۲ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ النقدی۔ زینب الکبریٰ مطبوعہ نجف۔ محمد عباس زیدی، کربلا کی شیردل خاتون، لاہور ۱۹۶۱ء اسد علی صدیقہ صغریٰ۔ لاہور منتخب التواریخ، طہران ۱۳۸۷ء سید محمد جعفر زیدی، ثانیہ زہرا، لاہور مرتضیٰ حسین فاضل، جہاد حسینی، کراچی ۱۹۵۷ء، دائرۃ ۵۶۸/۱۰۔ ۵۷۰
- ۳۳ صالحہ عابد حسین خواتین کربلا ص ۲۵۳-۲۵۴
- ۳۶ صالحہ عابد حسین خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں ص ۲۵۶
- ۳۷ حوالہ سابق ص ۳۳۳
- ۳۸ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ صالحہ عابد حسین خواتین کربلا ص ۳۳۲-۳۳۵
- ۳۹ مولانا ابوالکلام آزاد، شہید اعظم ص ۳۰-۳۹ تاج پبلیشر دہلی ۱۹۷۷ء
- ۴۰ حوالہ سابق ص ۵۱
- ۴۱ آزاد، شہید اعظم ص ۵۲-۵۳
- ۴۲ اس دوران یہ عرض کر دوں کہ آپ کا نام بطام آپ کی خالہ ام کلثوم بنت رسول ﷺ کے نام پر رکھا گیا۔ آپ کی بھتیجی یعنی حضرت زینب کبریٰ کی صاحبزادی کا نام بھی ام کلثوم تھا۔ سال ولادت مختلف فیہ ہے اور اس سلسلہ میں کوئی قطعی بات کہنا مشکل ہے۔ ابن عبد البر الاستیعاب ۴/۴۶۸
- ۴۳ جب ام کلثوم سن بلوغ کو پہنچی تو حضرت عمر سے چالیس ہزار درہم میں نکاح ہوا۔ حضرت ام کلثوم

سے حضرت عمر کے دو بیٹے پیدا ہوئے بڑے صاحبزادے جن کا نام زید تھا چھوٹی صاحبزادی جن کا نام رقیہ تھا جب حضرت عمر نے ۱۷-۱۸/ ذی الحجہ ۲۳ھ میں شہید ہوئے تو پھر حضرت ام کلثوم کا نکاح عون ابن جعفر بن ابی طالب سے ہو گیا۔ ان کی وفات پر محمد بن جعفر سے نکاح ہوا وہ بھی شہادت پائے تو عبد اللہ بن جعفر سے شادی ہوئی۔ حضرت عمر کے ساتھ سیدہ کے نکاح کو سنی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت ام کلثوم کی پہلی شادی عون بن جعفر بن ابی طالب سے ہوئی۔ سیدہ نے اپنے والد ماجد حضرت علی سے بعض روایات بھی نقل کی ہیں۔ تفصیل کے دیکھیے ابن حجر الاصابہ ۲/ ۶۲۸، ابن عبد البر الاستیعاب ۴/ ۴۶۷، الطبری یاد اواشاریہ، شبلی الفاروق ابن اثیر، اسد الغابہ، ابن حزم، جوامع السیرۃ قاضی سلمان منصور پوری، رحمۃ اللعالمین جلد دوم

- ۲۳ ابن حجر الاصابہ فی تمییز الصحابہ ۱/ ۱۱۳ کافی، کتاب الحجۃ، احوال امام حسین طبری الکامل ۲/ ۳۲۵
- ۲۵ علی نقی شہید انسانیت ص ۲۸۰
- ۲۶ آغا مہدی بکیہ بنت حسین
- ۲۴ ابن خلکان ۱/ ۲۱۱
- ۲۷ تاریخ التوارخ
- ۲۸ تفصیل کے لئے دیکھیے صالحہ عابد حسین خواتین کر بلا کلام انیس کے آئینہ میں ص ۱۴۲-۱۸۲

باب چہارم

میرانیس کے مرثیوں میں خواتین

کی کردار نگاری

- ☆ ان کے مرثیہ کی مناسبت سے
- ☆ ان کے سماجی رشتوں کے حوالے سے
- ☆ ان کی اپنی فطرت اور مزاج کے حوالے سے

باب چہارم

میرانیس کے مرثیوں میں خواتین کی کردار نگاری

مرثیے کا رواج ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ عربی زبان میں مرثیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جیسے انگریزی میں elagy کہتے ہیں اور بڑے سے بڑے انگریزی شعراء نے اس صنف مرثیہ پر طبع آزمائی کی ہے خاص طور سے ٹائنسن Tennyson کا نام سرفہرست ہے رزمیہ نظم کا رواج انگریزی شاعری میں بہت زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ یہ فن انگریزی ادب پر اور اسکے ساتھ ساتھ دنیائے ادب پر چھا گیا ہے اسکو انگریزی زبان میں epics کہتے ہیں۔ اس میں کسی شخص کی بہادری اور اعلیٰ کارناموں کا بیان نہایت بہتر پیرائے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ساتھ سنجیدگی اور متانت کے اعلیٰ اوصاف ہوتے ہیں بلکہ زیادہ تر نقادوں کا خیال ہے کہ اس میں جنگ و جدل اور خون ریزی کی باتیں نہیں کی جاتی بلکہ سخاوت و شجاعت پاکیزہ خیالات، جنگی کارنامہ، بلند کردار، اچھے معاملات اور انسانی ہمدردی اس کے اہم اجزاء ہوتے ہیں۔ جنہیں نظم کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی پہلو، نصیحت اور عقائد کا بھی اس صنف نظم سے گہرا تعلق ہے لیکن ایک اہم پہلو اسکا یہ بھی ہے کہ عام طور پر اسکا تعلق عظیم الشان اور تاریخی واقعات سے بھی ہوتا ہے۔ اور معمولی انسانوں کی افعال اور کردار اسکے بنیادی موضوع ہوتے ہیں، یعنی اہل قلم نے بہادری اور محیر القول کارناموں کا بیان بھی رزمیہ نظم میں شامل کیا ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ رزمیہ نظم کی جان اہم تاریخی واقعات اور مافوق البشر اشخاص کا ذکر رزمیہ نظم کی پہچان ہے۔ جیسے انگریزی میں Tliad and Odyssey ایک اہم رزمیہ نظم ہے۔

جس کا موجد Homen ایک نابینا شاعر تھا جس نے اس نظم کو بہت مشہور کیا، شاہ نامہ وغیرہ میں بھی ایسی چھلک ملتی ہے۔ کیونکہ میر انیس نے اپنے مرثیے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار حوصلہ اور صبر و رضا جو اہلیت کے اندر اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا تھا اس کو میر انیس نے نہایت ہی شائستگی، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انیس نے ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے علماء اور نقاد نے ان کے مرثیہ کو رزمیہ نظم کے درجہ میں جگہ دی ہے اور جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے اس میں بھی مرثیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے خاص کر وہ مرثیہ جو شاہی دربار میں امراؤ اور سلاطین کے لوگوں کے رزم میں جو مرثیے کہے گئے انہیں عوام میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ خاص طور سے عباسی دور کے شاعر متنبی کا مرثیہ جو اس نے سیف الدولہ کی بہن کے مرنے پر لکھا تھا۔ اس کا چرچا عربی زبان میں بہت زور و شور سے کیا گیا ہے۔ اس طرح اگر جاہلی دور سے لیکر جدید دور تک کہا جائے تو مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء کی ایک طویل فہرست ملتی ہے اور یہی حال فارسی شاعری میں بھی کم و بیش موجود ہے۔ جہاں تک فارسی میں مرثیے کا تعلق ہے تو اس میں اتنی زیادہ تعداد مرثیہ گو شعراء کی نہیں ہے جتنی کہ عربی میں ہے بلکہ فارسی کے مشہور شعراء نے قصیدے پر زیادہ زور دیا ہے جہاں تک اس موضوع کا تعلق ہمارے اس مقالے اور اردو زبان سے ہے اس میں مرثیہ گو شعراء کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن اس فن کو بام عروج پر پہنچانے والے دواہم شعراء ہیں۔ انہوں نے اہلیت کے مرثیے میں اپنا ہم مقابل نہیں چھوڑا۔ دوسری چیز جو قابل ذکر ہے کہ مرثیے میں اور بہت سے اردو شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ خاص طور سے غالب کا مرثیہ اپنے بھتیجے کے نام ایک نادر مثال ہے۔ غالب کیونکہ اپنے ہم عصروں میں نہایت لائق و فائق اور سب سے اونچے مقام کے حامل تھے۔ اسی طرح سے ان کا مرثیہ اہم مقام کا حامل ہے۔ یونہی حالی نے غالب کا جو مرثیہ لکھا ہے اس کا مقام بھی اہم اور بے مثال ہے، جس میں والہانہ لگاؤ کا بیان زوردار انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ذاتی اور شخصی مرثیوں کو چھوڑ کر اہلیت کے مرثیوں کا جہاں تک تعلق ہے اس میں انیس کا کردار نمایاں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر انیس نے اہلیت کے مرثیوں میں جو مقام حاصل کیا وہ نہ کسی کو اس

سے پہلے ملا ہے اور نہ آنے والے دنوں میں اسکی توقع کی جاسکتی ہے تو غلط نہ ہوگا۔

۱ ”میر انیس نے مرثیہ کی صنف کو معراج کمال پر پہنچایا اس کا اعتراف ابتداء ہی سے سب نقاد اور صاحب ذوق حضرات کھلے دل سے کرتے آئے ہیں۔ اس سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ انہوں نے اردو شاعری کا درجہ بلند کیا اور زبان کا دامن معنوی اور لفظی جواہرات سے مالا مال کیا ہے۔ میر انیس کی شاعرانہ عظمت کا ثبوتی نے تعارف کرایا، حالی نے اعتراف کیا اور اس دور کے دوسرے متعدد لوگوں نے ان کے کلام کو سراہا۔ اور پھر آنے والے اس دور میں ان لوگوں کے علاوہ جنہوں نے انیس کے کسی نہ کسی پہلو پر لکھا، جس شخص نے انیس پر سب سے زیادہ تحقیق کی اور انکے کلام کی شعری اور فنی خوبیوں پر لکھا اور دنیا کے سامنے پیش کیا وہ سید مسعود حسین رضوی ادیب کی ذات ہے۔ آج کے ہندوستان میں انیس کی صد سالہ یادگار، منائی جا رہی ہے۔ بہت سے ناقد، مبصر، دانش ور، شاعر ادیب انیس پر لکھ رہے ہیں، ”میر انیس کے مرثیوں میں خواتین کا کردار“، اس موضوع کو میر انیس نے جس حسین پیرائے میں پیش کیا ہے اور داخلی اور ذہنی کیفیات کا جو خاکہ کھینچا ہے جس میں ایثار و قربانی کے بے نظیر مظاہرے بھی ہیں اور صبر و تسلیم و رضا کے نمونے بھی ہیں جسے تاریخ اسلامی کا قابل قدر سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔ انیس نے جس خوش اسلوبی سے جو عورت کا تصور پیش کیا ہے وہ بھی بے مثال اور نادر نمونہ ہے، کیونکہ انہوں نے خاندان رسالت کی پاک دامن اور محترم خواتین کے کردار کے جو نمونے پیش کئے ہیں اور خاندان رسالت کی خواتین کی جو ایک خاکہ کشی کی ہے اسکی مثال اب تک کسی مرثیہ گو کے یہاں اتنے حسین پیرائے میں نہیں ملتی ہے۔ خاندان رسالت کی محترم خواتین کے جو روپ دکھائے ہیں ان سے عورت کی پاک دامنی اور صبر و رضا کا عام تصور بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔

سیرت نگاری ادب کا ایک مشکل حصہ مانا جاتا ہے۔ اکثر سیرت نگار اصل موضوع سے ہٹ کر دوسری طرف بہہ جاتے ہیں لیکن میر انیس کی تحریروں میں انیس کے دادا میر حسن نے مثنوی ”سحر البیان“ میں اس قسم کی تصویر کشی کی ہے۔ لیکن انیس اس میدان میں ان سے آگے ہیں۔

۲ ”انیس جس فرد کی سیرت دکھاتے ہیں اسکی شخصیت اور درجہ کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں اس کی جذباتی

کشکش، نفسیاتی کیفیت، اس کے بات چیت کا انداز رکھ رکھاؤ ٹھیک ویسا ہی ہوتا ہے جیسے کردار کا ہونا چاہئے اور اس طرح ہر کردار کی انفرادیت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے وہ کردار امام حسین کا ہو، حضرت زینب یا پھر عباسؑ کا ہو یا علی اکبرؑ کا، عون اور محمدؑ کا ہو یا شہر بانوؑ اور زوجہ عباسؑ کا یا صغراؑ، سکینہؑ کا ہو ہر فرد انہیں بات چیت، احساسات اور ذہنی کیفیت کے بغیر نام سے بھی پہچانا جاسکتا ہے، میرا نیس نے اس طریقے سے حضرت زینبؑ کی سیرت میں روحانیت کے ساتھ ساتھ انسانی اور نسوانی جذبات کے مناسب امتزاج پیش کیا ہے، جو بڑا نازک کام ہے۔ اس کام کو میرا نیس نے نہایت ہی دل چسپ موڈ پر لا کر اور انہیں خداداد صلاحیتوں کو استعمال کر کے اور اتنے خوب صورت اور حسین انداز میں پیش کیا جو نہایت ہی دل کش اور محبوب انداز اختیار کر گیا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال نمونے کے طور پر پیش ہے۔

”امام حسینؑ کے بٹھلے بیٹے علی اکبرؑ کو پالنے کا سہرا ان کی پھوپھی کے سر ہے۔ جیسا کہ مرثیہ نگار لکھتے آئے ہیں کہ پھوپھی کو ان سے بے حد لگاؤ تھا۔ یہاں تک کہ پھوپھی نے اپنے بیٹوں کو بھیجتے پر قربان کرنے میں کوئی دریغ نہ کیا۔ کیونکہ علی اکبرؑ کو پھوپھی سے بے پناہ محبت تھی اور انکو یہ بھی علم تھا کہ وہ پھوپھی کے لاڈلے ہیں۔ جب میدان جنگ میں روانہ ہونے کے لئے رخصت چاہتے ہیں تو پھوپھی کے پاس جانے کی ہمت نہیں کرتے ہیں حالانکہ امام حسینؑ بیٹے سے پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ سب جانتے ہیں پھوپھی کو تمہاری چاہ ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ خیمہ میں جا کر اسکو رضا مند کجئے۔ مگر وہ پھوپھی سے اجازت لینے کے بہانے ماں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ ان سے اجازت مانگتے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر پھوپھی کو نہایت صدمہ ہوتا ہے۔

”اگر سے مجھ کو یہ نہ توقع تھی ہے غضب
اتنا نہیں خیال کہ ہے کون جاں بلب
اس گل نے ہائے میری ریافت بھلائی سب
نام خدا جواں ہوئے کیا ہم سے کام اب“

ہیں مجودن کے شوق میں رخصت کے دھیان میں
 سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں “ ۳
 ایک اور جگہ گلے شکوے کے دوران یہ بھی کہتی سنائی دیتی ہیں۔

”مالک اب اور ہو گئے کوئی ہوئے نہ ہم“

اس میں ”اور“ کی بلاغت قابل غور ہے

حضرت امام حسینؑ کو اپنی بیٹی سکینہؑ سے بے پناہ محبت اور رفاقت تھی۔ یوم عاشورہ کو جب مدینہ
 چھوڑنے کی نوبت آئی تو انکے دل پر غم کا دریا موج زن ہو گیا۔ اور جو بیٹی باپ کے سینے پر سر رکھ کر
 سوتی تھی آج اس کے سامنے جدائی کا منظر ہے۔ جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گی۔ جب بیٹی
 روتی ہے تو آپ فرماتے ہیں۔

”اچھی نہیں یہ بات نہ رویا کرو بی بی

پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی“

اس دردناک منظر کو میر انیس نے ایسے پیرائے میں پیش کیا ہے اور اس جدائی کے منظر کی تصویر کشی
 ایسے انداز میں کی ہے جو ایسے مؤثر اور اطمینان گداز منظر کا نمونہ ہے۔

۴ کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں

مجبور ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کے جائیں

تم پاؤ نہ ہم کو نہ تمہیں ہم کہیں پائیں

بی بی کہو پھر چھاتی پہ کس طرح سلائیں

جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی

برسوں جو رہیں ساتھ وہ چھوٹ جاتے ہیں بی بی“ ۵

اور پھر باتوں باتوں میں یہ کہہ جاتے ہیں۔
 ”راحت کے دن گزر گئے اب فصل اور ہے
 اب یوں صبر کرو جو یتیموں کا دور ہے“
 تو معصوم بچی کا بھولے پن سے یہ پوچھنا پڑھنے سننے والے کے دل کے پار ہو جاتا ہے۔
 ”بتلائیے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام“
 اس سوال سے باپ کے دل پر کیا بیت گئی اس کی ذرا سی جھلک ان شعروں میں مل جائے گی۔
 ”آنکھوں سے خون کہا کہ کہنے لگے امام“ کھل جائے گا یہ دردِ عالم تم پہ تباہ شام“
 ”بی بی نہ پوچھو کچھ معصومیتِ عظیم ہے
 مر جائے جس کا باپ وہ بچہ یتیم ہے“
 میرا نیس نے اپنے مرثیے میں خواتین کے کردار پر جو روشنی ڈالی ہے اور انکی گونا گوں خوبیوں کو
 جس انداز میں بیان کیا ہے وہ ایک بے مثال اور گراں قدر سرمایہ ہے حضرت زینبؓ کی صفات اور
 خوبیوں پر میر صاحب مرحوم نے خود روشنی ڈالی ہے۔ وہ بھی ایک بے مثال اور نایاب کارناموں میں سے
 ایک ہے جیسا کہ اس سے قبل حضرت زینبؓ کے کردار پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس رزم میں ڈاکٹر
 اکبر حیدری کی رائے اور انکا اپنا موقف مندرجہ ذیل ہے۔
 ۵۔ ”عورتوں میں میرا نیس نے حضرت زینبؓ کے بلند کردار کی خوبیاں دکھائی ہیں۔ مثلاً جب
 انہوں نے اپنے بچوں کے جہاد پر جانے کے واسطے امام حسینؓ سے اجازت مانگی یا کہ جب وہ لڑے
 ہوئے حسینی قافلہ کی حفاظت کرتی ہوئی مختلف مقامات پر گئیں یا کہ جب انہوں نے دربار ابن زیاد
 یا دربار یزید میں خطبہ پڑھا تو انہوں نے ہر آفت، مصیبت، قہر، ظلم، ستم اور طرح طرح کی دیگر تکلیفوں کو
 نہایت ہی صبر و استقلال سے برداشت کیا۔ کربلا کی جنگ میں انہوں نے اپنے بھائی، عزیزوں اور
 بچوں کی لاشوں کو گھوڑوں کے سموں سے پامال ہوتے دیکھا۔ یہ الم ناک واقعہ دیکھ کر حرف شکایت لب پر

نہ لائیں، میرا نیس نے ”جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدائی کی فوج“ کے مرثیہ میں حضرت زینب کے بلند اخلاق کردار کو جس خوبی و کمال سے پیش کیا ہے اسکی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ جو کردار اس مرثیہ میں انکا دکھلایا گیا ہے اسکی عشر عشر کسی رزم نگار کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ آغاز جنگ سے قبل وہ اپنے کم سن بچوں عون و محمدؑ کو سمجھاتی ہیں کہ تم دونوں کی عمریں ابھی چھوٹی ہیں لہذا تم کو منصب علمبرداری ملنا قبل از وقت ہے وہ چاہتی ہیں کہ علم حضرت عباسؑ کے سپرد کیا جائے۔ بچوں نے تھوڑی دیر کے لئے ضد کی اور کہا کہ ہم علم پانے کے مستحق ہیں“ ۵

شیکسپیر کا ایک جملہ ہے اس دنیا میں ماں کا کوئی بدل نہیں۔ دنیا میں ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ فطری محبت ہوتی ہے اور ایک ماں ہی ایک ایسی شخصیت ہے جو اپنی اولاد کو تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی ہے، لیکن حضرت زینبؑ نے اپنے بچوں کو بھوکا اور پیاسا شہید کر دیا اسکا مقصد صرف بھائی کو تکلیف اور رنجش سے بچانا تھا اور خاندانی وقار کو بلند دکھانا تھا۔ ایک مشہور بات ہے بھائی اور بہن میں بڑی والہانہ محبت اور عقیدت ہوتی ہے اور بھائی اور بہن کے درمیان والہانہ عقیدت کو اور پاک محبت کو برقرار رکھنے کے لئے بہن نے جو قربانی بھائی کی محبت میں دی ہے وہ تاریخ کے صفحات اور دنیا والوں کے لئے مثال بن کر قائم اور دائم رہے گی۔ جیسا کہ مانا جاتا ہے اولاد سے بڑھ کر ماں کے لئے دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے لیکن حضرت زینبؑ نے اس مثال کو انوکھا ثابت کر دیا۔ جب عون و محمدؑ امام حسینؑ کے پاس جنگ میں شرکت کے لئے اجازت مانگئے آئے تو حضرت حسینؑ نے حضرت زینبؑ کی طرف اشارہ کیا تو حضرت زینبؑ کے اصرار پر انہیں اجازت مل گئی اور یہی حال پورے خاندان کا بڑوں سے لیکر چھوٹوں کا تھا۔ سب جنگ میں شریک ہونے کے لئے پریشان تھے اور ساتھ ساتھ عون و محمدؑ علم اٹھانے کے لئے پریشان تھے لیکن انہیں اسکی اجازت نہیں ملی۔

۶ ”سب خوش تھے خیمہ شہ ذی جاہ میں مگر

چین بر جہیں تھے زینب ناشاد کے پسر

نہ جانب علم تھی نہ ماں کی طرف نظر
 آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر
 اس طرح تھا عرق رخ پر آب و تاب پر
 جیسے پڑے ہوں قطرہ شبنم گلاب پر
 پھر کر ادھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر
 سمجھی علم نہ ملنے سے بیدل ہیں یہ قمر
 ہٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا ادھر
 آئے عقب سے شہ کے سعادت نشان پر

بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں

قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اداس ہیں“۶

میر انیس نے اس دردناک منظر اور چھوٹوں و بڑوں کے جذبات کی تصویر کشی جس آب و تاب سے کی ہے اس سے بچوں کے جذبات اور ان کی قربانی اور ایثار کی ایک جیتی جاگتی تصویر ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس ضمن میں تہلی مرحوم کا ایک جملہ ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ جس میں انہوں نے شاعر اور مصور کے درمیان فرق واضح کیا ہے، تہلی کا کہنا کہ شاعر اور مصور میں یہ فرق ہے کہ مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچتا ہے اور شاعر مادی اور غیر مادی دونوں کی تصویر پیش کرتا ہے۔ یہاں غیر مادی اشیاء کی تصویر کشی میر انیس نے بڑے واضح انداز میں کی ہے اور وہ بھائی کی محبت اور بچوں کی قربانی کی واضح تصویر پیش کی ہے۔

”جب مرچکے زینب کے پسر موج ستم میں مطلع دوم اور گلشن ہستی سے گئے باغ ارم میں
 تاریک جہاں تھا نظیر شاہ امم میں زینب نے برا حال کہا بیٹوں کے غم میں
 چلائی کی دولت میری سب لٹ گئی لوگو
 پردیس میں فرزندوں سے میں چھٹ گئی لوگو

ان باتوں پہ زینب کی حرم کرتے تھے ماتم میدان میں مبارز طلبی کرتے تھے ظالم
کچھ مشورہ تھا اکبر و عباس میں باہم قاسم کا ارادہ تھا کہ لیں دن کی رضا ہم
پر شدت گریہ سے نہ بارا تھا سخن کا
منہ ماں کا کبھی دیکھتے تھے گاہ دلہن کا“ بے

یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ حضرت زینبؓ نے اپنے بچوں کی حسن تربیت اتنی محنت اور
خلوص کے ساتھ کی اور کس طرح سے انکے اندر حسن خلق کا جذبہ جگایا اور انکے ساتھ ساری تربیت کو اس
طرح ڈھالتا کہ وہ حضرت زینبؓ کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہیں۔ اس سے حضرت زینبؓ کے خیالات کی
بلندی کا اظہار ہوتا ہے اور جب عون و محمدؓ کو علم اٹھانے کے لئے اجازت نہیں ملی تو اس بات پر وہ راضی
برضا ہو گئیں اور جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالی جس سے ظاہر ہو کہ بچوں کو
انکی منشاء پوری نہ ہونے سے انکو ملال اور ادنیٰ سی پریشانی ہے حتیٰ کہ عون و محمدؓ کے والدین کو بھی اس
بات کا علم نہیں ہوا کہ انکے بچوں کی خواہش پوری نہ کرنے سے حضرت حسینؓ مجبور رہے۔ اس کا مقصد یہ تھا
کہ سب کی توجہ جنگ کی طرف رہے اس کے سوا دوسری طرف مرکوز نہ ہو۔ ساتھ ساتھ انکو حضرت حسینؓ پر
پورا بھروسہ تھا اور انکے ہر فیصلے کو تسلیم کرنا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ انکا یہ بھی ماننا تھا کہ حضرت حسینؓ کو پورا حق
ہے جس کو جو عہدہ چاہیں دیں۔ اس میں کسی کو مداخلت کی ضرورت نہیں۔ یا وہ بچوں کو سمجھا بجھا کر اپنا
موقف سمجھا دیں، چونکہ اور بچوں نے ان سے اتفاق کیا تو بچوں سے کہا کہ صاحب علم کو مبارک باد ہے
تاکہ بچوں کے دل میں علم نہ پانے کا ذرا بھی ملال نہ رہے۔ اس بات کو نہایت ہی مدلل اور مکمل انداز
میں پیش کرنا ہے کہ میر انیس کی مرثیہ نگاری میں عورتوں کا کیا کردار ہے؟ اس کردار کو میر انیس نے بڑے
ہی مکمل اور واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ میر انیس کا کمال ہے جس میں اکثر ادباء ناکام رہے۔ اور
لوگوں کا خیال ہے کہ شاعر نے ایک عورت کا جو مکمل کردار پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اس ضمن میں یہ بات یہاں پیش کرنا ضروری ہے مصوٰر غم علامہ راشد خیرتی نے اپنی کتاب ’سیدہ

کے لال میں، واقعات کر بلا کو بہت مفصل انداز میں قلم بند کیا ہے۔ حتیٰ کہ کہیں کہیں تاریخی پہلو کو نظر انداز کر کے اپنی رائے پیش کی ہے اور جو کچھ دلائل پیش کئے ہیں وہ عقل سے بالاتر ہیں یا باوجود ان کمیوں کے واقعات کو پیش کرنے کا ڈھنگ بہت نرالا ہے اور اکثر انہیں چیزوں کو زیادہ میرا نیس نے نظم کی شکل میں پیش کیا ہے۔

جب حضرت زینبؓ نے اپنے دونوں بچوں کو جنگ کے لئے تیار کر لیا اور اسلحہ سے لیس کیا اور انکی میانوں میں تلوار رکھ دیں۔ اور بچوں کو نصیحت کی کہ دشمن کا مقابلہ بہادری کے ساتھ کرنا استقامت اور عزیمت کو اپنا راستہ بنانا تکلیف اور مصیبت کو برداشت کرنا اور پیاس کے وقت پانی کا خیال نہ کرنا جیسا کہ معلوم ہے کہ یزیدی فوجوں نے دریا پر قبضہ کر رکھا تھا اہلبیت ایک قطرے پانی کو ترستے رہ گئے بھوکا پیاسا رہ کر جنگ لڑنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے لیکن پہلی نصیحت یہ ہوتی ہے کہ پانی کا خیال دل میں نہ لانا۔ جب حضرت حسینؓ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں یہ دونوں بچے کم سن ہیں نا تجربہ کار ہیں۔ یزیدی فوج کے ہاتھوں اپنی جان سے محروم ہو جائیں گے۔ حضرت زینبؓ نے خوشی سے فرمایا میرے پاس دوسری کوئی دولت ہے نہیں جو آپ کو پیش کر سکوں جو کچھ ہے وہ آپ پر نچھاور ہے اور بچوں کی قربانی دینا وہ اپنے آپ میں خوشی اور فخر سمجھتی ہے۔ اس میں ثابت قدمی اور استقلال کا کتنا بڑا دخل ہے یہ ایک عظیم الشان قربانی تھی۔ جس کو حضرت زینبؓ نے پیش کیا اور جو ثابت قدمی اور عزیمت کا مزاج جو انکی طبیعت میں پوشیدہ تھیں، اسکا اظہار لفظوں میں کیا۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ حضرت حسینؓ نے یہ فرمایا کہ نو نہال اپنے ہاتھ سے جان نہ کھو بیٹھے۔ اس کے باوجود حضرت زینبؓ پیچھے نہ ہٹیں جس کا بیان مندرجہ ذیل بندوں میں کیا گیا ہے۔

۸ ”بنت علی نے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کر

رکھتی نہیں کچھ اور میں یا شاہ بحر و بر

اک جان ہے بس اور یہ دو پارہ جگر

مایہ میری یہی، یہی دولت یہی ہے زر

پالا ہو جس نے اسکا نہ کچھ حق ادا کروں
 انکو بچاؤں گر تو پھر کسے کو فدا کروں ؟“ ۸
 میرا نیس کا ایک شعر جس کے اندر انہوں نے زینب کی محبت اور انکے دلی لگاؤں کا ایک بے
 مثال نمونہ پیش کیا ہے۔

”پیدا ہوئیں ہوں اشک بہانے کے واسطے

رہ جاؤں گی میں قید میں جانے کے واسطے“

جب زینبؓ نے بچوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر امام حسینؑ اس فیصلہ کو قبول
 کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جس کی وجہ محض یہ تھی کہ بچے نا تجربہ کار ہیں۔ دشمنوں کے تیروں کے نشانے
 بن جائیں گے۔ لیکن زینبؓ کے اصرار پر انکے اس فیصلہ کو قبول کر لیا گیا۔ امام حسینؑ نے یہ بھی کہا کہ
 زینب ایک فرزند کو بچا لو مگر زینب اس کے لئے بھی تیار نہ ہوئیں۔ یہاں انیسؓ نے حضرت زینبؓ کے
 اخلاق و عادات بے لوث محبت اور بھائی کی ہمدردی کی جیتی جاگتی تصویر کشی، اسلوب اور پیرائے کے
 استعمال سے جو حسن اور خوبی کلام میں آئی ہیں۔ جب انیسؓ حضرت زینبؓ اور حسینؑ کے درمیان گفتگو کو
 قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں تو اس میں فصاحت اور ایک روح رواں کی تصویر نظر آتی ہے، لیکن
 نسوانی عنصر برقرار رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں اسکی وضاحت اس طرح سے کی ہے۔

۹” بنت علی نے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کر

رکھتی نہیں کچھ اور میں یا شاہ بحر و بر

اک جان ہے بس اور یہ دو پارہ ° جگر

مایہ میری یہی، یہی دولت یہی ہے زر

پالا ہو جس نے اسکا نہ کچھ حق ادا کروں

انکو بچاؤں گر تو پھر کسے کو فدا کروں ؟“ ۹

اس میں بلاغت کا ایک نقطہ یہ نظر آتا ہے کہ اپنی ذات کو چھوڑ کر اپنے بچوں کو بلند و بالا بنانے کے لئے بچوں کی عظمت اور بہادری پر یقین کا اظہار فرماتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ملے جو اس دشوار منزل کو اتنی آسانی اور خوش اسلوبی سے طے کر سکے۔

۱۰۔ ”انیس کے زمانہ میں صنف مرعاة النظر کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور میر انیس بھی اپنے آپ کو اس سے نہیں بچا سکے لیکن اس صنف کو کمال حد تک پیش نہ کر سکے اور اس گورک دھندے میں الجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جعفر تیار کا روب اور دبدبہ اور شوکت و جلاں دیکھایا گیا۔ اور حضرت علیؑ کی صرف چال ڈھال کو بھی عون و محمد سے نہیں بلکہ انکے تیغ و تبر سے متعلق ہے زوف نظم کی ایک افسوس ناک مثال یہ ہے۔ یہی حال حضرت زینب کی خوبیاں گناتے ہوئے بھی میر انیس کچھ دوسری طرف مڑ گئے جو انکی نظم میں ایک معمولی سی کمی کا سبب بن گیا۔“ ۱۱

میر انیس نے بھائی بہن کے رشتوں کو بیان کرتے ہوئے حضرت زینبؑ کی مختلف صفات و نکات پر گہری روشنی ڈالی ہے اور مختلف انداز اور مختلف پہلوؤں سے بھائی بہن کے مضبوط رشتوں کو بیان کرنے میں جو انداز اختیار کیا وہ بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔ میر انیس کے مرثیے میں عورتوں کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اکبر حیدری نے ایک عنوان ”عورت اپنے بھائی بہن کے احسان کا بدلہ اپنے بچوں کی قربانی سے دیتی ہے“

اس ضمن میں اس سے پہلے ایک بند میں نے قلم بند کیا ہے۔ جس میں حضرت زینبؑ کی عاجزی و انکساری اور بھائی سے بے لوث محبت کی ایک تصویر ہے۔ بقول ڈاکٹر اکبر حیدری کہ زینب نے اپنے بچوں کی قربانی دیکر اپنے بھائی کے احسانوں کا بدلہ چکایا ہے، اکبر حیدری کا یہ خیال حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ بھائی اور بہن کے معاملات بے لوث ہوتے ہیں اور دونوں کا تعلق ایک دوسرے سے خونی رشتے پر مبنی ہوتا ہے اور جہاں تک اہلیت کا تعلق ہے انکے یہاں احسان کے بدلے کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ اہلیت تو خود ہمدردی، ہمت، محبت اور قوت دنیا میں خلق محمدی کا نمونہ ہوتے ہیں، جو آخری وقت تک

زندہ جاوید رہیں گے۔ اور یہاں یہ کہنا کہ احسانات کا بدلہ یہ بڑی نامناسب بات ہے بلکہ اگر عنوان کو اس انداز میں پیش کیا جاتا کہ ”بھائی اور بہن کے درمیان بے مثال قربانی کا جذبہ“ تو شاید یہ زیادہ مناسب موضوع ہوتا ہے۔ ویسے ڈاکٹر اکبر حیدری ایک باصلاحیت اور پڑھے لکھے لوگوں میں سے ہیں اور انکی کتاب ’میر انیس‘ بحیثیت رزمیہ شاعر اردو زبان کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ یہاں مقصد ڈاکٹر حیدری کے اوپر تنقید نہیں بلکہ یہ میر اپنا ذاتی خیال ہے۔ ویسے جب حضرت حسینؑ نے زینبؑ کے بچوں کو جنگ میں لے جانے سے منع کیا لیکن بہن کے اصرار پر انکی بات مان لی تو یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ زینبؑ نے اپنے بچوں کو جنگ میں بھیجنے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر لیا تھا کہ یہ میدان جنگ سے واپس نہیں آئیں گے۔ جس کی تصویر کشی میر صاحب نے مندرجہ ذیل اشعار میں کی ہے

”نودس برس کے ہیں ابھی بچوں کے کیا ہیں سن
راتین یہ غفلتوں کی ہیں اور کھیلنے کے دن
یہ تو وہ معرکہ ہیں کہ مضطرب من
لیکن کنیز انکی طرف سے ہے مطمئن

گھوڑے اڑا اڑا کے جو فوجوں پہ جائیں گے

اتنا میں جانتی ہوں کہ جیتے نہ آئیں گے“

مندرجہ بالا اشعار میں حضرت زینبؑ کی یہ دلی آرزو تھی کہ انکے بچے امام کے لئے قربان ہو جائیں۔ یہ ایک بے مثال قربانی تھی جس کو زینبؑ نے بہن کی شکل میں بھائی کے لئے پیش کی۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو اب تک سامنے نہیں آیا۔ جہاں ایک بہن نے بھائی کے لئے گھربار اور اولاد کو اپنے بھائی کی سلامتی کے لئے قربان کر دیا۔ اور قابل غور اور قابل عبرت بات یہ ہے ایک بہن نے اپنی عمر بھر کی کمائی کو اپنے ہاتھوں میدان جنگ میں ایک لشکر کے سامنے موت کے حوالے کر دیا۔ جس کی تصویر کشی اچھے پیرائے میں کی ہے۔

۱۲ ”زینب نے عرض کی کہ مجھے ہے یہ آرزو

دونوں نثار آپ پہ ہوں میرے روبرو

بچ جائے جان آپکی یا شاہ نیک خو

میں طالب ثواب یہ خواہان آبرو

بہتر ہے دونوں بیٹوں کی گرگوار ہوں

میں بھی جناب فاطمہ کی ورثہ دار ہوں“ ۱۲

حضرت امام حسینؑ یہ جانتے ہوئے کہ جناب زینبؑ کو بیٹوں کی جدائی کا زبردست صدمہ ہوگا اور وہ اسی لئے اپنے بھانجوں کو جنگ میں بھیجنے کے لئے منع کر رہے تھے۔ مگر بہن کی محبت دیکھئے کہ انہوں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ بھائی کے قدموں پر بیٹوں کو نچھاور کر دے۔ ”میں چاہتی ہوں دونوں کا مرنا بھی ساتھ ہو“ اور بچوں کو جنگ میں بھیجنے کا سب سے بڑا راستہ یوں ہموار ہو کہ حضرت زینبؑ نے یہ عرض کیا کہ بچوں کے باپ آپ کی اس عظیم مہم میں بیماری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ اگر ہوتے تو سب سے پہلے جنگ میں شریک ہوتے اور سب سے پہلے اپنی قربانی دینے میں خوشی محسوس کرتے۔ میرے سامنے اب یہ مجبوری ہے کہ میرے شوہر اب یہاں موجود نہیں ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک باپ کے بدلے اور دوسرے ماں کے بدلے آپ کے لئے اپنے بچوں کو قربان کر دوں۔ بچوں کی قربانی دینے میں جناب زینبؑ نے فخر محسوس کیا اور اپنا فرض سمجھ کر اس کام کو انجام دیا جس سے انہیں بے حد خوشی اور دلی اطمینان ہوا۔ حضرت زینبؑ کی اس قربانی اور اس پر مسرت اور اطمینان قلبی جس کی تصویر کشی میرا نیس نے مندرجہ ذیل بند میں کی ہے۔

۱۳ ”باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہ نامدار

کرتا قدم پہ سر کو تصدق بہ افتخار

ایک ان کے بدلے آپ کے قدموں پہ ہو نثار

میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جان زار

ان پر ہمارا حق ہے تو ہم پر حق آپکا
یہ بھی تو کچھ ادا کریں حق اپنے باپ کا“ ۱۳

عقبتِ پاک دامنہ اور وقارِ عورت کا ایک اہم کردار ہے اور یہی چیز عورت کو اونچا مقام اور عزت بخشی ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جن خواتین نے عزت اور وقار کو اپنایا اور کسی حال میں اس پر آنچ نہ آنے دی وہ ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں اور سماج میں بلند و بالا ہو کر زندگی کے یام پورے کئے۔ تاریخ کے اوراق اور سماج میں ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ خود ہماری پاک و مقدس کتاب قرآن کریم میں زور دیکر کہا گیا ہے کہ خواتین کو اپنی عزت و آبرو کو سنبھال کر رکھنا چاہئے۔ قرآن میں صرف ایک ہی آیت میں خواتین کو سماج میں کیسے رہنا چاہئے اور اپنوں اور غیروں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے اسکی پوری وضاحت کردی گئی ہے۔ یہاں تک کہ پوشاک کس طرح کی ہو اس کی بھی وضاحت کردی گئی ہے اور جتنی باتیں قرآن پاک میں کہی گئی ہیں اسکا خاص مطلب خواتین کو اپنے وقار کو بلند کرنا اور عزت اور پاک دامنہ کو قائم رکھنا اہم ترین مقصد ہے۔

یہاں وقار کو قائم رکھنے کے دو پہلو نظر آتے ہیں۔ ایک عام سماج میں اور دوسرا اپنے گھر میں بھی عورت کے اوپر گھر کے ہر فرد کے لئے الگ الگ طور پر سلوک اور کردار کو واضح کر دیا گیا ہے کیونکہ عورت اپنے کردار کو محفوظ رکھتی ہے اور خاص طور سے جہاں شوہر اور بیوی کا معاملہ ہوتا ہے وہاں وقار برقرار رکھنے کی ایک اور شکل بن جاتی ہے جو خانگی زندگی کی اہم شکل ہوتی ہے کیونکہ شوہر اور بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں اور دونوں طرف کچھ فرائض اور واجبات ہوتے ہیں۔ جہاں دونوں طرف اسکی پابندی ہوتی ہے وہاں خانگی زندگی بڑے خوش اور خرم انداز میں گزرتی ہے اور زندگی جب خوش اور خرم ہوتی ہے تو اس وقار کو قائم رکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ وہی زندگی پر وقار اور پر لطف ہوتی ہے۔

میر انیس نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ عورت ہمیشہ اپنے شوہر کا وقار قائم رکھتی ہے۔ جس کی ایک زندہ مثال انہوں نے حضرت زینبؓ سے دی ہے کہ جب زینبؓ کے شوہر کسی مصروفیت کی بنا پر

جنگ میں شریک نہ ہو سکے تو اس کے بعد انہوں نے اپنے دونوں بچوں کو میدان جنگ میں بھیج دیا اور یہ کہہ دیا، چونکہ ہمارے شوہر ہمارے بھائی کا ہاتھ نہیں بٹا سکتے ہیں، ان کی جگہ میں اپنے دونوں بچوں کو باخوشی قربان کرنے کے لئے تیار ہوں اور اسکے ساتھ ساتھ مزید یہ بھی کہا کہ انکے شوہر نے وصیت کی تھی کہ انکی غیر موجودگی میں اگر بھائی کو کوئی ضرورت پیش آئے تو ان دونوں کو قربان کر دینا یہ چیز یہاں کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ شوہر اور بیوی کی رائے میں اتنی یکسانیت تھی اور دونوں طرف قربانی کا کتنا بڑا جذبہ تھا۔ اس منظر کی ایک خوبصورت منظر کشی میرا نیس نے مندرجہ ذیل بند میں بہت پر اثر انداز میں کی ہے۔

۱۴ ”کرتے تھے مجھ سے وقت سفر روکے یہ بیاں

محرّم اس شرف سے ہوں میں زار و ناتواں

بچوں کا ساتھ اور سفر خوف الاماں

مجبور دشمنوں میں چلے ہیں شہ زماں

وقت آپڑے تو پاس ہمارا نہ کچھو

بیٹوں کو تم حسین سے پیارا نہ کچھو، ۱۶

دوسری طرف بھائی نے بہن کے اشتیاق اور قربانی کا جذبہ دیکھتے ہوئے بہن کی ہر ایک بات کو مان لیا۔ یہ لفظ یہاں یوں استعمال کیا گیا کہ حضرت حسینؑ بچوں کو کم عمری کی بنا پر جنگ میں نہیں لے جانا چاہتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ انکو جنگ میں لے جانا انکی زندگی سے ہاتھ دھونا ہوگا اور بہن کی دلی خواہش اور بھائی کے لئے ایثار کو میرا نیس نے مندرجہ ذیل سطروں میں بیان کیا ہے۔

۱۵ ”فرمایا کہ صد شکر بر آیا میرا مطلب

عزت مرے بچوں کی ترے ہاتھ ہے یا رب

بہتر ہے جو لڑنے کو وہ پیارے گئے ہیں دونوں

یہ خوشخبری آئی کہ مارے گئے دونوں

اس سے پہلے جناب زینبؓ نے بچوں کو نصیحت کی کہ۔

تم یہ نہ سمجھو کہ میں عاشق ہوں تمہاری
بھائی سے مجھے جان نہ اولاد ہے پیاری
کس کام کے پھر سر جو تصدق نہ کرو گے
تب دودھ بھی بخشو گی جو عزت سے مرو گے“ ۱۵

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے میرا نیس اپنے معاصرین میں اندازِ بیان اور منظر نگاری میں بے مثال تھے مندرجہ بالا نظم کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات صاف طور سے واضح ہو جاتی ہے کہ میرا نیس اس فن میں نہایت کامیاب اور بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ اوپر کے بندوں میں اجازت ملنے کے بعد بہن کی خوشی اور اسکے جذبہ قربانی کو میرا نیس نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کی مکمل تصویر واضح ہو جاتی ہے، جو کہ بچوں کو رخصت کرنے سے قبل انہیں صبر و عزیمت کی تلقین کرتی ہیں اور کتنے بھی نہ خوشگوار حالات ہوں انکو ثابت قدم رہنے کی وصیت کرتی ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ عورت اپنے شوہر کا وقار ہمیشہ قائم رکھتی ہیں۔ حضرت زینبؓ کے اس جرأت مندانہ اقدام اور صبر و استقلال کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات مجھے کہنے میں گریز نہ ہوگا کہ حضرت زینبؓ نے نہ صرف شوہر کے وقار کو قائم رکھا بلکہ اپنے کنبے کے ہر فرد کے وقار کو قائم رکھنے میں ایک مثالی کردار ادا کیا ہے، ایک بات کا خاص طور سے یہاں ذکر کرنا ہوگا کہ کتنی گہری society اور کتنا ہی سخت سماج کیوں نہ ہو اور کتنا ہی برا معاشرہ ہو مگر عورت کی پاک دامن کو ہر سماج نے سراہا ہے۔ اور پاک دامن اور باوقار خواتین ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھی گئیں ہیں چاہے society سماج کے لوگ کتنے گئے گزرے ہوں۔

ماں باپ کے زیرِ نگرانی اولاد کی تربیت ہوتی ہے اور یہ تربیت بہت معنی رکھتی ہے جیسا کہ ایک مفکر نے کہا ہے کہ جب انسان کم سنی میں کوئی چیز دیکھتا ہے اور بہت سی چیزیں اسکے گرد و پیش گزرتی ہیں۔ تو یہ ساری چیزیں اسکے لاشعور میں جمع ہوتی رہتی ہیں اور جب وہ سن شعور کو پہنچتا ہے تو اسکے لاشعور

میں یہ جمع شدہ مواد کی عکاسی اس کی باتوں میں ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سے عقل مند ماں باپ اپنے بچوں کو اچھی اچھی کہانیاں اور اچھی باتیں پسند و نصیحت کے کلمات اپنے بچوں کو سناتے ہیں۔ یہی چیزیں آگے چل کر بچوں کے لئے مفید ثابت ہوتی ہیں اور انکے اندر ہمت و استقلال، نیکی اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی چیزیں یہاں حضرت زینب کی زندگی میں دیکھنے کو ملتی ہیں جو اپنے بچوں کو قربانی کے احکامات اقوال رسول اور خاندان کے بزرگوں کی بہادری کے کارنامے سنایا کرتی تھیں۔ جس سے بچوں کے دل میں خوشی کا ولولہ پیدا ہوا اور اسی بچپن کی تعلیم کی وجہ سے بچوں کی ہمت بندھی۔ جیسا کہ میر انیس نے کہا ہے کہ بچوں کا حوصلہ اپنے بزرگوں کے کارنامے سنا کر بڑھایا جاتا ہے۔ ہو بہو وہی شکل اور وہی طریقہ کار حضرت زینب کے کردار میں موجود ہے اور اسکی تصویر کشی میر انیس نے مندرجہ بالا ذیل قطعات میں بہت مفصل پر کیف اور بہترین انداز میں پیش کی ہے۔

۱۶ ”خوش ہو کے کہا ماں نے کہ شاباش دیرو

اب دیر نہیں خوب سدھارو میرے شیرو

ہاں چاہئے منھ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو

دو شیر ہو مل کر عمر و شمر کو گھیرو

تو قیر تمہاری ہو مری ناموری ہو

سرد و نوں کے لاؤ تو میں جانوں کی جری ہو

دادا کے جو پوچھو تو علمدار پیمبر

ہاتھوں کے عوض جتکو خدا نے دئے دو پر

بابا سا تو عالم میں نہ تھا کوئی دلاور

کرار کی جرات تو سنی ہوگی مکرر

یوں سب ہیں پہ سرتاج دیروں کے تمہیں ہو

میں صدقے گئی شیر تو شیروں کے تمہیں ہو

اس گھر کے بزرگوں کا چلن تیغ زنی ہے
 جو فقر میں کرتا ہے سخاوت تو وہ غنی ہے
 کہا شہرہ خیر شکنی بت شکنی ہے
 جو بات پہ سردے وہ سخاوت کا دھنی ہے
 بودے کی کہاں آنکھ کہاں مرد کے تیور
 چھپتے نہیں لاکھوں میں جواں مرد کے تیور
 ہمراہ کوئی واں سے نہیں لاتا ہے رتبہ
 جو نام پہ مرتا ہے وہی پاتا ہے رتبہ
 سر بیچ کے زیقدر کو ہاتھ آتا ہے رتبہ
 ہٹتا ہے قدم بڑھ کے تو گھٹ جاتا ہے رتبہ
 مر کر نہ ہٹے قابل احسنت وہی ہے
 جو کھیت میں سر سبز ہو ساونت وہی ہے
 دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی
 گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
 تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی
 بجلی بھی گرے گر تو جھپکتے نہیں غازی
 آفت میں حواس انکے بجا ہوتے ہیں پیارو
 جراورں کے تیور ہی جدا ہوتے ہیں پیارو
 تیروں کی مہم بات میں سرگرتے ہیں صفدر
 آقا کے دل پاک میں گھر کرتے ہیں صفدر

تلواروں میں سینوں کو سپر کرتے ہیں صفدر
 عزت پہ بزرگوں کی نظر کرتے ہیں صفدر
 دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی
 مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی
 نانا نے تمہارے درِ خیر کو جو توڑا
 مانند سپر ہاتھ میں اس در کو نہ چھوڑا
 ہر وار میں بچتا تھا نہ ا سوار گھوڑا
 خالی ہوا جب قلعہ تو منہ جنگ سے موڑا
 تھرائے تھے کفارتیز بزل میں زمیں تھی
 تھا زور تو یہ اور غذانان جویں تھی

اور پھر کہتی ہیں

نیزوں کی طرف پھاتیاں تانے ہو ے جانا
 ہاں تیروں کی بارش میں سپر منہ پہ نہ لانا
 ہنس ہنس کے میں قربان گئی پرچھیاں کھانا
 لازم ہے وہ ہمت کہ مصرف ہو زمانہ

اس جنگ کا چرچہ سحر و شام رہے گا

دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا“ ۱۶

زیر بحث مرثیے میں میر انیس نے ماں کے اس کردار کو بیان کیا ہے جو اپنے بچوں کو ذہنی طور پر
 جنگ کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ اور اس میں خاص جز آمدگی کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہ بزرگوں کا
 کارمانہ ہے اپنے بزرگوں کے کارمانے موثر انداز میں بچوں کو سناتی ہے۔ جس سے بچوں کے دل میں

امنگ پیدا ہوتی ہے اور حیرت ناک جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مریضے میں میرا نیس نے دوا ہم پہلو نمایاں کئے ہیں وہ حوصلہ افزائی اور بڑوں کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی ہے اور تیسرا سب سے اہم کردار وہ ایک خاتون کا کردار ہے جسے میر صاحب نے بڑے ہی مناسب اور موضوع انداز میں پیش کیا ہے اسکی طرز ادا بھی نہایت شاندار ہے۔ زبان بے حد صاف اور ہموار، الفاظ نہایت شائستہ اور خیالات میں ندرت ہے۔

پہلے بند میں ماں یہ نصیحت کرتی ہے کہ بچو میدان جنگ میں ہمت دکھانا، خنجر اور تیروں کو بچوں کا کھیل سمجھو اور عمر و پشمر کو جان بحق کر دو۔ ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس خاندان کے دوست، بچہ، جوان یا بڑا ہوتا ہی زنی انکا اہم مشغلہ تھا۔ بچے جنگ کو بچوں کا کھیل سمجھتے تھے اور تلواروں کی جھنکار کو نغمہ سمجھتے تھے اس خاندان میں حضرت علی حیدر کرار کے نام سے مشہور ہوئے کیونکہ اہلیت کو پانی کے ایک قطرے کے لئے ترسنا پڑا کیونکہ یزیدی فوج نے پوری دریا پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ماں نے نصیحت کی کہ میدان جنگ میں لڑنے والے ویسے بھی آب و دانہ کی فکر نہیں کرتے اور بچوں سے مزید کہا کہ دریا کی طرف رخ نہیں کرنا اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ تمہارے نانا نے جنگ خیبر میں جو کارنامہ انجام دیا تھا اسی نقش قدم پر تم بھی چلنا۔ جناب زینبؓ نے کہا کہ نانا جس طرف مڑتے تھے اس طرف لاش ہی لاش نظر آتی تھی اور جب خیمے کو خالی کر لیا تب تلوار کو رکھا۔ میر صاحب نے پھر وہی دوہرایا ہے کہ بچوں اگر تم نے پیاس کی حالت میں اپنی جان نہیں دی تو میں تمہیں اپنا دودھ نہیں بخشو گی اور جب یہ فرمایا کہ نبی کے لال جگر ایک بوند پانی کو ترس گئے تو تمہیں پانی پینا تو کیا پانی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرنا چاہئے اور یہی چیزیں تمہیں روزِ محشر میں آبِ کوثر کی نہر پر رسول کے دست مبارک سے جامِ کوثر کا راستہ ہموار کریں گی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میں اپنے بھائی کے سر پر تم کو قربان کر دیتی ہوں۔ آخری بند میں میر صاحب نے ایک اور حضرت زینبؓ کی پر اثر بات دہرائی ہے نیز اگر سامنے آئے نہایت خندہ پیشانی اور سینا سپر ہو کر اس کا سامنا کرنا اور تیروں کی بارش سے منھ نہ موڑنا، برچھیاں سامنے آئیں گی تو مسکرا کر اس کا سامنا کرنا پھر

زور دیکر بچوں سے کہا کہ یہ جنگ دنیا والوں کے لئے موضوعِ سخن ہوگی اگرچہ دنیا میں تم نہ رہو گے۔

یہاں مرثیہ کے انداز میں رزمیہ نظم پیش کی ہے وہ عبرت ناک ہے اور قابلِ مثال ہے کہا جاتا ہے کہ ماں اپنے بچوں کے لئے اپنوں کو نچھاور کر دیتی ہے لیکن ماں نے اپنے بھائی کے لئے اپنے بچوں کو نچھاور کیا کیونکہ حضرت زینب کو اس کا بخوبی علم ہو چکا تھا کہ بچے اس جنگ میں جامِ شہادت نوش فرمائیں گے۔ اور ماں نے اس بات پر زور دیکر یہ کہا کہ یا تو دشمن کی فوج کو شکست دینا ہے یا پھر وہیں ختم ہو جانا ہے۔ اور بھوکے پیاسے بچوں کو جنگ میں بھیجنا اور پھر انکوں یہ بھی تلقین کرنا کہ پانی کی طرف دیکھنا بھی مت۔ مرثیہ کے اس حصے میں میر صاحب نے اپنے خیالات کو بڑے موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ جس میں دو باتیں خاص طور سے نظر آئیں ہیں ایک تو عورت کی بے لوث محبت اور قربانی کا جذبہ اور دوسری طرف میر صاحب کے دسترس اور کمال کا بیان۔ جس کمال اور دسترس سے میر صاحب نے حوصلہ افزائی کے منظر کو پیش کیا ہے وہ ایک نادر مثال ہے اور ساتھ ساتھ غیرت ناک پہلو بھی لئے ہوئے ہے۔ بچوں کی معصومیت اور بے گناہی اور ساتھ ساتھ انکا صبر و رضا اور اہلیت کی ایک عورت کی بے مائیگی جیسے فقیری میں سخاوت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ خاص طور سے یہاں پر عورت کی ایک دلیری قابلِ دید ہے جو لوگ خدا ترسی ہوتے ہیں وہ خدا پر ہی اعتماد کرتے ہیں اور توکل علی اللہ میں انہیں سب کچھ نظر آتا ہے اور حق بات کو وہ ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں۔ چاہے اس میں انہیں کتنا ہی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑے۔ اور اسی بنیاد پر حضرت زینبؓ نے اپنی پاک سیرت اور بلند نصب العین کا ثبوت دیا ہے۔ جس کا بیان میر صاحب نے مرثیہ میں رزمیہ نظم کو داخل کر کے نہایت بہترین شکل میں پیش کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں جو خوبیاں رزمیہ نظم کی ہوتیں ہیں اکثر کو میر صاحب نے اس میں پرونے کی کوشش کی ہے۔

عورت ایک نازک صنف کہلاتی ہے اور فطری طور پر اس کے اندر ہمدردی اور محبت کا جذبہ ہوتا ہے کیونکہ عورت مختلف شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ کبھی بیٹی کی شکل میں، کبھی بہن کی شکل میں تو کبھی ماں کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ یہ عورت کے مختلف دور ہوتے ہیں۔ وہ سارے مراحل سے الگ تھلگ

ہوتی ہے۔ شیکسپیئر Shakespeare نے اپنے ڈرامہ میں یہ دکھایا ہے کہ ماں سے زیادہ شفیق اور مہربان کوئی نہیں ہوتا ہے یہ خوبی اللہ نے عورت کو بخشی ہے۔ اسی لئے صنف نازک اور ہمدرد کہی جاتی ہے۔ کیونکہ عورت ایک نازک صنف ہے۔ اس لئے دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھتی ہے۔ اور دوسروں کے غم میں شریک ہوتی ہے۔ یہی حال حضرت زینبؓ کا بھی تھا۔ انہوں نے اپنے بچوں کی رگ رگ میں بہادری اور دلاوری کے جوہر کو کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اور انہوں نے بچوں کو خاندانی روایت اپنانے پر زور دیا۔ بچوں کو رخصت کرتے وقت انہوں نے اپنے خاندان کی عورتوں کو بلایا اور ان سے بھی اپنے بچوں کو رخصت کرایا۔ جس کا خاکہ میر ”انیس“ نے مندرجہ بالا اشعار میں کھینچا ہے۔

”فرما کے یہ لیں دونوں کے چہرے کی بلائیں
اور تھام کے بازو کو پڑھیں آپ دعائیں
فرمایا کہ رخصت جنہیں ہونا ہو وہ آئیں
لو بی بیو سب آؤ تو بچے میرے جائیں

رن میں یہ برات اپنی دکھانے کو چلے ہیں

دونوں دلہنیں بیاہ کے لانے کو چلے ہیں“

یہاں میر صاحب نے اس منظر کو پیش کیا ہے کہ ایک عورت کس طرح سے اپنے غم میں دوسروں کو شریک کر لیتی ہے۔ جیسا کہ ایک ماں کو اپنے بچوں کو کچھ دنوں کے لئے چھوڑنا پڑتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ ایک بڑے کام کی تکمیل کے لئے۔ ساتھ ساتھ بچوں کی جدائی کے منظر کو ایک مفلس ماں نے کیسے پیش کیا ہے۔

جیسا کی اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں رحم دل، نازک اور ہمدرد زیادہ ہوتی ہیں اور شفقت انکی پیدائشی فطرت ہوتی ہے۔ یہی حال حضرت زینبؓ کے معاملے میں دیکھا گیا ہے کہ جب حضرت زینبؓ نے اپنے دونوں بچوں کو میدان جنگ میں دلیری اور جرأت مندی کا سبق سکھا

کر بھیجا تو ان بچوں نے اپنی ماں کی تعلیمات اور انکی ہدایات کو پورے طور سے ملحوظ رکھا۔ اور ماں کی دلی خواہش کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے جان کی بازی لگا دی۔ کیونکہ جب زینبؓ کی خواہش تھی کہ انکے بچے راہ حق میں شہید ہوں اور بچے جب میدان جنگ میں برسرِ پیکار تھے اور ماں خیمہ میں اللہ کے جناب میں دستِ دعا تھیں کہ انکے بچوں کو اللہ اپنے راستے میں قربان کر دے اور انکی قربانی کو قبول فرمائے۔

۱۸ ”بتلا مجھے بچے میرے کیا کرتے ہیں دونوں“

وہ کہتی تھی لاکھوں سے وغا کرتے ہیں دونوں“

پھر اس سے کہتی ہیں کہ کیا میرے دونوں بچے میری نصیحت کے مطابق اکٹھا لڑ رہے ہیں؟

زینبؓ نے کہا دونوں ہیں یکجا کہ جدا ہیں

کی عرض یہ رو کر کہ ”نہیں ایک ہی جا ہیں

لاکھوں ہیں عدو اور وہ دو ماہ لقا ہیں

منہ نہر سے پھیرے ہوئے سرگرم وغا ہیں

دم خوف سے سینہ میں سنبھلتا نہیں اب تو

ہے ہے مجھے چھوٹا نظر آتا ہے اب تو

پھر

یہ سنتے ہی ڈیوڑھی سے ہٹیں حضرت زینبؓ

فرمایا کہ بچوں کا میرے خاتمہ ہے اب

اب کچھ نہیں وسواس بر آیا مرا مطلب

لوبی بیو مل کر صفِ ماتم پہ چلو اب

بچے میرے داخل ہوئے خیل شہدا میں

سجدہ تو کروں شکر کا درگاہ خدا میں،، ۱۸

یہاں شاعر نے ابتدا سے انتہا تک حضرت زینبؓ کے کردار میں یک رنگی اور بلند اخلاقی قائم رکھی ہے۔“

مندرجہ بالا اشعار میں میر انیسؒ نے ماں کے ولولے اور بچوں کی فرما برداری کی تصویر کشی ایک حسین پیرائے میں کی ہے۔ زینبؓ جب فسطہ سے پوچھتی ہے کہ میرے بچے کس حال میں ہیں فسطہؓ جواب دیتی ہیں بچے بڑی دلیری اور صبر و استقلال سے دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں دشمنوں کی تعداد لاکھوں کی ہے اور ان کا مقابلہ دو معصوم کر رہے ہیں۔ پیاسے ہیں مگر نہر کی طرف توجہ نہیں کر رہے ہیں اور ماں کی نصیحت کے مطابق نہر سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ جب حضرت زینبؓ کو خبر دی جاتی ہے کہ بڑی فوج کے مقابلے میں صرف دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تو حضرت زینبؓ اس منظر کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اور کہتی ہیں کہ میرا مقصد برآیا اور بچے شہید ہو گئے۔ اسکے بعد انہوں نے بارگاہ خداوندی میں شکر یہ کا سجدہ کیا۔ یہاں میر صاحب نے ایک بات بڑے صاف لفظوں میں اور نہایت بہترین اسلوب بیان میں حضرت زینبؓ کی بہادری کو اجاگر کیا ہے۔ شاعر نے ابتدا سے انتہا تک حضرت زینبؓ کے اخلاص میں بردباری، سنجیدگی، دلیری، ایثار و استقلال کی تصویر کشی ایک مثالی انداز میں پیش کی ہے یہاں تک کہ شاعر نے شروع سے آخر تک جناب زینبؓ کی سیرت و عادات، بلند خیالی اور اولوالعزمی کو قائم رکھنے کے لئے پوری جدوجہد سے کام لیا ہے اور اسی کو نہایت مناسب پیرائے میں پیش کیا ہے۔ میر صاحب کا یہی کمال ہے۔ انہیں خوبیوں نے انہیں ادبی دنیا میں بے مثال اور لافانی بنا دیا ہے اس سلسلے میں اور بہت سے شعراء نے اپنے انداز بیان کو اجاگر کرتے ہوئے خواتین کو بلا کے کردار کی تصویر کشی کی ہے۔ خاص کر انکے مد مقابل مرزا دبیر کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس ضمن میں علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ”موازنہ انیسؒ و دبیرؒ“ میں شبلی مرحوم نے دونوں شعراء پر تنقیدی انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے۔ جس میں میر انیسؒ صاحب کو دبیرؒ سے بہتر قرار دیا ہے۔ میر انیسؒ صاحب نے حضرت زینبؓ کے کردار جیسا قابل ذکر کا رنامہ پیش کیا ہے اور کردار میں یک رنگی اور بلند اخلاقی قائم رکھی ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میں

اس بات کو ضروری سمجھتی ہوں کہ عورت کے ایثار اور صبر پر ایک مختصر سا ذکر یہاں کروں۔ جب زینبؓ کے بچے اس بڑے لشکر کا مقابلہ کر رہے تھے اور دشمن کے لشکر نے ان بچوں کو گھیرے میں لے لیا یہاں اور ہر طرف سے سے تیروں تلواروں کی بوچھاڑ جب شروع ہو گئیں اس ضمن میں یہ ذکر کر دینا لازمی ہے کہ جب بچے جام شہادت نوش کر لیتے ہیں اور حضرت فضہؓ حضرت زینبؓ کے بچوں کی شہادت کی خبر سناتی ہیں تو حضرت زینبؓ نے خیمے کے دروازے سے بچوں کی لاش کو دیکھا۔ خیمہ میں صف ماتم بچھ گئی۔ لوگ پر سے کو آنے لگے تو حضرت زینبؓ نے فرمایا آپ لوگ کیوں رو رہے ہیں یہ رونے کا مقام نہیں ہے اور مزید فرمایا کہ میں نے اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے قدموں پر نچھاور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اللہ نے اسے پورا کر دیا۔ اب مجھے انکی سلامتی چاہئے۔ یعنی بھائی کی سلامتی کے لئے بیٹوں کی قربانی دیکر حضرت زینبؓ کو مسرت اور شادمانی نصیب ہوئی۔

۱۹ ”سب سن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے
لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے
کنبہ تمام ہو ہو چکا دو گھر اجر چکے
گودی میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے

اب ان کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہئے
بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہئے

بھائی کے آگے لاشوں پہ جا کر کروں میں بین
بے صبر ہے یہ دل میں کہیں گے مجھے حسین
گر مر گئے تو مر گئے وہ دونوں نو رعین
کیونکر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہ مشرقین

روؤں گی تو میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے
صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئیں گے،، ۱۹

ان مثالوں سے یہ بات صاف طور پر عیاں اور بیان ہے کہ حضرت زینبؓ ایک بلند کردار کی خاتون تھی۔ پاکیزگی اور الفت انکی خاص خوبی تھی اور ساتھ ساتھ جذبات پر قابو کرنے میں وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ اور بچوں کی شہادت کے بعد وہ بالکل پرسکون تھیں۔ ذرا بھی غم کا سایہ انکے چہرے پر نہیں تھا۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ روئیں گی یا ماتم کریں گی اسی غرض سے انہوں نے کوئی آہ بکا نہیں کی تا کہ بھائی کے دل کو تکلیف نہ پہنچے، اسکے برخلاف اگر کوئی دوسری عورت ہوتی تو شاید ہی ایسے موقع پر وہ اپنے آپ پر قابو پاسکتی اور آہ و بکا و گریہ و زاری سے پورا گھر ماتم کدہ میں بدل جاتا۔ ان دونوں حالات کا مقابلہ کیا جائے تو حضرت زینبؓ کا اپنے اوپر کنٹرول کر لینا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ جو عام لوگوں میں نہیں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ انہیں امام حسینؑ کے بیٹے علی اکبرؑ سے انتہائی محبت تھی، اور اسکو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ کوئی قدم ایسا نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ جس سے علی اکبرؑ اور امام حسینؑ کی دل آزاری ہو۔ حضرت زینبؓ کی نادر خوبی کو شاعر نے نہایت اچھے انداز میں پیش کیا ہے اور ان کی خوبیوں کو بلند و بالا تر دکھایا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مرد کے مقابل عورت فطرۃً نرم دل ہوتی ہے۔ اس کو ذرا سی پریشانی یا سختی یا مصائب روزگار کا سامنا ہو تو اس کے دل کو تکلیف ہوتی ہے اور اس سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ میرانیس نے حضرت زینبؓ کا صحیح کردار پیش کیا ہے۔ عورت خواہ کتنی ہی نرم دل ہو لیکن جب اپنے بچوں کو مصیبت میں دیکھتی ہے تو اسے برداشت نہیں ہوتا ہے خاص کر موت کی صورت میں اسکا کلیجہ سینے میں اچھلنے لگتا ہے۔ اور قوت برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب عورتیں اپنے بچوں کی لاشوں کو دیکھتی ہیں تو وہ بے قابو ہو جاتی ہیں سر پیٹتی ہیں، بالوں کو نوچتی ہیں اور اپنے جذبات سے گویا پتھر کو بھی رلا دیتی ہیں۔ انکے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ ساری دنیا سنان نظر آتی ہے اور بار بار اپنے بچوں کی مردہ لاشوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتی ہیں، چومتی ہیں اس پر شفیق جو نیوری کا ایک شعر قابل ذکر ہے جو انھوں نے اپنے چھوٹے بچے کی موت پر لکھا تھا۔

”یہی کہہ کہہ کے ایک بیمارِ غم روتا ہے راتوں کو

کہ جب سے تم گئے ہو گھر کی ویرانی نہیں جاتی“

مذکورہ بالا شعر میں شفیق صاحب نے اپنے احساسِ قلب کو جس پیرائے میں پیش کیا ہے کہ اولاد کی موت کے بعد والدین کی دنیا سونی ہو جاتی ہے۔ یہی حال حضرت زینبؓ کا ہے انکے دل کے اندر غم کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اگر میرا نیس نے حضرت زینبؓ کے کردار کو ایسی وضاحت کے ساتھ نہ دکھایا ہوتا تو انکی کردار نگاری اتنی پراثر اور مقبول نہ ہوتی۔ اسی ضمن میں میرا نیس کے مرثیے کے ایک حصے کا میں یہاں ذکر کرنا پسند کروں گی۔ جس میں انہوں نے جب زینبؓ کے بچوں اور حضرت زینبؓ کے کردار کی منظر کشی پیش کی ہے۔ بطور نمونہ مرثیہ کا حصہ پیش ہے۔

۲۰ ”لاشوں پہ لائیں بی بیاں زینب کو تھام کر

ماتم کی صف پہ گر پڑی وہ سوختہ جگر

بولیں بڑھا کے دستِ مبارک ادھر ادھر

بچے کدھر ہیں کچھ مجھے آتا نہیں نظر

کیسی دھڑا دھڑی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں

لوگو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں

ماں صدقے جائے لو مرے زانو پہ سر رکھو

اس بے کسی میں ماں کی بھی جانب نظر کرو

لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو

آفت میں ماموں جان کی اپنے خبر رکھو

دیکھو نہ آنچ آئے شہ خوش خصال پر

فوجوں کی پھر چڑھائی ہے زہرہ کے لال پر

اب کون مرے پہلوؤں میں سوئے گا بچو
 تڑپے گا کلیجہ میرا دل روئے گا بچو
 یہ داغ کو دنیا سے مجھے کھوئے گا بچو
 دن جا کے شب آئیگی تو کیا ہوئے گا بچو
 راحت کسی کروٹ کسی پہلو نہ ملے گی
 مر جاؤں گی زلفوں کی جو خوشبو نہ ملے گی
 دنیا کو نہ دیکھا تھا کہ موت آگئی تم کو
 خیمے سے نکلتے ہی اجل پا گئی تم کو
 ماں صدقے ہو جنگل کی ہوا بھاگی تم کو
 اے گل بدنو کس کی نظر کھاگی تم کو
 ہے ہے مجھے پوشاک شہانی نہ دکھائی
 صدقے گئی اماں کو جوانی نہ دکھائی
 مرتے ہوئے پانی بھی نہ مانگا مرے ڈر سے
 پیاسے سوئے فردوس سدھارے مرے گھر سے
 بے آب تھے اس عمر میں چوبیس پہر سے
 دیکھا بھی نہ دریا کو توجہ کی نظر سے
 سہواً جو پڑی آنکھ تو منہ موڑ لیا ہے
 ڈرتے تھے کہ اماں نے ہمیں منع کیا ہے
 لاکھوں سے معرکے میں وگا کر کے آئے ہو
 بچپن کی غفلتیں یہ نہیں مر کے آئے ہو

دولہا بنے ہو خون میں سب بھر کے آئے ہو
 صدقے گئی رلانے کو مادر کے آئے ہو
 مجھ سے پچھڑ کے تم اسی جنگل میں رہ گئے
 ارماں شادیوں کے مرے دل میں رہ گئے
 بچوں تمہیں بتاؤ کہ میں غربت میں کیا کروں
 گھر ہے نہ یہ وطن ہے مصیبت میں کیا کروں
 بھائی گھرا ہوا ہے اس آفت میں کیا کروں
 فاقوں میں تشنگی میں مصوبت میں کیا کروں
 راحت نہ روح کو نہ کسی دل کو صبر ہے
 پانی نہ غسل کو نہ کفن ہے نہ قبر ہے
 سستی ہوں اس سفر میں خطرے بے شمار ہیں
 جانیں وہی اسے جو میان مزار ہیں
 پرشش ہے روک ٹوک ہے جنگل ہے خار ہیں
 وہ بھی ڈرے ہوئے ہیں جو طاعت گزار ہیں
 منزل کا شب کی ماں کو پتہ دے کے جایو
 قربان جاؤں ساتھ مجھے لے کے جایو
 کہتا تھا باپ شب کو نہ بچے نکلنے پائیں
 بھولے ہیں راستہ نہ کہیں گھر کا بھول جائیں
 دربار میں بھی ہوں تو سویرے سے گھر میں آئیں
 ہے یہ دستِ ظالم جو کرتا ہے سائیں سائیں

پہنچوگی کس طرح جو ڈر ڈر کے روؤ گے
 واری اندھیری رات میں کس طرح سوؤ گے
 یہ بین سکر کے لاشوں سے پلٹی وہ نوحہ گر
 غش آیا سانس الٹ گئی ٹکڑے ہوا جگر
 اک حشر تھا کس کو کسی کی نہ تھی خبر
 بانو پکاری سوئے علمدار دیکھ کر

بچوں کے ساتھ ماں بھی جہاں سے گزر نہ جائے
 لاش اٹھاؤ شاہ کی ہمشیرہ مر نہ جائے“ ۲۰

اس مریضے کے شروع میں جب حضرت زینبؓ کو بچوں کی لاش کے پاس لایا جاتا ہے تو حضرت زینبؓ حسرت سے کہتی ہیں کہ اپنا سر میرے رانوں پر رکھ لو اور پھر فرماتی ہیں کہ اب مرے پہلو میں کون سوئے گا مری راحت کا سارا ساز و سامان ختم ہو چکا ہے۔ اس جملہ کو پھر دہرایا کہ بچوں تم نے ماں کے ارماں کو پورا کیا اور دریا کی طرف توجہ نہ کی ساتھ ساتھ میر صاحب نے اس بے مائیگی کو دکھایا ہے کہ عورت فطرتاً جذباتی ہوتی ہے اور جذبات پر کنٹرول کی ایک مثال پیش کی ہے۔ اور اپنے بچوں کے اعتماد کا حضرت زینبؓ نے بار بار ذکر کیا ہے کہ میرے بچوں نے میرے کہنے کے مطابق پانی کا خیال نہیں کیا۔ اور ماں کے اعتماد اور فرما برداری کا اہم جز بنایا۔

جب حضرت حسینؓ شہید ہو چکے اور خاندان کا ایک ایک فرد شہادت کے رتبے سے سرفراز ہوا تو مردوں میں سید سجادؓ باقی رہ گئے۔ وہ نہایت بیمار اور لاغر انسان تھے۔ صرف بیوہ عورتیں، یتیم بچے، اور حسینؓ کی دو بہنیں اُم کلثومؓ اور زینبؓ۔ زینبؓ ان میں بڑی ہیں اور عزم و استقلال میں بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ خاندان کی حفاظت کی ذمہ داری زینبؓ کے سر آتی ہے اور یہاں سے یزیدی فوج کا ظلم و ستم شروع ہو جاتا ہے۔ یزیدی فوج خیمہ میں گھس جاتی ہے اور ظلم ستم اس قدر کرتی ہے کہ پردہ نشین خواتین

کے سروں سے چادر چھین لیتی ہے۔ میرانیس نے اس منظر کو ایسے انداز میں بیان کیا ہے گو کہ وہ وہاں موجود تھے اور سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت زینب غصہ میں کہتی ہیں اس کی منظر کشی میر صاحب نے مندرجہ ذیل قطعہ میں کی ہے۔

۲۱ ”امت کا بزرگوں کی اگر دھیان نہ آتا

اے شمر ردا کو تو مری ہاتھ لگاتا

طاقت تھی کہ مجھ کو کوئی یوں آکے ستاتا

چادر تو میری چھینتا کوئی نہ بچاتا“ ۲۱

یزید کی مکار فوجی افسروں کا یہ خیال تھا کہ حسین نے اگرچہ بیعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ان پر ظلم و ستم ڈھائے اور بچے ہوئے کنبے کے لوگوں کو بیعت کے لئے راضی کریں۔ زینب انکی مکارانہ باتوں کو سن کر جواب دیتی ہیں۔ میرانیس نے مندرجہ ذیل بند میں حضرت زینب کی اعلیٰ ظرفی کو بیان کیا ہے۔

”عابد سے باتیں مکر کی کرتا ہے او پلید

بابا شہید ہو یہ کرے بیعت یزید“

یہ باتیں سن کر فوجی برا فروختہ ہو جاتے ہیں اور اہلبیت پر ظلم و ستم اور زیادہ کرتے ہیں۔ فوج پر بچوں کی نہ بے قراری کا اثر ہوتا ہے اور حضرت زینب کورسی میں باندھ کر یزید کے دربار میں پیش کیا جاتا ہے اور جب امام کا سر یزید کے دربار میں پیش کیا جاتا ہے تو یزید حضرت امام کے رخسار پر چھڑی مارتا ہے تو حضرت زینب طیش میں آکر یہ کہتی ہیں جس صابرہ نے تمام ظلم و ستم برداشت کئے۔ بھائی کا قتل اور خیموں میں غارت گری اور آتش زنی کا حول ناک منظر دیکھا، قید و بند کی مصیبت خاموشی کے ساتھ جھیلی لیکن بھائی کے رخسار پر چھڑی چلنے کی بے ادبی نہ برداشت کر سکی اور غصہ میں کہا:

۲۲ ”اس چھڑی کو مرے بھائی کے لبوں سے سر کا

بو سے لیتے تھے انہیں ہونٹوں کے محبوب خدا

یہ چھڑی ہائے غضب اور لبِ پاک شمیر
 نہ ستامجھ کو میں ہوں بنتِ شہِ خیبر گیر“ ۲۲
 اس مرثیے میں میر انیس نے زینبؓ کی اعلیٰ ظرفی اور
 اچھے اخلاق کو چند لفظوں میں سمودیا ہے۔ جس کو یہ کہا
 جائے کہ میر انیس نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

جناب زینبؓ کو ایک مثالی کردار کی خاتون اور صبر و استقلال کا پیکر اور محبت و ہمدردی کا ایک نادر
 نمونہ بنا کر پیش کیا ہے جو قابلِ ستائش ہے۔ اور میر صاحب کے کمال و دسترس اور انداز بیان کا ایک نادر
 نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

جناب شہر بانوؤں کا کردار:

شہر بانوؓ امام حسینؑ کی پہلی بیوی کا نام ہے یہ شاہ ایران کی بیٹی تھیں، جو فتح ایران کے بعد آئیں
 تھیں۔ عرب کے بہت سے لوگوں نے ان سے عقد کی خواہش ظاہر کی لیکن حضرت علیؑ نے انہیں آزاد کرا
 کے ان سے حضرت حسینؑ کا عقد کیا اور یہ بھی روایات میں مشہور ہے کہ شہر بانوؓ نے خواب میں فاطمہؑ
 زہرا کو دیکھا تھا اور خواب ہی میں اسلام قبول کیا اور انہیں اہلبیت کے خاندان سے جڑنے کا شرف ملا۔
 امام اور شہر بانوؓ میں بے پناہ الفت تھی اور بانوؓ اپنے شوہر کی عظمت و وقار کو خوب سمجھتی تھی اور انکوائے گھر
 ی عقیدت تھی۔ اور انہیں اپنی قسمت پر ناز تھا۔ شہر بانوؓ ہمیشہ اپنے شوہر کی رضا جوئی کی ہمیشہ کوشش کرتیں
 رہتی تھیں۔ میر انیس نے اس کا تذکرہ بانوؓ کی کنیز شیریں کی زبان میں مندرجہ ذیل انداز میں کیا ہے۔

۲۳ ”بانو سے جو مانوس شہنشاہِ ز من تھے
 کچھ پیار کی باتیں تھی محبت کے سخن تھے
 شیریں پہ جو حضرت کی نظر جا پڑی اک بار
 بانو سے یہ بولے بہ تبسم شر ابرار

خوش چشم ہے کسی مرتبہ شیریں خوشی اطوار
 اس طرح کی آنکھیں کہیں دیکھی نہیں زہار
 فرمائی جو یہ بات شہنشاہ امم نے
 نہوڑ کیا سردختر سلطانِ عجم نے
 سوچی وہ کہ میلان شہ جن و بشر ہے
 کہ آنکھوں کی تعریف تو منظورِ نظر ہے
 پھر دل سے کہا عاشق صادق تو اگر ہے
 معشوق جو راضی ہو تو کیا اس میں ضرر ہے
 فرزندِ نبی ابنِ شہنشاہ نجف ہے
 شیریں کو کنیری میں مجھے دیں تو شرف ہے“ ۲۳

یہ روایات حقیقت کی کسوٹی پر کہاں تک پوری اتری ہے۔ ویسے شہر بانو کے کردار میں ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی بیوی کا کردار بہت نمایاں ہے اور اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جبکی انیس کا مقصد ایک موقع پر بانو کی والہانہ محبت اور سخت سے سخت وقت میں شہر بانو کی شوہر کی رضا جوئی کے شانہ بشانہ چلنے کا انداز بیان کرنا تھا۔ مورخین کا اس بات پر اختلاف ہے کہ شہر بانو واقعہ کربلا کے وقت حیات تھیں یا نہیں لیکن امام کی دوسری بی بیوں جنابِ رباب امم لیلیٰ کا ذکر زیادہ ہے۔ امم لیلیٰ علی اکبری والدہ تھیں۔ لیکن انیس کے مرثیے میں جو تذکرہ ہے اس میں شہر بانو کو واقعہ کربلا میں حیات بتلایا ہے۔ اور رباب اور امم لیلیٰ کا کہیں ذکر نہیں ہے ہر جگہ شہر بانو کا ذکر ہے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ انیس نے کوئی تاریخی غلطی کی، یہ بات کہی جاسکتی ہے۔ انیس نے جن خواتین کی سیرت نگاری کی ہے اس کا ایک اہم مقام ہے۔ شہر بانو کے کردار میں زینبؓ جیسی اعلیٰ ظرفی، عظمت، اور بلند حوصلہ نہیں ہے۔ لیکن وفا شعار بیوی، جاں نثار ماں اور حق پرست مومن بیوی کا مکمل کردار شہر بانو کے اندر ہے۔ جس کی

آئینہ دارانیس کے مندرجہ ذیل اشعار ہیں۔ جیسے جب بیٹی ماں سے شکایت کرتی ہے اور ماں خاموش رہتی ہے تو بیٹی کہتی ہے۔

”اماں تو شفا رش بھی ہماری نہیں کرتیں

ماں کے دل پر کچھ بھی گزر رہی ہو لیکن بیٹی کے اطمینانِ قلب کے لئے وہ کہتی ہیں
میں صدقے گئی اب نہ کرو گریہ وزاری“

جب سفر میں شوہر کے ساتھ چلتی ہیں گرمی کی شدت ہے۔ بچے پانی کو ترس رہے ہیں۔ پریشانی کے وقت بیوی شوہر سے مدد کی طالب ہوتی ہے۔ انیس نے اس منظر کو کس فطری انداز میں پیش کیا ہے۔

۲۴ ”اہلِ حرم ہیں ہو دج و محل میں بے قرار

معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار

بانو پکارتی ہے کہ یا شاہ نام دار

گرمی سے جاں بلب ہے مرا اطفلِ شیر خوار

کیونکر یہ رکھ اٹھے چھ مہینے کی جاں سے

گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسماں سے“ ۲۴

شہر بانو کا پورا کردار عاشورہ کے روز سامنے آجاتا ہے۔ صبح صادق سے لیکر عصر کے وقت تک راہ خدا میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ انیس نے ان سارے واقعات کو جن کا معاملہ شہر بانو سے جڑا ہوا ہے مختلف انداز میں اور مختلف واقعات میں پیش کیا ہے۔ شہر بانو مختلف انداز میں اپنے خاندان کے ہر فرد سے ہمدردی اور محبت سے ملتی ہیں۔ ایک نو بیاہتا بیٹی کبریٰ کے بیوہ ہو جانے پر اسے سمجھاتی ہیں، کبھی سمہن کے غم کو غلط کرنے کی کوشش کرتی ہیں، کبھی نند زینب کے پاس پہنچتی ہیں اور ان سے ہمدردی اور محبت سے ملتی ہیں۔ انکی ہر ادا میں عورت کا نازک احساسِ ممتا سے بھرا ہوا ہے۔ غرض کہ اتنی ہی بڑی مصیبت ہو، تکلیف ہو صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی ہیں۔ شوہر کی رضا جوئی میں ہر وقت لگی رہتی ہیں۔

اور کسی وقت شکوہ و گلہ کا اظہار نہیں کرتیں ہیں۔ جب عاشورہ کے دن سارے سپاہی شہید ہو جاتے ہیں۔ ایک جوان بیٹا بچ جاتا ہے جو جنگ کی اجازت ماں سے چاہتا ہے۔ لیکن بیوی شہر بانو اپنی زبان پر کسی قسم کی ناشکری کے کلمات کبھی نہیں لاتی ہیں۔ جو مصیبتیں میاں کے شہید ہونے کے بعد گونا گوا حالت سے بیوی شہر بانو کو گزرنا پڑا۔ لیکن شہر بانو نے ہر جگہ اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ بیوی شہر بانو کی کردار نگاری اور شوہر پرستی کے جذبے کو صالحہ عابد حسینؑ نے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا ہے۔

۲۵ ”امام حسینؑ سے اہل خاندان کو محبت بھی ہے اور عقیدت بھی ہے وہ جگر گوشہ رسوں ہیں محافظ اسلام و امام وقت ہیں اسی لئے انکا احترام اور انکے اعلیٰ مقاصد پر سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ بھی ہے۔ ساتھ ہی خاندان بھر کی عورتیں انکو حد سے زیادہ چاہتی ہیں اور بھروسہ کرتی ہیں وہ افسر خاندان ہیں ہر ایک سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی فلاح و بہبود اور دین و دنیا کی بھلائی کی فکر رکھتے ہیں۔ شہر بانو تو بیوی ہیں اور کیسی بیوی؟ جو نادیدہ اس شمع کی پروانہ بنی تھیں۔ انہیں شوہر سے سچا عشق بھی ہے اور گہری عقیدت بھی وہ بیٹوں کی موت صبر و شکر کے ساتھ سہا رہتی ہیں بلکہ خود امام وقت پر اپنے جگر کے ٹکڑوں کو فدا کرنے کی سعادت حاصل کرتی ہیں۔ مگر جب حسینؑ سے جدائی کا وقت آتا ہے تو اس صابرہ کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ اپنے محبوب سے ہمیشہ کی جدائی، رنڈا پے کی مصیبت اور قید بند کی ذلت کی جان لیوا تصویریں انہیں بے قرار کر دیتے ہیں۔“

ایک اور مرثیہ میں انیسؑ نے بانو اور حسینؑ کو ایک دوسرے انداز میں دکھایا ہے۔ یہاں بیوی کی طرف سے شکوہ نہیں ہے بلکہ شوہر کر رہے ہیں۔ حضرت حسینؑ جب اپنے عزیزوں کی شہادت کے بعد خیمہ آتے ہیں اور بہن اور بیوی سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ وہ سب سے رخصتی لے لیتے ہیں مگر شہر بانو دکھائی نہیں دیتی ہیں تو انہیں کم سن بچوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری ماں کہاں ہیں۔ ان بندوں میں میر انیسؑ نے میاں بیوی کی جذباتی کیفیت کو موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

۲۶ ”بی بی کہو کہ کیا حال ہے اماں کا تمہاری

کس گوشے میں بیٹھی ہیں کہاں کرتی ہیں زاری

جب سے سوئے جنت گئی اکبر کی سواری
 دیکھا نہ انہیں گھر میں ہم آئے کئی باری
 تھی سب کی محبت انہیں بیٹے ہی کے دم تک
 کیا آخری رخصت کو بھی آئیں گی نہ ہم تک

کس جاہیں، طلب ہم کو کریں یا ادھر آئیں
 ممکن نہیں اب وہ ہمیں یا ہم انہیں پائیں
 کچھ ہم سے سنیں کچھ ہمیں حال اپنا سنائیں
 اک دم کے مسافر ہیں ہمیں دیکھ تو جائیں “۲۶

شہر بانٹو کے کان میں جب آواز سنائی پڑتی ہے تو اٹھ کر سامنے آتی ہیں اور شوہر کی باتیں سنتی ہیں۔ جس وقت وہ حضرت حسینؑ کے سامنے آتیں ہیں اس وقت حضرت حسینؑ کی عجیب کیفیت تھی۔ بیوی بچوں سے جدائی ناموافق حالات اہلبیت کو صبر و رضا کی تلقین، عظمت اور ثابت قدمی پر زور اور بیوی کو صبر و دلا سے دینا یہ نہایت نازک موڑ تھا۔ جس کے بیان میں میر انیس نے اپنی قلمی طاقت کے ذریعہ جذبات کو ایسا پیش کیا ہے جس کی واضح شکل سامنے آ جاتی ہے۔

صالحہ عابد حسین نے شہر بانٹو کی سیرت کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔
 ۲۷ ”اور ہم نے یہ ایک مختصر سا خاکہ شہر بانٹو کے اس کردار کا پیش کیا جو میر انیس نے دکھایا ہے۔ اس کردار میں ایک الگ شانِ انفرادیت ہے۔ یہ ایسی عورت کا کردار ہے جو اہل بیت حسینؑ میں ہے مگر رسول زادی یا امام زادی نہیں لیکن سچی مومنہ ہے۔ اسے بانی اسلام اور ان کے خاندان سے گہری عقیدت ہے۔ نواسہ رسول سے وہ عشق ہے جس کے ڈانڈے عشقِ الہی سے مل جاتے ہیں۔ شوہر اس کا محبوب بھی ہے اور ہادی و رہنما بھی اسے اس کا غم نہیں کہ بادشاہ کی پوتی، بیٹی اور بہن ہوتے ہوئے بھی وہ بندی میں آئی بلکہ اسکی مسرت ہے کہ اس طرح اسے نواسہ رسول کی شریکِ زندگی بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

وہ کبھی اپنی عالی نسب پر ناز کرتی ہیں بلکہ حسینؑ کی بیوی اور خاندانِ رسول کی لونڈی ہونا اپنے لئے باعثِ فخر جانتی ہیں۔ وہ چاہنے والی بھانج ہے خود افسرِ خاندان کی بیوی ہے مگر خاندان کی سرداری اور افسری کا حق ہمیشہ اپنی نندِ زینب کو دیتی ہیں۔ عاشقِ زار، وفا شعار بیوی ہے۔ جس کو شوہر کی خوشنودی اور رضا جوئی کی ہر وقت فکر رہتی ہے مگر ساتھ ہی اپنے شوہر سے گلہ شکوہ کرنے کا حق بھی رکھتی ہیں۔ بچوں پر واری نثار ماں ہیں جو ہر منزل پر ماں ہونے کا حق ادا کرتی ہیں، خواہ وہ تعلیم و تربیت کی منزل ہو یا پھر پرورش اور دیکھ بھال کی یا راہِ خدا میں کڑا امتحان دینے کی وہ ہر ایک میں پوری اترتی ہیں۔ یہ حق پرست و مومن عورت اپنا سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر بھی کبھی لب پر شکوہ دل میں گلہ نہیں لاتی۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے کردار میں وہ جانِ سیرت میں حقیقت کا وہ جلوہ نظر آتا ہے کہ اسی دنیا کی باس معلوم ہوتی ہے اور اس طرح شہرِ بانو کے کردار میں انیس نے حقیقی اور مثالی عورت کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس کی سیرت اور شخصیت کا حسن کاری کے ذہن میں ہمیشہ کے لئے باقی رہتا ہے، ۷۷

مندرجہ بالا سطور میں اور اہل قلم نے مقالات اور مضامین کی روشنی میں بی بی شہرِ بانو کے کردار کی تصویر کشی پیش کی ہے۔ اکثر لوگوں نے اعلیٰ کردار کی عورت قرار دیا ہے اگرچہ شہرِ بانو کی حیات کے بارے میں اختلافات ہیں۔ جیسا کہ لوگوں نے کہا ہے کہ کربلا کے واقعہ کے وقت شہرِ بانو حیات نہ تھیں اس اختلاف کے قطع نظر ایک بات حقیقت ہے کہ میر صاحب کی تصویر کشی اتنے واضح انداز میں ہوتی ہے جو ہر چیز کو قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری اس کو بہ نفس نفیس دیکھ رہا ہو۔ تاریخ کے حالات سے قطع نظر خواہ وہ خواتین کربلا میں رہی ہوں یا نہ رہی ہوں بانو نے ایک عورت کے کردار کا نادر نمائندہ پیش کیا ہے۔ انکی اس مختصر سی زندگی میں بڑے اتار چڑھاؤ آئے لیکن بانو ہر جگہ کامیاب رہیں۔ وہ زہد تقویٰ کی مجسم، ایک مثالی بیوی اور ایک جاں نثار ماں جیسی شخصیت کا نمونہ ہیں انیس نے ان حقائق کو جو انکی سیرت و کردار سے متعلق ہیں اس کی ایسی تصویر کشی کی ہے جو قاری کے ذہن میں ہمیشہ باقی رہے گی۔

جناب فاطمہؑ زہرہ کا کردار:- فاطمہؑ زہرہ رسول خدا کی بیٹی ہیں:

اور اسلامی society سماج میں انکی شخصیت اتنی بالاتر ہے کہ جس کا احترام ہر فرقہ کے مسلمان کرتے ہیں یہ مناسب اس لئے ہے کہ یہ ایک پیغمبر ﷺ کی بیٹی تھیں، بلکہ انکی خدا ترسی، پرہیزگاری، علم و فضل ہمدردی، محنت خوف، سخاوت جیسی خوبیوں کی مالک تھیں۔ جس طرح نبی دنیا والوں کے سامنے گوناگوں عالی صفات کے حامل تھے جو مسلمانوں کے لئے ہدایت و رہبری کا نمونہ تھے۔ انکی بیٹی بھی اپنی باکمال صلاحیتوں کی بنا پر عورتوں کے لئے نمونہ بن گئی اور اس طریقہ سے انکے شوہر بھی بہت عظیم شخصیت بن کر ابھرے علامہ اقبال نے ایک فارسی نظم میں جناب فاطمہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ جس کی ایک سطر یہاں پیش ہے۔

”مریم از یک نسبت علی عزیز

از سہ نسبت حضرت زہرہ عزیز“

میر انیس نے حضرت فاطمہؑ کے کردار کی تصویر کشی مختلف مواقع پر کی ہے۔ جیسے انکی شادی کے موقع پر یا پیدائش کے مواقع پر مختلف انداز میں خاص طور پر ایک خاص شعر جس میں انہوں نے حضرت علیؑ کی سیرت کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

”وہ ہے لقب امیر یا خادم فقیر ہے

ایک تنگ تیز ایک زر ہے ایک بصیر ہے“

جب حضرت فاطمہؑ کی شادی حضرت علیؑ سے ہوئی اس وقت کے لئے یہ ایک قابل تقلید مثال ہے۔

اور اس جفاکش زندگی اور تنگ دستی کو انیس نے مبالغے سے نہیں پیش کیا بلکہ جو حدیث میں

مشہور ہے اسی کو قلم بند کیا ہے۔

”تھا اس میں ایک بادیہ اور ایک مشکِ آب
 دو چادریں تھیں اور تھی جتکو وہ جناب
 لوٹا تھا اک فقط کہ وضو سے ہوں بہرہ یاب
 تکیے تھے لیف خرمہ کے ذو ایک فرشی خواب

زیور تھا فقیر فاطمہ خوش صفات کا

تھا یہ جہیز بنتِ شہ کائنات کا“

فاطمہؑ کے اندر وہ خوبیاں جس سے وہ بلند و بالا تر ہو کر ابھریں کہ وہ ان کی عبادتِ شفقت و
 جفا کشی اور تنگ دستی اور رضاءِ الہی پر راضی رہنے کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں۔ ان چیزوں کی تصویر کشی
 میرانیس نے مندرجہ ذیل انداز میں پیش کی ہے۔

اب زہد و فقیر و فاطمہ کا کچھ سناؤں حال
 فاقے پہ فاقے کرتی تھی اکثر وہ پر ملال
 لاتے جو مزد آب کشی شیر ذو الجلال
 تب جو منگا کے پیستی تھیں وہ نکو خوش خصال

دولت سے کچھ غرض تھی نہ حشمت سے کام تھا

آٹھوں پہر خدا کی عبادت سے کام تھا

جز اک ردائے کہنہ نہ تھی دوسری ردا

اس میں بھی لیف خرمہ لے پیوند جا بجا

بستر سے تھا کبھی نہ تن پاک آشنا

فرشِ زمین تھا خواب گاہ بنتِ مصطفیٰ

دنیا میں جیتے جی کبھی راحت نہیں ملی

فاقوں میں گر ملی بھی تو نانِ جوئیں ملی

رسول خدا کے مشہور صحابی سلمان فارسی جب فاطمہؑ زہرا کے یہاں جاتے تو اکثر انکو چلی پیستے اور گھر کے کام کاج میں مشقت اٹھاتے دیکھتے۔

”پیشانی پر عرق ہے کف دست ہے نگار
دیتی ہیں دودھ روتا ہے جب طفل شیر خوار
جاری زبان پاک پہ ہے شکر کردگار
پہلو میں مارے بھوک کے شہیر ہے بیقرار
فرماتی ہیں نہ روؤ کچھ اس میں بھی راز ہے
وادی خدا کریم ہے بندہ نواز ہے“
مسلمان پوچھتے ہیں:-

اے دختر رسول خدا فلک جناب
ان محنتوں کی آپ کے دل میں کیاں ہے تاب
جو پیتی ہیں دودھ پسر کو پلاتی ہیں
فضہ نے ہوتے آپ پہ ایذا اٹھاتی ہیں
فرمایا فاطمہ نے پس از شکر کردگار
اک دن تو فضہ کرتی ہے سب گھر کا کاروبار
اور کی ہے میں نے محنت یک روزہ اختیار
ایذا ہو اس کو یہ نہیں منظور زینہار

گو میں محمد عربی کی عزیز ہوں
حق کی کنیروں کی بھی کنیر ہوں

ان کی سخاوت کا بیان دیکھئے:-

محتاج تھی مگر تھا سخاوت کا بھی یہ حال
فاقے میں در پہ آن کر جس نے کیا سوال
دے آئی کچھ نہ کچھ اسے جا کر وہ خوش خصال
دنیا کے مال کو نہ سمجھتی تھی کچھ بھی مال

سینے میں دل علائق دنیا سے پاک تھا
کوہ طلا بھی سامنے زہرا کے خاک تھا

مندرجہ بالا سطور میں انیس نے فاطمہ کی محنت اور پراسرار زندگی اور فقر و فاقہ میں رہنا اور فقیری میں امیری اور تنگ دستی میں سخاوت جیسی خوبیوں کی حامل تھیں جس کو میر انیس نے بہت اچھے انداز میں اجاگر کیا ہے میر انیس کی یہ تصویر کشی ان کے اشعار میں کافی مقدار میں موجود ہے لیکن سارے اشعار کو قلمبند کرنا ناممکن ہے اسلام کا ابتدائی زمانہ تنگی اور فقر و فاقہ کا دور تھا خود پیغمبر اسلام بھی اپنی زندگی ایسی طرح معاشی بد حالی میں بسر کر رہے تھے فاطمہ کا بھی یہی حال تھا لیکن سائل کو کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا ایک بار مسجد نبوی میں ایک سائل آ کر دست سوال پھیلاتا ہے نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کی حاجت کون پوری کرے گا حضرت علی فرماتے ہیں اس کو میں پوری کروں گا اور اس کو اپنے گھر لاتے ہیں اور اس کے سوال کو پورا کرتے ہیں ایک بار انھوں نے روزہ رکھا اور افطار کے وقت ایک سائل آ گیا خود پانی پر گزارا کیا اور سائل کو اپنا افطار کا سامان دے دیا اس طرح سے تین دن تک چلتا رہا اور اس طرح سے پانی پر گزارا ہوا ایک بار حضرت فاطمہ کو قریش کی عورتوں نے شادی میں بلایا اور اس دعوت میں ان کا مذاق اڑانا مقصود تھا اور فاطمہ کو اس میں جانے میں تا مل تھا لیکن خدا نے انھیں جنت سے لباس فاخرہ (شاندار) بھیجا اس روایت کو میر انیس نے بڑے تفصیل اور جوش سے بیان کیا ہے مگر جب انھیں جنتی لباس نصیب ہوا اور وہ وہاں سے تشریف لے گئیں میر صاحب نے اس کا بیان جس انداز میں کیا ہے کہ کس طرح سے فاطمہ

کے لئے لباس بھیجا گیا قیمتی زیورات آئے اور حوریں لونڈیوں کی شکل میں ان کے ساتھ بھیجا دیا اس بات کو قبول کرے گی مگر شاعر نے یہاں اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے اس کے لفظ لفظ پر اپنے یقین کا مل کو دہرایا ہے جب حضرت فاطمہ شادی کے گھر پہنچتی ہیں تو سب لوگ ہکا بکارہ جاتے ہیں جس کا اظہار میر انیس نے مندرجہ ذیل بند میں کیا ہے۔

دیکھا جو فاطمہ کی یہ آمد کا بند و بست
اٹھ کر خدا خدا کرنے لگے بت پرست

وہاں فاطمہ کی آمد کی خبر سن کر لوگ حیران رہ گئے اور خاطر مدارات میں جان بچھا دی گئی بلاشبہ ہمیں یہ کہنے میں دریغ نہ ہوگا کہ انیس کی شاعری نہیں مصوری ہے جس پر میر انیس کو پورا کمال ہے میر انیس نے اس موقع پر ایک تصویر کشی کی ہے جب سارے اصحاب ٹڈھال ہیں اور چاروں طرف سوگ کا ماتم پھیلا ہوا ہے چونکہ یہ لیاں فاخرہ جنت سے آیا تھا اور ساتھ ساتھ حوریں لونڈیوں کی شکل میں تھیں جو ایک معجزہ نہیں تو ایک تعجب خیز تو تھا ہی اور اس واقعہ نے مجلس کا رنگ بدل دیا اس کو میر صاحب نے اپنے کمال شاعری میں دکھایا اور مناسب موزوں انداز میں اس امر کی تصویر کشی کی ہے۔

سینے میں درد غم، تو بدن زار، رنگ زرد
سوزش جگر میں، ہوش پر اگندہ رنگ زرد
تن میں کبھی بخار، کبھی ہاتھ پاؤں سرد
پوشاک میلی، بال پریشاں، رخ پہ گرد

بند آنکھیں، دل میں یاد رسالت پناہ کی
تکیے سے سر کبھی جو اٹھایا تو آہ کی

درد جدائی کی ماری بیٹی کی کیسی سچی تصویر ہے ۔

رغبت نہ کھانے پر تھی نہ پانی کا تھا خیال

چہرے پہ آنسو بہتے تھے آنکھیں تھیں دونوں لال

کرتہ سیاہ بر میں پریشان سر کے بال

پہروں زمیں پہ غش میں پڑی رہتی تھیں نڈھال

نے فرش سے غرض تھی نہ بستر سے کام تھا

گر کام تھا تو ذکر پیمبر سے کام تھا

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت فاطمہ ایک مثالی بیوی تھیں اور ماں بھی تھیں اور ہر اعتبار سے ان میں گونا گوں خوبیاں تھیں بچوں سے انھیں بے حد لگاؤ تھا اور جان کنی کے وقت بھی اپنے بچوں سے بے حد محبت کا اظہار کرتی ہیں۔

جس طریقے سے میر انیس نے فاطمہ کے کردار کی تصویر کشی کی ہے اس میں کسی کو کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے یہاں ان کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور تاریخ کی روگردانی کرنے میں اور حدیث کا مطالعہ کرنے میں اور بہت سی سیرت کی کتابیں پڑھنے میں حضرت فاطمہ کی کردار کی تصویر سامنے آتی ہے۔ لیکن شاعرانہ انداز میں جو چیزیں میر صاحب نے پیش کی ہیں اس کا تو انداز ہی نرالہ اور بے مثال ہے بطور تذکرہ یہاں میں ذکر کرنا مناسب سمجھوں گی جس طریقے سے اردو شاعری میں حالی مومن کا حال ہے میر انیس اس سے کچھ کم نہیں ہیں بلکہ اردو شاعری کو میر انیس نے بہت کچھ دیا ہے انیس کے مرثیے میں بہت سے اقتباسات کی ضرورت ہے مگر ان سب کا یہاں ذکرنا ضروری نہیں رہا سوال مرثیوں کا تو یہ مرثیے انیس صاحب کے ابتدائی دور کے ہیں اس لئے بعد کے مرثیوں میں زبان و بیان میں کافی فرق ہے لیکن کردار نگاری اور اوصاف و خوبیوں کا بیان جذبات کی عکاسی میں میر صاحب ایک بہت ہی کامیاب شاعر بن کر ابھرے اور یہی سب خوبیاں ہیں جس میں میر صاحب کو ادب کی دنیا میں

خاص کر شاعری کے میدان میں فن مرثیہ میں لافانی اور لاٹانی بنادیا ہے لیکن یہاں میں اپنی ذاتی رائے ضرور پیش کروں گی کہ مرثیوں میں مبالغہ کا بھی دخل ہے۔

اُمّ البنین:

دنیا میں سوتیلی ماں کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اسے ظالم کہا گیا اور حق نہ دینے والی ماں کے نام سے پہچانا گیا۔ یہاں تک کے سوت اور سوتیلے کا نام ہی ظلم و جبر ہے اور یہ نظریہ یہاں تک ہے کہ ماں کتنی بھی نرم دلی، شفقت اور مہربانی دکھا دے اسے دنیا مکر و فریب ہی کا نام دیتی ہے۔ سوتیلے بچے کتنے ہی شفیق اور مہربان ہوں مگر اسکا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ لیکن واقعہ کر بلا اس سے کچھ مختلف ہے۔ حضرت حسینؑ کے سگے اور سوتیلے لوگوں نے یکساں سلوک پیش کیا۔ یہاں یہ دیکھنا ہے کہ سگی بہن زینبؓ اور سوتیلے بھائی عباسؓ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایثار و قربانی میں حضرت عباسؓ زینبؓ سے کہیں آگے ہیں۔ میر انیسؒ نے حضرت عباسؓ کی والدہ اور بیوی کے کردار کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے اور انہوں نے سوتیلوں کی ہمدردی و شفقت اور قربانی کو بڑے کمال کے ساتھ دکھایا ہے۔

واقعہ کر بلا میں اُمّ البنین کے چار بیٹے جام شہادت سے سرفراز ہوئے ان میں عباسؓ سب سے بڑے تھے۔ حضرت عباسؓ اپنے پورے گھر کے ساتھ کر بلا تشریف لائے واقعہ کر بلا میں حضرت عباسؓ کے بھائیوں نے بھی شہادت پائی جناب فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے ام البنینؓ سے شادی کی اور ان سے جو اولاد پیدا ہوئی انیسؒ نے ان کی خاکہ کشی میں دلکشی اور شوق رنگی دیکھائی ہے۔

اس ”عباس علی شیرستانِ نجف ہے
تابندہ درِ تاجِ سلیمانِ نجف ہے
سرورِ چمن و خضرِ بیابانِ نجف ہے
آئینہ روئے منہ کنعانِ نجف ہے۔“

طفلی سے اسے عشقِ امامِ دوسرا تھا
 شہ اس پہ فدا تھے ، وہ شہ دیں پہ فدا تھا
 اس کو انہوں نے عباسؑ ابنِ علیؑ کی پیدائش کے ذکر سے شروع کیا ہے اور ابتدا ہی میں والدہ
 عباسؑ کا ذکر یوں شروع ہوتا ہے۔

جب خلد کو دنیا سے ہوئیں فاطمہ رہگیر
 باور تھی زبسِ مادرِ عباس کی تقدیر
 جس روز سے آئی تھی ید اللہ کے گھر میں
 رہتی تھی شب و روز تمنائے پر میں“ ۳۱
 عباس اور ان کے بھائیوں نے میدانِ کربلا میں حق کی خاطر اپنی جان قربان کر دی اور جو
 قربانیاں انہوں نے دی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس کی بنیاد ماں نے ڈالی تھی۔ شاید دوسری ماں
 ایسا نہ کرتی۔

”شبیر کو عباس کی مادر نے بلایا
 اور گود میں فرزند کو دے کر یہ سنایا
 آغا ہو شہنشاہ ہو سردار ہو اسکے
 مالک ہو تمہیں اور تمہیں مختار ہو اسکے“

یہاں میر صاحب نے ہندوستانی تہذیب کو عربی تہذیب میں دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن
 یہاں اس کا مقصد سوتیلی ماں اور سوتیلے بیٹے کے اندر احترام کو دکھانا ہے۔ جیسے کہ ایک ماں نے بچے کے
 دل میں سوتیلے بھائی بہن کی محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ یہاں ایک بات قابلِ غور یہ بھی ہے کہ
 انیس صاحب نے ایک بات صاف کر دی ہے انیس کا مقصد یہاں شوہر کی خوش نودی نہیں بلکہ فاطمہؑ کی
 عظمت کا اعتراف ہے۔

”شبیر پر ماں تجھ کو فدا کرتی ہے بیٹا
عباس بتا دے مجھے تری مرضی ہے کیا“
کیونکہ حضرت علیؑ رسول اکرم سے کربلا کی پیشین گوئی سن چکے تھے۔ یہ سن کر انکی آنکھوں میں
آنسو آنے لگے اور کربلا کا پورا منظر اچکے سامنے آگیا۔

۳۲ ”رو کر اسد اللہ نے دیکھا رخ شبیر
جنگاہ کی آنکھوں کے تلے پھر گئی تصویر
پیاسوں کا خیال آگیا حالت ہوئی تغیر
یاد آئی بھری مشک کلجے پہ لگا تیر
طاقت نہ رہی ضبط کی احمد کے وصی کو
نزدیک تھا صدمے سے غش آجائے علی کو

عباس کو لپٹا کے گلے کرنے لگے پیار
چومے کبھی عباس کے بازو کبھی رخسار
فرماتے تھے تجھ سا نہیں دنیا میں کوئی وفادار
صدقے تیرے اے دل بر زہرا کے مددگار

ماتم ترا ہر تعزیه خانے میں رہے گا
شہرہ تری الفت کا زمانے میں رہے گا“ ۳۲

کیسے پر درد اس خاندان کے واقعات ہیں جن سے اہلبیت کو گزرنا پڑا، حضرت علیؑ شہید ہو گئے،
امام حسنؑ کو زہر دیا گیا۔ قیادت امام حسینؑ کے سر آئی۔ خلافت امیر معاویہ کے ہاتھ لگ گئی اور انکے انتقال
کے بعد یزید نے خلیفہ رسول بننے کا اعلان کیا۔ امام حسینؑ نے بیعت سے انکار کیا تو انہیں شہید کیا گیا۔
جب امام حسینؑ نے مکہ جانے کا ارادہ کیا تو کوفے سے خلافت کے لئے بلاوا پہنچا۔ انیس صاحب نے

جو مرثیے لکھے ہیں اسکی عجیب خصوصیات میں کہیں عباسؑ کی ماں کا ذکر نہیں کیا لیکن جب کربلا کا واقعہ ہو جاتا ہے۔ امام حسینؑ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہادت پا جاتے ہیں اور سال بھر بعد قید و بند سے چھٹکارا پا کر اہل حرم کا قافلہ مدینہ واپس آتا ہے اس وقت کے مرثیوں میں اُم البنینؑ کا ذکر آتا ہے۔ اہلیت اپنے خاندان کے کافی لوگوں کو کھودیتے ہیں، مدینہ میں پہنچنے کے بعد گریہ و ماتم زوروں سے شروع ہو جاتا ہے۔ صغریٰ باپ کا ماتم کرتی ہیں، خواتین کربلا سینا کو بی کر رہی ہیں لیکن دوسری طرف مادر عباسؑ کا یہ حال ہے کہ انہیں اس بات کی فکر ہی نہیں کہ انکے چاروں بیٹوں نے جان قربان کرنے میں کوئی کوتاہی اور دیری نہیں کی۔ اور سب سے زیادہ فکر بڑے بیٹے عباسؑ کی ہوتی ہے کہ کہیں انکے بیٹے عباسؑ کو جو فرض سونپا گیا تھا اسکی ادائیگی میں کوئی کمی تو نہیں کی۔ اور حسینؑ کی محبت میں کوئی کمی تو نہیں آنے دی۔ انکے لئے اتنا ہی کافی نہیں تھا کہ بیٹا حسینؑ کے ساتھ شہید ہوا بلکہ انکا ارادہ تھا کہ اس طرح جان دی جائے کہ رہتی دنیا تک وفا اور محبت قائم رہے جو ایک نادر مثال ہو جائے۔ جو مندرجہ ذیل قطعہ میں انیس نے پیش کیا ہے۔

”رخصت کو تھا وہ چلتے ہوئے جس گھڑی آیا

حق دودھ کا بخشا تھا مجھ سے مرا جایا

میں نے اسے یہ کہہ کے تھا چھاتی سے لگایا

شبیر کے قدموں پر جو سر تو نے کٹایا

تو دودھ بھی بخشو لگی دعا بھی تجھے دو لگی

جان اپنی بچائی تو کبھی نام نہ لو لگی “ ۳۳

آخری بند میں ایک بہادر عورت کی شجاعت اور اسکے انداز بیان کا ذکر ہے۔ حضرت اُم کلثومؑ امام حسینؑ کی چھوٹی بہن ہیں۔ انکو حضرت عباسؑ سے بے حد لگاؤ ہے۔ انہوں نے سوتیلی ماں کو جب ان کے بیٹوں کی جرات مندی اور ایثار و قربانی کا پورا واقعہ سنایا تو مادر عباسؑ نے غم، نوحہ کرنے کے بجائے

سجدہ شکر ادا کیا۔ اور اپنے بیٹوں کے اس کارنامے کو شاندار کارنامہ جان کر مسرت و شادمانی کا اظہار کیا اور درودِ وجدائی کو اپنے دل ہی دل میں چھپالیا۔

زوجہ حضرت عباسؑ:

اُمّ البنین یعنی والدہ حضرت عباسؑ ان کی جھلک مرثیوں میں کم ملتی ہے۔ لیکن میرا نیس نے انکے کردار کی جو تصویر کھینچی ہے۔ جس سے مادرِ عباسؑ کی سیرت کا جو نقشہ سامنے آتا ہے۔ جس سے مادرِ عباسؑ ایک اونچے کردار کی عورت ہی نہیں بلکہ ایک مثالی ماں کی شکل میں بھی ایک نادر مثال ہے۔ زرا دلی محبت بھی دیکھئے کہ سوتیلے بچوں پر اپنی سگی اولاد کی قربانی میں کوئی جھجک نظر نہیں آتی ہے۔ ان سوتیلے رشتوں میں سب سے بڑا قابلِ ذکر کردار اُمّ البنین کی بہو حضرت عباسؑ کی بیوی کا ہے روایت میں جو ”ذکرِ یہ“ کے نام سے مشہور ہیں مگر میرا نیس نے انکا ذکر اہلِ عباسؑ یا عباسؑ کی بیوی کے نام سے کیا ہے۔

عباسؑ کربلا کے وہ مجاہد ہیں جن کی جزاات مندی، قوت، وفا شناسی آج تک تاریخ کے اوراق میں دہرائی جا رہی ہے۔ یا مرثیوں کی محفل میں ان کا خاص مقام ہے میر صاحب نے انکا ذکر جس عقیدت مندی اور محبت کے ساتھ کیا ہے وہ ہر پڑھنے والے کے دل پر اپنی چھاپ چھوڑ دیتا ہے۔ جہاں بھی انہوں نے حضرت عباسؑ کا ذکر کیا ہے وہاں ان کا ایسے پر کیف انداز میں ذکر کیا ہے جسکا جواب نہیں اور انکی بیوی کا کردار بھی ان کے مرثیوں کا ایک اہم حصہ بن گیا ہے۔ جس کا اظہار صالحہ عابد حسین نے میرا نیس کی طرح نثر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول صالحہ عابد حسین ایک بچی کے رفیق حیات کے لئے کن خوبیوں کا حامل شوہر ہونا چاہیے۔ یہ انیس کے مرثیوں میں ملتا ہے۔ انکی فطری نیکی شرافت جو انسان کی روح اور نسوانیت کی عزت اور ایسے شوہر سے وابستگی جس نے انکے اندر چار چاند لگا دئے ہیں۔ انکی گہری عقیدت بچوں سے بے پناہ محبت، نندوں کی خاطر اور احترام نے ان کو بالاتر بنا دیا ہے۔ انیس کے کلام میں پہلی بار عباسؑ کی رفیق حیات کا ذکر اس وقت ملتا ہے جب تین محرم کو امام حسینؑ کا قافلہ میدانِ کربلا میں پڑاؤ ڈالتا ہے۔ اور پڑاؤ کا پورا انتظام عباسؑ کے سر ہوتا ہے۔ یکا یک شامی فوجیں

خیمہ نصب کرنے سے روکتی ہیں۔ عباسؑ کے ساتھ جنگ و جہاد پر اتر آتے ہیں۔ عباسؑ بڑی مشکل سے معاملے کو رفع دفع کرتے ہیں۔ خیمہ زنی کا کام شروع ہو جاتا ہے اور اہلبیت انکی واپسی پر شکریہ ادا کرتی ہیں۔ جس کی تصویر کشی میر انیس نے مندرجہ ذیل بند میں کی ہے:-

۳۴ ”کہنے لگی یہ زوجہ عباس خوش بیاں
غصے میں انکو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
ہر بات میں ہے شیر الہی کی آن بان
یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان

آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں
یہ تو فقط حسین کے صدقے میں جیتے ہیں“ ۳۴

جب دشمن کی فوج دریا پر قبضہ کر لیتی ہے، اہلبیت پر کھانا پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ عباسؑ اس فوج کے سپہ سالار تھے اس لئے انہیں اسکی زیادہ فکر ہوتی ہے، یہاں تک کے 10 دس محرم کو جنگ کا نفاذ ہوجاتا ہے۔ امام حسینؑ کی گنتی کی فوج تیار ہو جاتی ہے۔ الم باہر نکالا جاتا ہے۔ الم برادر جعفر تیار تھے۔ جو الم کی حفاظت میں جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ذمہ داری بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ جب الم کی ذمہ داری حضرت عباسؑ کو مل جاتی ہے تو انکی بیوی بہت خوش ہوتی ہیں۔ جنگ شروع ہونے کے بعد جو مصائب اور سختی کا سامنا ہوتا ہے اہلبیت شہادت پا جاتے ہیں۔ اور خواتین کربلا جو قیدی بنا کر یزید کے دربار میں حاضر کی جاتی ہیں۔ میر انیس نے عباسؑ کی شہادت کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جذبہ صادق پیش کیا ہے۔ جب حضرت عباسؑ شہید ہو جاتے ہیں اور انکی لاش تک خیمہ میں نہیں آتی ہے جس کی تصویر کشی میر انیس نے مندرجہ ذیل اقتباس میں کی ہے جو ایک سچی اور صحیح تصویر ہے۔ اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

۳۵ ”اللہ رے دل خراش علی کی بہو کے بین

سکان آسمان و زمین کو بھی تھا نہ چین

در پڑی تھی منہ پہ کہ تھے سامنے حسین

تھا مے تھی ہاتھ خواہر سلطانِ مشرقین

ٹکڑے تھے تیغِ غم سے دل سو گوار کے

حکمِ حیا یہ تھا کہ نہ رونا پکار کے

امام حسینؑ وہاں سے ہٹ جاتے ہیں کہ بد نصیب بیوہ دل کی بھڑاس نکال لیں تو زوجہ عباسؑ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور عالمِ بےقراری میں شوہر کی روح سے مخاطب ہو کر باتیں کرنے لگتی ہیں۔ چشمِ تصور سے دیکھئے نہیں تصور کی بھی کیا شرط ہے، آپ نے اپنے عزیزوں دوستوں ہمسایوں کسی نہ کسی کا ایسا سانحہ دیکھا ہوگا۔ کڑیل جوان شوہر مر گیا ہے، جوان بیوہ اور ننھے ننھے بچے رہ گئے ہیں۔ اس وقت بیوہ کی جو حالت ہوتی ہے وہ لوگوں سے دیکھی نہیں جاتی میں نے میت پر گریہ ماتم کو برا اور ناجائز قرار دینے والی عورتوں کو بھی ایسی حالت میں بدل کی طرح تڑپتے اور ایسے دل خراش بین کرتے دیکھا ہے کہ سننے والے کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ میرا بیٹس نے عباس کی بیوی کی جو حالت دکھائی ہے، جو الفاظ انکے منہ سے کراتے ہیں اس میں کسی بھی بیوہ عورت کے نازک احساسات و جذبات کی مکمل اور حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔ اندازِ بیان ضرور ہندوستانی عورت کا ہے مگر دل کے زخم سے جو لہو بہ رہا ہے وہ ہر درد مند بیوہ کے دل کا ہو سکتا ہے۔

”کل تھی سہاگن آج تو میں سو گوار ہوں

بیوہ ہوں جاں بلب ہوں، غریب الدیار ہوں

جانِ علی ہیں آپ تو میں جاں نثار ہوں

ہاں ناز ہے تو یہ ہے کہ خدمت گزار ہوں

جنگل میں چھوڑے نہ مرا ہاتھ تھام کے
 بیٹے ہیں آپ امام کے بھائی امام کے
 والی کہاں یہ رائڈ تیمیوں کو لے کے جائے
 اس کربلا نے لوٹ لیا مجھ کو ہائے ہائے
 کیا اسکی زندگی جسے وارث سے یاس ہو
 میری بھی قبر آپ کی تربت کے پاس ہو
 ”رات تو شوہرانکے پہلو میں تھا پیار اور محبت کی باتیں ہو رہی تھی چند گھنٹے میں یہ کیسی قیامت
 ٹوٹ پڑی؟“ ۳۵

میر انیس نے جو تصویر کشی اُم البنین کی سیرت و کردار کی کی ہے وہ ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔
 مگر کہیں کہیں اس چیز کا بھی ذکر کر گئے ہیں جو تاریخ میں نہیں ملتی ہیں۔ کہیں کہیں مبالغہ و غلو سے کام لیا ہے
 مگر اس میں بھی اعتدال کو برقرار رکھا ہے۔ جہاں تک تصویر کشی اور احوال کی جو بہو تصویر اپنے اشعار
 کے ذریعہ مرثیہ کی شکل میں پیش کرنے میں میر انیس ایک نہایت کامیاب شاعر ہیں۔ اور اردو زبان کو
 بیش قیمتی خزانہ انیس نے جو مرثیوں کی شکل میں پیش کیا ہے وہ قابلِ اعتراف اور قابلِ ستائش ہے۔
 فاطمہ صغریٰ :- تاریخ کربلا میں امام حسین کی تین بیٹیوں کا ذکر ہے۔ جن میں سے فاطمہ صغریٰ
 منجھلی صاحب زادی ہیں اور سب سے چھوٹی بیٹی سیکندہ ہیں اور سب سے بڑی فاطمہ کبریٰ ہیں۔ جب کربلا
 میں روانگی کا وقت آیا تو صغریٰ بیمار تھیں۔ اس لئے انہیں گھر چھوڑنا پڑا۔ بزرگ خواتین میں حضرت عباس
 کی والدہ اُم البنین فاطمہ صغریٰ کے پاس تھیں۔ میر انیس نے ان تینوں بیٹیوں کے کردار کی بڑی خوبی
 سے تصویر کشی کی ہے۔ فاطمہ صغریٰ کی بات چیت میں کچھ شکایتی جملے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ وہ مرحلہ ہے
 کہ بچپن کا دور ختم ہو چکا ہے اور جوانی میں بھی پختگی نہیں آئی۔ اور طویل بیماری کے سبب جو مزاج میں چڑ
 چڑاپن اور مایوسی کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اسے میر صاحب نے فنکاری سے قارئین کے سامنے پیش

کیا ہے۔ وہ فنکار کے صلاحیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ساتھ ساتھ ایک ایسی لڑکی کے احساس کو بھی چڑچڑاپن کہا ہے جو بزرگوں کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔ باپ کی بیٹی سے رخصتی، خاندان کی جدائی کا ماحول بیان کرنے میں میر صاحب نے اپنے کمال اور دسترس کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں میر صاحب کی مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری دونوں اپنے عروج پر نظر آتیں ہیں۔

امام حسینؑ کی سفر کی تیاری مکمل ہے لیکن روانگی بیٹی سے چھپائی جا رہی ہے اور اسکو بڑی بوڑھی عورتوں کے سپرد کر کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں تو یہ بدنصیب ماں گھبرائے ہوئے انداز میں کہتی ہیں۔

”غش ہو گئی ہے فاطمہ صغرا میری پیاری“

اور دل کی یہ تڑپ ہے۔

”اس حال میں کس طرح بیمار کو چھوڑوں“

ماں کی حالت زار کا بیان ہے۔ اور حسین کے ساتھ جانے والی کبرٹی اور سکینہؑ بھی بے حد پریشان ہیں۔ اس کا بیان میر انیس نے مندرجہ ذیل اقتباس میں کیا ہے۔

۳۶ ”چلائی تھی کبرٹی کہ بہن آنکھیں تو کھولو

کہتی تھی سکینہ کہ بہن منہ سے تو بولو

یہ چھوٹی بچی ہے مصلحت نہیں سمجھتی، جو بات ہے وہ بے دھڑک کہہ اٹھتی ہے۔

ہم جاتے ہیں تم اٹھ کے بغلگیر تو ہو لو

چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رولو

افسوس اس طور سے غفلت میں رہو گی

کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی

بیمار بچے سے ماں باپ کو کچھ زیادہ ہی الفت ہوتی ہے۔ امام حسینؑ بھی صغرا کو بہت

چاہتے ہیں۔ اور اسکو یوں چھوڑ جانا ان پر بڑا شاق ہے۔ مگر مقصد کی لگن ہر جذبہ و محبت پر غالب ہے لیکن بشریت کا یہ تقاضا ہے کہ بچی کا حال سن کر بے قرار ہو جائیں۔

سن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے
 بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
 منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب یہ لائے
 کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس کو بچائے
 جس صاحبِ آزار کا یہ حال ہو گھر میں
 دانستہ میں کیونکر اسے لے جاؤں سفر میں
 معذرت کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ بیوی کی مامتا کی جلن کا بھی احساس ہے۔

کہہ کر یہ سخن بیٹھ گئے سید خوشخو
 اور سورۃ الحمد پڑھا تھام کے بازو
 بیمار نے پائی گل زہرا کی جو خوشبو
 آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو

ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے اہیں اماں
 کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں اماں
 اندازہ ہو چکا ہے کہ باپ ماں مع کنبے کے سفر پر جا رہے ہیں اور بیماری کے سبب میں
 ساتھ نہیں لے جانی جا رہی ہوں۔ مگر اس عمر میں دل کی بات بے دھڑک کہہ دینے سے جو
 جھک اور شرم مانع ہوتی ہے اس نے اب تک خاموش رکھا تھا مگر اب کے سفر پر روانگی کا وقت
 آگیا۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ ۳۶
 آگے میرا نیس نے اس منظر میں دوسرے لوگوں کے کردار کی منظر کشی کی ہے، یعنی صغرا

۴ اور علی اکبرؑ کے دونوں سوتیلے بہن بھائی ہیں اور شاعر کو یہ معلوم ہے کہ ایسے بھائی بہنوں میں یکسوئی نظر آتی ہے اور جادو نگار قلم اس کی تصویر کشی بڑے حسین پیرائے میں پیش کرتا ہے۔

علی اکبرؑ سفر کی تیاریوں میں مشغول ہیں اور وہ گھر میں اس لئے نہیں جاتے ہیں کہ بہن کی جدائی انکے لئے ناقابل برداشت ہے۔ مگر صغرا اسکو بے اعتنائی اور بے رحمی کے زاویے سے دیکھتی ہیں اور انکے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ بھائی نے ان سے منہ موڑ لیا۔ لیکن بھائی جب بہن سے ملنے جاتے ہیں تو سارا شکوہ اور گلہ ختم ہو جاتا ہے۔ جس کا مظاہرہ انیس صاحب نے مندرجہ ذیل اقتباس میں کیا ہے۔

۵ ”ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہے اکبر
اتنا نہ کہا مرگئی یا جیتی ہے خواہر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر
وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر

پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے
مگر جب بھائی بہن سے رخصت کے لئے آتا ہے۔

یاں ذکر یہ تھا آئے جو روتے ہوئے اکبر
سرخ آنکھیں تھیں اور زرد تھا غم سے رخِ انور
تو سارے گلے شکوے غالب ہو جاتے ہیں اور وہ گہری پاک اور بے لوث محبت باقی
رہ جاتی ہے جو صرف بہن کا حصہ ہے۔

چلائی بہن بھائی کی چھاتی سے لپٹ کر
اس سینے کے ان ہاتھوں کے قربان یہ خواہر

فریاد ہے بے موت بہن مرتی ہے بھائی

تقدیر ہمیں تم سے جدا کرتی ہے بھائی“ ۳۷

جب امام حسینؑ مکہ اور وہاں سے کوفہ گئے راستے میں یزیدی فوجیں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ کربلا میں دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔ فخر و باطل کی جنگ ہوئی۔ حضرت حسینؑ جان بحق ہوئے۔ انکے سارے رفقاء ایک کے بعد ایک شہید ہوئے۔ اہلبیت قیدی بنا کر کوفہ و دمشق بھیجے گئے۔ بیمار صغراؑ اس وقت ان حالات سے باخبر نہ تھی۔ بھائی اور بہن کی یاد میں انہیں اور بھی ضعیف اور لاغر بنا دیا تھا۔ اس کا مرقع میر صاحب نے مندرجہ ذیل اقتباس میں پیش کیا ہے۔

۳۸ ”جینے سے غمِ شاہ میں بیزار تھی صغرا

تنہائی کی آفت میں گرفتار تھی صغرا

غش رہتا تھا اس طرح کہ بیمار تھی صغرا

ہوش آتا تو کرتی یہی گفتار تھی صغرا

کہتے تو ہیں سب کڑھتی ہو کیوں آئیں گے بابا

غم یہ ہے کہ جیتا نہ ہمیں پائیں گے بابا

اپنی گرتی ہوئی حالات کا اندازہ ہے

جینے نہیں دینے کا غمِ ہجر کا آزار

بابا کے بھی آگے سے زیادہ ہوں میں بیمار

بستر پر پڑی رہتی ہوں میں بے کس و لاچار

اٹھتی ہوں گراک بار تو گر پڑتی ہوں سو بار

آنکھیں ہیں کہیں ہوش کہیں دھیان کہیں ہے

کچھ دل بھی کئی روز سے کہنے میں نہیں ہے

پیاروں کی جدائی میں انسان جب بہت بے قرار ہوتا ہے۔ بعض وقت دل کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ کسی طرح بس ایک بار وہ صورت نظر آجائے۔

جی چاہتا ہے دیکھ لوں بابا کا میں دیدار
اماں کے گلے سے لگوں صغرا کو کروں پیار
بھائی علی اکبر کی بلائیں لوں میں بیمار
پھر مر بھی اگر جاؤں تو کچھ غم نہیں زہار

جیتے جی موئی جاتی ہوں میں یادِ پدر میں
لے لے کر مرے نام کو سب روئیں گے گھر میں
یہ نہیں سوچ سکتی کہ مسافروں پر کوئی مصیبت آئی ہے بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ان سے
ملے بغیر اپنا دنیا سے سفر ہے۔ اسی لئے دل کی تڑپ بڑھ گئی جب حضرت ام سلمیٰؓ اسے سمجھاتی
اور صحت و زندگی کی دعائیں دیتی ہیں۔

میں زیست بسر کر چکی اب دن ہیں سفر کے
تم بچی ہو جیتی رہو ساہے میں پدر کے
تو صغرا کے دل کے کسی گوشے میں جو چھپا ہوا خوف جاگزیں ہے وہ بے اختیار زبان پر
آ جاتا ہے۔

نانی نہیں مرنے کا مجھے خوف و خطر ہے
پردیس میں پردیسیوں کی جان کا ڈر ہے“ ۳۸
صغرا بیمار ہیں باپ اور بھائی سے دیدار کی تمنا اور حسرت لئے جی رہی ہیں۔ وہاں حشر
برپا ہے، بیوی ماں بیٹی کو باپ کے مرنے کی خبر سناتی ہیں۔

۳۹ ”لے گود میں بانو اسے رو رو کے پکاری
 بابا کہاں میں جس کو میں دکھاؤں تجھے واری
 پردیس میں جنت کو سفر کر گئے شبیر
 اے فاطمہ میں رائڈ ہوئی مر گئے شبیر“ ۳۹

اس دردناک خبر کو سنتے ہی فطری طور پر زبردست رنج و غم کا اظہار ہونا چاہئے۔ لیکن
 ماں کی طرف دیکھتے ہوئے اور ماں کو مطمئن کرنے کے لئے میرا نیس نے جو کلام پیش کیا ہے
 اس پر صالحہ عابد حسین نے مندرجہ ذیل اقتباس میں رائے زنی کی ہے۔

۴۰ ”ایسے اچانک اور سخت صدمے کی خبر کا قدرتی ردِ عمل تو یہ ہونا چاہئے تھا۔ کہ صغرا
 ساکت ششدر رہ جائے یا تاب ضبط نہ لا کر بے ہوش ہو جائے لیکن یہاں انیس جیسے شاعر
 بھی رونے رلانے اور بین و گریہ کے مقصد کے پیش نظر ایسے موقع کی مرقع کشی نہیں کر سکے۔ وہ
 ایسے سرپیٹے روتے، چلاتے دکھاتے ہیں مگر اس گریہ و ماتم میں صغریٰ کی بے قراری و مایوسی
 ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی ہو۔

ایسے گئے بابا کہ نہ جیتے پھرے گھر کو
 مایوس کیا دختر مجروح جگر کو

اب آس ہے اتنی کہ جو مر جائے گی صغرا
 اے سید بیکس تمہیں تب پائے گی صغرا
 زندہ رہنے کی خواہش ختم ہو چکی ہے بس موت کی آرزو ہے جو پچھڑوں سے ملائیگی۔

بیمار کو اس ہجر کی آفت سے نکالو

مجبور ہے صغرا تمہیں چاہو تو بلالو “ ۴۰

میر صاحب محترم نے بیمار بیٹی صغرا کے صبر و تحمل، ضبط ثابت قدمی اور اہلیہ کے کردار کو

جس حسین پیرائے اور مناسب الفاظ میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ خود میر صاحب کی دیانت اور کردار نمائی کی ایک کامیاب تصویر ہے۔ جیسا کہ بار بار یہ کہا جا چکا ہے کہ میر صاحب اس کارنامہ میں اپنی مثال آپ ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے فن میں ایک فن کار کی حیثیت سے بہت مشہور و معروف ہیں۔ خاص طور سے انکا تقابلی مطالعہ ان کے ہم عصر دبیر سے کیا جائے تو اس کردار نمائی میں انیس صاحب آگے ہیں۔ کہیں میر صاحب نے سیرت نگاری میں کچھ چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ حالانکہ یہ تو شعراء کی عام خوبی ہے۔ یہ چیزیں اور بھی شعراء میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن میر انیس کے پیش کرنے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ مبالغہ کو حقیقت میں بدل دیتے ہیں۔

جناب سکینہ کا کردار:

جناب سکینہ امام حسینؑ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ انکا اصلی نام ”امیمہ“ تھا لیکن باپ پیار میں انکو سکینہ کہتے تھے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں سکوں قلب کا باعث۔ ان کی عمر اس وقت تقریباً چار برس تھی۔ امام حسینؑ کا شیر خوار بچہ علی اصغرؑ جسے ظالموں نے یوم عاشورہ کو بھوکا پیاسا شہید کر دیا۔ سکینہ اور شیر خوار بچہ یہ دونوں کربلا کے ایسے کردار ہیں جو دو عالم کا ایک مجسمہ بنے اور تاریخ میں ان کے نام سے دو عالم کی کہانی ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور دنیا والے اس افسوس ناک خبر پر کفِ افسوس ملتے رہیں گے اور آنسو نظر کرتے رہیں گے۔ نہ صرف اہل مشرق بلکہ اہل مغرب بھی اس واقعہ کو دنیا کی سب سے دردناک کہانی بتائیں گے۔ اور ان معصوموں نے لاتعداد افراد سے خراج عقیدت پایا ہے۔ اس سلسلے میں ایک فرانسیسی شاعر نے مرثیے کے انداز میں ایک طویل نظم لکھی ہے اور اس کا ترجمہ اردو انگریزی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اردو میں اس ترجمہ کو معصوموں کا ستارا“ کا نام دیا گیا ہے۔ اس فرانسیسی شاعر نے علی اصغرؑ اور

سکینہ کو گہرا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جو فرانسسی زبان میں اپنی مثال آپ ہے کیونکہ یہاں اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر بر سبیل تذکرہ اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اصل بحث تو انیس کی شخصیت اور شاعری سے ہے۔ میر انیس کا انداز بیان کچھ اس قدر انوکھا ہے کہ سننے والے تڑپ اٹھتے ہیں۔ خاص کر سکینہ بنت حسین کا کردار اس پیرائے میں پیش کیا ہے۔ جو شاعری کی دنیا میں لا جواب اور بے مثال ہیں۔

سکینہ چونکہ گھر کی سب سے چھوٹی بچی اور باپ کی لاڈلی بیٹی اور گھر میں سب کی چہیتی تھیں۔ انہیں یہ خوبیاں فاطمہ زہرا سے وراثت میں ملی تھی۔ اور ماں چچا و پھوپھی کی تربیت نے اس پر اور چار چاند لگا دئے۔ میر انیس نے انکو ایک بہت پیاری اور تیز زہن، پاک دامن اور صالحہ کے روپ میں ابھارا ہے۔ انکی زندگی کی دو تصویر پیش کی ہیں۔ شروع میں وہ ایک معصوم بچی اور سارے اہل بیت کی چہیتی جو اپنے گھر میں ہر ایک سے اپنی بات منوالیتی تھی خواہ وہ ماں ہوں یا پھوپھی ہوں اور دوسری طرف کر بلا کی خونی داستان جہاں اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اور اس لاڈلی بیٹی کے اندر سنجیدگی، متانت، صبر و استقلال کا بھرپور جذبہ دیکھنے میں آتا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ جب بچوں کو اپنے اوائل زندگی میں پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان بچوں کے مقابلے جو آرام اور آسائش سے زندگی گزارتے ہیں زیادہ سمجھ دار اور حساس ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں سکینہ کا کردار اس انداز میں ایام و عیش و طرب سے لیکر ایام مصائب تک مختلف مراحل میں جو پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیس نہایت مردم شناس اور رمزشناس اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اس بچی نے کبھی بھولی بھالی بچیوں جیسی باتیں نہیں کی ہیں۔ ہاں اگر ایک طرف کہیں اگر بھولی بھالی باتیں کی ہیں تو بوڑھوں کی سی بھی کہیں ہیں۔ وہ باپ چچا کی موت پر نوحہ خواں ہیں تو کبھی سب بھول کر نئے سرے سے ماں اور پھوپھی سے ضد کر لیتی ہیں کہ میرے بابا کہاں ہیں انہیں بلاؤ۔ اس چیز کو پیش کرنے میں

میرا نیس بہت ہی کامیاب شاعر مانے جاتے ہیں۔ ایک موقع پر ننھی سکینہ اپنے خاندان کے لوگوں پر محمل میں سوار خاندان کی حرم سرائی کی بھوک و پیاس کی شدت دیکھ کر بے قرار ہو جاتی ہیں اور کہتی ہیں۔

۴۱ ”چلائی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہہ دو کہیں خیمے کریں بپا
ٹھنڈی ہوا میں لے کے چلو تم پہ میں فدا

سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ جاہ ہے

تم تو ہوا میں ہو مری حالت تباہ ہے“ ۴۱

آخری مصرع میں شکایتیں انداز بڑا نرالہ ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ سامنے کتنی پریشانیاں ہیں نہ کوئی سایہ نہ کہیں پانی دستیاب ہے مگر بچی کا شکایتی انداز کتنا نرالہ ہے۔ جیسا کہ سنا گیا ہے کہ جس کو میر صاحب نے اتنی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس سے شکایت بھی ہو جاتی ہے اور شکایت کا انداز بھی نہیں ہوتا ہے مندرجہ زیل مصرعوں میں بچی کی والہانہ محبت کی تصویر کشی نہایت ہی اچھے انداز میں پیش کی ہے۔

۴۲ ”منہ رکھ کے منہ پہ بائی سکینہ نے یہ کہا
عاشق کو میرے پھر کے لایا مرا خدا
روتی تھی میں سنی بھی نہ تم نے مری صدا
بس اب کہیں نہ جائیو اچھے مرے چچا

اس بیکسی میں دلبر زہرا کا کون تھا

آئے نہ تم تو پھر مرے بابا کا کون تھا“ ۴۲

تین محرم کو حسینی قافلہ کر بلا کے میدان میں پہنچ گیا۔ اور حضرت حسینؑ اپنی بہن زینبؑ سے محو گفتگو ہیں۔ سکینہؑ دور سے باپ اور پھوپھی کو دیکھتی ہیں۔ اسی کیفیت کو میر صاحب نے مندرجہ ذیل بندوں میں قلم بند کیا ہے۔

۴۳ ”جا بیٹھی سکینہ بھی قدم جلد بڑھا کر
کہنے لگی منہ شاہ کی چھاتی میں چھپا کر
کس کس سے بلانے کے لئے میں نے کہا تھا
بابا تمہیں کب سے مرا دل ڈھونڈ رہا ہے
جب بچی دیکھتی ہے کہ باپ پریشان ہیں تو انکی پریشانی کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔
”کس بات کا اندیشہ ہے میں آپ کے قربان
خاطر بھی پریشان ہیں گیسوں بھی پریشاں
سونے کی نہ کچھ فکر ہے کھانے کا نہ کچھ دھیاں
کیا ہو گئے وہ لوگ کہ ہم جنکے ہیں مہماں
ہر مرتبہ کیوں اشکوں سے منہ دھوتے ہو بابا
کیا فاطمہ صغرا کے لئے روتے ہو بابا“ ۴۴

بعض مصرعوں میں مصائب اور پریشانی کی منظر کشی اس بے ساختہ انداز میں ہے اور ایک بچی کے احساس کی زندہ تصویر ایسی نکھنچی ہے جس سے بچی کا بے حد لگاؤ اور باپ کی والہانہ محبت کی جھلک پورے طور سے نمایاں ہیں۔ دیکھنے کی خاص چیز یہ ہے کہ باپ اور بیٹی کا پاک رشتہ اس معصوم انداز میں بیان کیا ہے جو اپنے آپ میں مثال ہے۔ اسی طرح دن گزرتے گئے شہادت حسینؑ کا دن قریب سے قریب تر آ گیا۔ لیکن اس نازک گھڑی میں حضرت حسینؑ اپنے مقدس مقصد کو پانے کے لئے اور اپنے فرض کی تکمیل کے لئے کوشاں ہیں۔ انسانی

فرائض کی ادائے گی کے لئے پوری جدوجہد جاری ہے۔ ایسی حالت میں شبِ عاشورہ آجاتی ہے۔ جہاں حق و باطل کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ حق پرستاروں کی حق پرستی اور ظالموں کے ظلم کے مظاہرے کا دن امام حسینؑ اپنی بہن کے ساتھ آنے والے دنوں کے مصائب اور بدلتے ہوئے احوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ بہن بھائی کو تسلی دے رہی ہیں ان حالات میں سکینہؑ کے حالات کا ذکر میرا نیس مندرجہ ذیل اشعار میں کرتے ہیں۔

”نہیں آئی ہے بیٹی کو سلا جائیے بابا
بس ہو چکیں باتیں اب ادھر آئیے بابا
بیٹی کی صدا سنتے ہی۔“

حضرت نے کہا میں تیری آواز کے قرباں
اللہ تم اب تک نہیں سوئی ہو میری جاں
تو سکینہ شکوہ کرتی ہیں۔

سونا تو گیا آپ کے ہمراہ ہمارا
میں جاگتی ہوں اور جہاں سوتا ہے سارا
امام حسینؑ محسوس کرتے ہیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ بچی کو بھی آنے والے وقت کے لئے تیار ہونا چاہئے۔

اچھی نہیں عادت یہ نہ رویا کرو بی بی
پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی
کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں
مجبو ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کے جائیں

تم پاؤ نہ ہم کو نہ تمہیں ہم کہیں پائیں
بی بی کہو پھر چھاتی پہ کس طرح سلائیں

جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
 برسوں جو رہے ساتھ وہ چھوٹ جاتے ہیں بی بی
 اپنی مثال دیکر سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب عمر تھی کم ہم بھی چھٹے تھے یوں ہی ماں سے
 سوتے تھے لپٹ کر یونہی خاتونِ حناں سے
 کوچ ان کا ہوا سامنے آنکھوں کے جہاں سے
 ماتم سے ملیں وہ نہ بکا سے نہ فغاں سے

یہ داغ یہ اندوہ و الم سب کے لئے ہیں
 ماں باپ زمانے میں صدا کسی کے جئے ہیں
 رات گزرتی ہے صبح عاشورہ نمودار ہونے والی ہے۔ امام حسینؑ پہلی رخصت کے لئے
 خیمے میں جاتے ہیں اور سیکینہ کا حال پوچھتے ہیں تو بہن جواب دیتی ہیں۔

ماں پاس نہ لیٹی نہ مری گود میں آئی
 بے آپ کے اس کو کبھی نیند آئی ہی بھائی

اور پھر زرد اشکوں کے انداز میں یہ کہنا
 تھمتا ہے کوئی باپ سے بچہ جو ہلا ہو؟
 پھر بھوک سے بے حال سیکینہ کو گود میں لے کر بھائی کے پاس آتی ہیں۔ حسینؑ بچی کی
 طرف ہاتھ پھیلا کر بڑھتے ہیں۔

بابا تیری اس چاند سی صورت پہ فدا ہو
 کیوں آ کے لپی نہیں کیا ہم سے خفا ہو
 بچی روٹھی ہوئی ہے اور باپ کا دل یہ سوچ کر تڑپ جاتا ہے کہ یہ نازوں کی پلی بچی کل

بے وارث دوالی ہو کر دشمنوں کے ظلم کا نشانہ بنے گی۔
 ہم ہوں گے کہیں تم کہیں جاؤ گی سیکینہ
 ڈھونڈو گی تو پھر ہم کو نہ پاؤ گی سیکینہ
 اور پھر جیسے خود اپنے سے باتیں ہونے لگتی ہیں۔
 چھوڑا نہ کبھی چار برس تک مرا پہلو
 منہ چھاتی پہ رکھ کر تمہیں سو جانے کی تھی خو
 واں ہوگا کہاں سر کے تلے باپ کا بازو
 اُٹ جائیں گے اب گردِ یتیمی سے یہ گیسو
 بچی باپ کی باتیں سن کر ان کی حالت دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔ آنے والی مصیبتوں کا
 دھندلا سا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

گودی میں گئی باپ کی گھبرا کے وہ بے آس
 رخ زرد تھا نیلے تھے لب لعل یہ تھی پیاس
 چاہنے والی بچی کی حالت کتنی حقیقی اور پراثر ہے؛
 منہ پر کبھی منہ ملتی تھی دے دے کے دعائیں
 لیتی تھی کبھی ننھے سے ہاتھوں سے بلائیں
 کہتی تھی کبھی گھر سے نہ حضرت کہیں جائیں
 روتی نہیں میں آپ نہ اب اشک بہائیں
 آنے دو اگر پیاس سے غش آئے گا بابا
 تم جیتے رہو، پانی بھی مل جائے گا بابا
 باپ کی باتیں کچھ سمجھ میں آتی ہیں کچھ نہیں آتی ہیں۔ مگر یہ احساس ہو چلا ہے کہ وہ مجھے

چھوڑ کر کہیں اور جا رہے ہیں۔

اس وقت کی باتوں سے مجھے ہوتا ہے وسواس
کیا آج کی شب کو بھی نہ رہے گا مرے پاس
پھر روٹھ کر کہتی ہے؛

پھر کل کی طرح نیند مری کھوؤ گے بابا
اور اٹھلا کر یہ کہنا دیکھئے۔

میں بھی وہیں سوؤں گی جہاں سوؤ گے بابا

دیکھتی ہے کہ بابا ہتھیار لگا رہے ہیں جانے کیا ہونے والا ہے،، ۴۴

جناب سیکینہ کی اضطرابی کیفیت اور اس کی باپ سے والہانہ محبت اور سیکینہ کی ہمدردی
کے جملے اور اسکی پوری کیفیت اور میدان جنگ میں پیش آنے والے واقعات اور ظالموں کے
ظلم اور سیکینہ کی اپنے باپ سے ناامیدی اور ان سے ملنے کی تمنا کا پورا نقشہ صالحہ عابد حسین نے
اپنی کتاب خواتین کر بلا میں اپنے خیالات کے اظہار کے ساتھ اور میر انیس کے مرثیے کی
روشنی میں ایک دل کش اور واضح تصویر کھینچی ہے جو ایک حقیقت بن کر سامنے آئی ہے۔

اب تک میر انیس کی مرثیہ نگاری میں ان کے کردار کا ذکر تھا اب ان سے ہٹ کر ان
خواتین کا ذکر ضروری ہے جن کا تعلق قاتلان حسین سے ہے۔ اس میں یزید کی بیوی ہندہ جو
ایک متقی اور پرہیزگار تھیں۔ اور بقول صالحہ عابد حسین کے جو امام حسین کے عقد میں تھیں لیکن
دوسرے لوگوں نے اس روایت کو مستند نہیں کیا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے مزید یہ ہی کہا ہے کہ
مرثیہ گو شعراء ایسی روایتوں کو ایک رومانی کیفیت کے لئے اپنا لیتے ہیں بہر حال ہندہ کا تعلق
ایک عرصے تک مدینہ میں اہل بیت سے تھا۔ اسے اہل بیت سے بے پناہ محبت تھی اور حضرت
زینب سے ایسی گہری وابستگی اور قلبی تعلق تھا وہ حسن جمال میں یکتا تھی اور اسی بنا پر یزید اس کی

باتوں کو رد نہیں کرتا تھا۔ اور ایسے یہ بھی علم تھا کہ ہند اہل بیت سے بہت قریب ہیں اور ان سے دلی لگاؤ ہیں۔ اس کے مد نظر یزید اپنی دشمنی کو بیوی سے پوشیدہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اہل بیت جن حالت میں مبتلا ہوئے اور یزید نے گھناؤنی سازش اہل بیت کے خلاف کی اسکی کانوں کان ہندہ کو خبر نہ تھی۔ حتیٰ کہ اہل بیت کو جب یزید نے قید خانے میں بھیج دیا اور حضرت حسینؑ کا سر خزانے میں رکھا، ان سارے واقعات کی خبر دمشق میں نہ کسی کو تھی اور نہ ہندہ کو ہی ملی تھی۔ لیکن جب حضرت زینبؑ کا اہل دمشق سے کچھ ربط اور ضبط ہوا اور ظلم ستم کی داستان لوگوں کے علم میں آئی تب لوگوں کی طرف سے لعنت و ملامت شروع ہوئی۔

ہندہ کے کردار میں بھی مرثیہ گو شعراء نے اس کی اہل بیت سے محبت اور عقیدت کو نمایاں کر کے دکھایا ہے مگر میر انیس نے جس ہندہ کی سیرت کشی کی ہے وہ ایک مضبوط شخصیت کی عورت ہے۔ وہ ایک ظالم کی بیوی ہے لیکن اسلام اور بانی اسلام اور اہل بیت سے اسکو بے حد لگاؤ ہے۔ وہ شوہر کو لعنت و ملامت بھی کرتی ہیں۔ اور آخر کار یزید کو مجبور کر دیتی ہیں۔ کہ وہ اہل حرم کو قید سے آزاد کر دے۔ ان واقعات میں کتنی تاریخی حقیقت ہے یہ نہیں کہا جاسکتا۔ مگر عورت کے کردار میں جو مضبوطی اور کشش ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ واقعہ کربلا میں میر صاحب نے ہندہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مگر جب اہل بیت قید و بند کی مصیبت جھیلے ہیں تو اس میں ہندہ کا کردار نظر آتا ہے۔ اہل بیت جہاں بند کئے جاتے ہیں وہ ہندہ کے قیام گاہ کے قریب تھا۔ اور وہاں سے اہل بیت کی آہ بکاؤ اور عبادت کی آوازیں ہندہ کے کانوں تک پہنچتی تھیں۔ ہندہ ان دردناک آوازوں سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اسکا کھانا پینا چھوٹ گیا اور نیند حرام ہو گئی۔ جب یزید نے اضطرابی کیفیت دیکھی تو ہندہ سے سبب پوچھا اس وقت دونوں میں جو گفتگو ہوئی اس کو میر صاحب نے مندرجہ ذیل لہجہ میں پیش کیا ہے۔

۳۵ ”پوچھا یزید نے کہ ہے کچھ بد مزہ مزاج
 بولی یہ ہند ہوتا ہے ہاں درد دل میں آج
 اور پھر جیسے ایک دم پھٹ پڑتی ہے دل میں کھولتا لاوا ابل پڑتا ہے۔
 ہے ظلم اور ستم کا ترے عہد میں رواج
 اپنے جگر کے زخم کا میں کیا کروں علاج
 تجھ کو تو عید ہے مجھے صدمے گذرتے ہیں
 یہ کون ہیں جو راتوں کو فریاد کرتے ہیں
 پھر بہت کچھ ملامت کرتی ہیں کہ تو نے ظلم و ستم پر کمر باندھی ہے۔ بے گناہوں کو،
 عورتوں و بچوں تک کو قتل کرتا ہے۔ پھر ان قیدیوں کا ذکر کرتی ہے جن کے نالہ و فریاد نے اسے
 بے چین و بے قرار کر رکھا ہے۔ آخر میں سیدھا سوال پوچھتی ہیں کہ انکا کیا جرم ہے؟ جس کی
 وجہ سے یہ ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔
 پھر طنز یہ انداز میں کہتی ہیں۔
 یہی کیا یہ لوگ منکر پیغمبر الہ؟
 یعنی تو جو خلیفہ رسول ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے، کیا تو نے انہیں اسلام کا منکر رسول و
 آل رسول کا دشمن ہونے کے باعث قید کیا ہے۔
 کیا دشمنی کچھ ان کو حسین و حسن سے ہے
 یزید کیا جواب دے خاموش بیٹھا ساری ملا متیں سنتا رہتا ہے۔ ہندہ خود ہی
 کہتی ہے۔

کوئی اگر کہے بھی تو میں مانتی ہوں کب
ابرار و حق پرست ہیں قیدی یہ سب کے سب
میں سن چکی ہوں انکی صدائے نمازِ شب
فاقوں میں بھی وہ کرتے ہیں تا صبح شکرِ رب

گرمی سے گو کہ سینوں میں دم انکے رکتے ہیں
ماؤں کے ساتھ سجدے میں بچے بھی جھکتے ہیں
ایک بیمار و زار نو جوان کی طاعت و زہد و عبادت کی آوازیں سن سن کر ہی وہ عقیدت
مند ہو چکی ہیں۔ کہتی ہیں۔

کہتے ہیں صبر و شکر اسے اللہ رے حوصلہ
شکوہ نہ طوق کا ہے نہ زنجیر کا گلہ
جاری ہے صبح و شام عبادت کا سلسلہ
ہر دم رواں ہے چشم سے اشکوں کا قافلہ“ ۴۵
یہاں ہندہ کی رقت قلب یزید کی قساوت قلب کی تصویر کشی میر صاحب نے کی ہے۔ جو
دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ایک طرف اہل بیت سے عقیدت اور ہمداری ہے اور
دوسری طرف زبردست نفرت اور دشمنی ہے۔

جب ہندہ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلیت قریب ہی قید خانے میں بند ہیں تو وہ وہاں
جانے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ کنیریں انہیں اچھے کپڑے اور زیورات پہننے کو کہتی ہیں۔ لیکن ہندہ
بالکل انکار کر دیتی ہیں اور کنیریں بگڑ جاتی ہیں۔ میرانیس نے اسکی تصویر کشی مندرجہ ذیل بند
میں کی ہے۔

۴۶ ”اک دم میں سوگواروں کو میں دیکھ آئی ہوں
کیسا لباس کیا کیسی شادی میں جاتی ہوں؟
رانڈوں کی حالت کا تصور کرتی ہے؟

کپڑے بدل کر رانڈوں میں جانا نہیں روا
ان میں چلی ہوں جن کے سروں پر نہیں ردا“ ۴۶
اوپر کے بندوں میں میرا نیس نے جو نقشہ کشی کی ہے وہ ایک بے مثال چیز ہے۔ اس
سے ہندہ کی عقیدت مندی کا پتہ چلتا ہے۔ ہندہ جب قید خانے میں پہنچتی ہیں اور دروازے
سے داخل ہوتی ہیں پھرے دار احتراماً سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ جس کو میر صاحب نے
مندرجہ ذیل بند میں پیش کیا ہے۔

”وحشت میں قید خانے کی جس دم نگاہ کی
ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کے کنیزوں نے آہ کی“

اور ہندہ تھڑا کر کہتی ہیں۔

ایسا بھی ظلم کرتا ہے کوئی جہان میں

بندے خدا کے بند ہیں ایسے مکان میں“ ۴۶

ہندہ جب پہنچتی ہیں اور اس دردناک مناظر کو دیکھتی ہیں تو اس کا دل کانپ جاتا ہے۔
اور اسکے ساتھ کی کنیزیں کہتی ہیں کہ بی بی اس خون خرابے کا منظر ہم سے نہ دیکھا جائے گا۔ پھر
ہندہ بگڑ کر جواب دیتی ہیں۔

۴۷ ”عبرت کا یہ مقام ہے لونڈی، خدا سے ڈر

آخر جو اس میں قید ہیں وہ بھی تو ہیں بشر

پھر دردناک لہجے میں کہہ اٹھتی ہیں۔

جانے وہی کلیجے پہ جس کے چھری چلے

ایسی نہ بات کہہ کہ خدا کو بری لگے“ ۷۴

مندرجہ بالا بندوں میں ہندہ کا صبر و ضبط و تحمل اور اہل بیت سے اسکی عقیدت اور شوہر کے ظلم و ستم کی سرزنش جس انداز میں ہندہ نے کی ہے جو حاکم وقت کی بیوی ہے اب اسکے جرمیمانہ کردار کی کھلے طور پر احتجاج اس بات کا ضامن ہے کہ یہ یزید کی فتح نہ ہو کر شکست تھی۔ ہر طرف سے اسے پھٹکار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ وہ بیوی جو یزید کی دوسری بیوی سے زیادہ قریب ہے اور یزید اسکی باتوں کو مانتا بھی ہے۔ مگر وہ اسکے اس فعل کو نفرت بھری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ جو یزید کی کھلی شکست ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کر بلا کے بعد“

جب حضرت حسینؑ کا سراہل بیت کو ہندہ کی کوششوں سے حوالے کیا جاتا ہے تو لوگ تعظیم کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میر انیسؒ نے اس منظر کو اپنے شعر میں پیوست کیا ہے۔

”تھراتے ہوئے خاک سے تعزیم کو اٹھے

قیدی سرشیر کی تصلیم کو اٹھے“

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب حضرت حسینؑ کا سراہل بیت کے حوالے کیا گیا تو اس وقت یزید خوف اور ندامت سے پریشان ہو گیا۔ اور اس پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔ جس کا نقشہ میر انیسؒ نے مندرجہ ذیل بند میں کیا ہے۔ جس میں میر صاحب نے ہندہ کی سرزنش جو اسنے اپنے شوہر کے اوپر بیہمانہ کردار پر لعنت و ملامت کی ہے۔

۲۸ ”یہ خواب ابھی دیکھ کر اٹھی ہوں میں مضطر
گھر میں مرے سر پیٹتے آئے ہیں پیمبر
مخد و منہ عالم کا سر پاک کھلا ہے
اور احمد مرسل کا گریباں پھٹا ہے
آگاہ نہ تھا فاطمہ کے رتبہ سے تو کیا
کچھ زینب و کلثوم کے رتبے کو نہ سمجھا
تو نے جو انہیں قید کیا بھوکا پیاسا
واللہ ہوئی فاطمہ کی روح کو ایذا

ماتم ہے اسی کا رسولِ عربی کو
زینب کی اسیری سے نہیں چین کسی کو“ ۲۸

مندرجہ بالا بندوں میں یزید کی اہل بیت کے ساتھ بے حرمتی اور ہندہ کی لعنت و
ملامت کو انیس نے ایک خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔ جس سے اس منظر کی تصویر
سامنے آجاتی ہے۔

اب اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ہندہ کا تعلق دشمنانِ اہل بیت کے خاندان سے ہے۔
مگر اسکی حق گوئی، صداقت اور فرض شناسی پورے طور سے نمایاں ہے۔ وہ ظلم کے خلاف آواز
اٹھاتی ہے اور حق کا ساتھ دیتی ہے اہل بیت سے اپنے قلبی لگاؤ کا اظہار کرتی ہے۔ خاندانِ اہل
بیت پر جو ظلم ڈھائے گئے اس سے ہراساں ہو جاتی ہیں۔ انکے مصائب اور پریشانیوں سے
دل برداشتہ ہو جاتی ہیں اور اپنے سفاک شوہر کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ ساتھ چھوڑنے کا مطلب
یہ ہے کہ ظلم ستم سے بے حد گریز ہے۔ گو وہ شوہر کے ماتحت ہے مگر نڈر اور حق گو ہے اور سیدھی
سچی اور مثالی عورت کا کردار ادا کرتی ہے۔

زوجہ خولی:-

خولی یزید کا قریب تر انسان تھا اور اس نے ہی حضرت حسینؑ کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ میر صاحب نے دشمنانِ یزید کی کئی عورتوں کا کردار نہایت ہمدرد اور شفقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جن دشمنانِ یزید کی عورتوں کی اور انکی خوبیوں کی تصویر کشی کی ہے اس میں خولی کی بیوی بھی ہے۔ ایک بیوی جس کا نام حضرت میہ تھا۔ وہ متقی اور پرہیزگار تھیں۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھیں۔ اہل بیت کی مداح ثنا خواں تھیں۔ ساتھ ساتھ اسے اہل بیت کے ساتھ بے حد خلوص و لگاؤ تھا اور اپنے شوہر کے قول و فعل سے الگ تھلگ تھیں۔ اور اسکے کردار کو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔ میر انیس عورتوں کی نفسیات کو اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔ یہ ایک عام فطرت ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں فطری طور پر حساس اور نرم دل ہوتی ہیں۔ ان کے دل بڑے نازک ہوتے ہیں۔ خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، جو وابستگی اور تعلق یزید کی کی فوج میں رہنے والے لوگوں کی بیویوں کو تھا اور اہل بیت سے جو انہیں ہمدردیاں تھیں وہ قابلِ مثال ہیں۔ یہ بات بھی یہاں واضح ہے کہ عورتیں اپنے شوہروں کے کردار سے خوش نہیں تھی۔ خود خولی کی بیوی بھی اہل بیت کیساتھ تھیں۔ اس نے حق کا ساتھ دیا اور باطل کی مخالفت کی جب خولی حضرت حسینؑ کا سر باندھ کر گھر میں لے جاتا ہے تو عورت پوچھتی ہے اس رومال میں کیا ہے۔ جس کی تصویر کشی میر صاحب نے مندرجہ ذیل مرثیے میں کی ہے۔

۴۹ ”خولی کو اس لعین نے جو سونپا سر حسینؑ

خیمے میں اپنے لیکے وہ پہنچا سر حسینؑ

رومال میں لعین نے جو باندھا سر حسینؑ

بسل سائن کے واسطے تڑپا سر حسینؑ

زہرا کانے ، علی ، نبیؐ کا ادب کیا
کوچ اس نے لیکے شاہ کا سر وقت شب کیا
اک فرسخ اس لعین کا مکاں واں سے دور تھا
اس بے حیا کی بی بیاں دو تھیں جدا جدا
اک بی بی حضر میہ تھی خوش خود پارسا
وہ زن نبیؐ اسد سے تھی جو گھر تھا دوسرا
شیلعہ تھیں دوستدار جناب بتول تھیں
وہ دونوں دل سے عاشق سبط رسول تھیں
جب اس بی بی نے رومال میں سر کو دیکھا تو خولی سے کہنے لگی۔

حیران ہو کے بولی وہ بی بی سیر
رومال میں یہ لایا ہے کیا چیز باندھ کر
ہے دُرّ شب چراغ جو ایسا ہے جلوہ گر
جس کی ضیاء سے ہو گیا روشن تمام گھر

کیا سانحہ ہے جس سے مراد ملول ہے

اس نے کہا کہ یہ سر سبط رسول ہے “ ۴۹

مندرجہ بالا بند میں خولی کی بیوی کی سعادت مندی اور حق پرستی کا بیان ہے خولی صبح
اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ صبح یہ سر یزید کے دربار میں پیش کیا جائے گا اور بہت پر جوش انداز
میں کہتا ہے کہ مجھے انعام سے مالا مال کیا جائے گا۔ مگر بیوی انکی اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتی
ہیں اور اس پر لعنت و ملامت کرتی ہے۔ شوہر اور بیوی کے درمیان جو مکالمہ ہے اسکو میر
صاحب نے ذیل کے مرثیے میں اجاگر کیا ہے۔

۵۰ ”کونے میں وقت صبح میں لے جاؤں گا یہ سر
ابن زیاد سے مجھے لینا ہے مال و زر
قتل حسین کی تو ہوئی ہے اسے خبر
دیکھا نہیں مگر سر سلطان بجرو بر

جب اس کو خون بھرا ہوا یہ سر دکھاؤں گا
اسکے صلے میں خلعت و انعام پاؤں گا
یہ سن کر بیوی نے جن الفاظ کا اظہار کیا اس میں المیہ ڈرامائی شان نمایاں ہے۔
چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولی وہ خوش خصال
ہے ہے یہ اس کا سر ہے جو تھا فاطمہ کا لعل
لوٹا یہ کس نے خانہء محبوب ذو الجلال
دنیا کے آفتاب پہ یوں آگیا زوال

وا حسرتا حسین سے زینب بچھڑ گئی
ہے ہے بتول پاک کی کھیتی اجر گئی
لاتے ہیں آدمی تو غنیمت میں مال و زر
لایا ہے گھر میں تو پسر فاطمہ کا سر
اور ظالم و لعین و بد آئین و بد گھر
سر کو حسین کے لئے پھرتا ہے در بدر

پیش خدا جو روز قیامت کے جائے گا
بتلا مجھے رسول کو کیا منہ دکھائے گا

بر باد دیں کیا طمع زر سے ہے غضب
تو کچھ ڈرا نہ روح پیمبر سے ہے غضب
لایا ہے سر حسینؑ کا لشکر سے ہے غضب
لٹکائے تھا یہ بے ادبی سر سے ہے غضب

جن و ملک تو روتے ہیں اور تجھ کو غم نہیں

ظالم یہ سر حسینؑ کا قرآن سے کم نہیں“ ۵۰

مندرجہ بالا مرثیے کے بند میں ایک بیوی کا اس کے شوہر کے برے کردار پر اس کی سرزنش کو میر صاحب نے اجاگر کیا ہے۔ جب پہلی بیوی نے اسکی کوئی حوصلہ افزائی نہ کی تو سر لے کر دوسری بیوی کے پاس پہنچا۔ دوسری بیوی بھی پاک دامن اور گونا گوں خوبیوں کی مالک تھی۔ اور اہل بیت سے اسے کافی عقیدت تھی۔ ان میاں بیوی کے مکالمے کو انیس نے مندرجہ ذیل مرثیے میں بیان کیا ہے۔

۵۱ ”لٹکا کے دست نخس میں سبط نبیؐ کا سر
بی بی جو حضرمیہؑ تھی آیا وہ اسکے گھر
تھی وہ بھی دل سے عاشق سلطان سے بحر و بر
ظالم ڈرا کے اس سے بھی پہنچے نہ کچھ ضرر

ناری نے کچھ نہ فرق کیا نا رونو ر میں
رکھا سر حسین چھپا کر تنور میں

کچھ زہر مار کر کے تو سو یا وہ کینسہ جو
اور تھی نماز شب کی زنِ مومنہ کو خو
جب بعد نصف شب کے اٹھی وہ بے وضو
اک روشنی سی گھر میں نظر آئی چار سو

بولی کہ تابہ چرخ ہے نور اس مکان سے
 اترا ہے کیا زمین پہ یہ چاند آسمان سے
 تھی رات لیکن اسکو ہوا دن کا اشتباہ
 بے ساختہ کہا کہ زہے قدرت الہ
 کیا نور کیا فروغ ہے کیا روشنی ہے واہ
 رکھتا نہیں کبھی یہ ضیا چودھویں کا ماہ
 یہ نور طعنہ زن ہے تجلی طور پر
 ہے برج آفتاب کا عالم تنور پر
 حیران ہو کے دل سے یہ بولی ذی شعور
 اٹھتی ہوں روز پر کبھی دیکھا نہیں یہ نور
 روشن بھی آج تو نہیں میں نے کیا تنور
 کھلتا نہیں یہ کچھ نہ کچھ اسرا رہے ضرور
 پر نور کیوں تنور سے سارا مکان ہے
 لیکن یہ روشنی ہے کہ تا آسمان ہے "اے

ان مندرجہ بالا بندوں سے یہاں دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں پہلی چیز تو رزمیہ شاعری میں
 میرانیس کا کردار اور دوسری اس کی دونیک بیویوں کے پاک دامنی اور حق پرستی کا بیاں۔ ایک
 بیوی روتی ہوئی جنگل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ ایک بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ
 ایک بیوی نے اس سرکوتندور سے نکال کر جو اس کے شوہر نے چھپایا تھا جانماز پر صبح تک رکھا اور
 عبادت کرتی رہی اور گلاب جل چھڑکتی رہی اور ماتم کرتی رہی۔ اس طرح سے انیس نے دونوں
 بیویوں کے دل میں اہلیت کے لئے جو محبت اور عقیدت تھی اس کو دیکھایا ہے۔

جس طرح سے اہل بیت کی خواتین کی سیرت نگاری ہم نے اپنے اس مکالمے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ خواتین اہل بیت کی شجاعت ایثار اور قربانی ناقابل فراموش ہے اور رہتی دنیا تک ایک جیتی جاگتی تصویر بن کر قائم و دائم رہے گی۔ اس کے مد مقابل وہ خواتین جو اہلیت کے دشمنان کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں انھوں نے بھی ایثار اور قربانی کا ایک گراں قدر نمونہ پیش کیا ہے۔ اہل بیت سے ان کی ہمدردی اور والہانہ عقیدت بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں خولی کی دو بیویاں اور ہندہ بھی اس میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

کنیران اہل بیت کا کردار:-

میر صاحب نے خواتین اہل بیت کے کردار کے ساتھ ساتھ عام عورتوں کی طبیعت میں شرافت خدا پرستی اور ایثار و قربانی کے جذبے کو بھی اجاگر کیا ہے۔ تاریخ کر بلا میں جن عورتوں کا ذکر ہے ان کو انیس صاحب نے شاعرانہ انداز میں نہایت دلکشی اور جاذب اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ میر صاحب نے بغیر کسی اور تصنع کے بالواسطہ طور پر جو سیرت نگاری کی ہے اور اس میں خاص کر خواتین کی ظلم و ستم کے خلاف گردانی اور توکل علی اللہ ایک جانب حکومت اور اقتدار کی ہوس دوسری جانب یزید کو دولت اور عہدہ کے لالچ نے اندھا کر دیا تھا۔ اور اس اندھے پن میں اس نے حق سے منھ موڑ لیا اور باطل پرستی کا جذبہ اس کے دل میں گھر کر گیا۔ جس طرح سے یزیدی فوج اور اسکے ہم نواؤں نے ظلم کی ایک لافانی مثال پیش کی ہے عورتوں نے بانی اسلام اور اہلیت سے عشق اور حق و صداقت پر فدا ہونے کا جو گہرا جذبہ اور ایثار و قربانی کی جو مثال پیش کی وہ لوگوں کے ذہن میں ہمیشہ باقی رہے گا۔

جن عورتوں کا تعلق کنیران اہلیت سے ہے ان میں سے کچھ تو پہلے سے خاندان

رسول سے بہت قریب تھیں اور ان پر اہل بیت کی سیرت کا گہرا اثر تھا۔ خاس کر جناب فضہؓ، ہندہؓ، اور شہریں کا نام سرفہرست ہے۔ کچھ عورتیں ایسی تھیں جنہیں اہل بیت اور رسول کے خاندان سے کافی محبت تھی اور اسلام کی پرستار بھی تھیں۔ ان کنیزوں میں اگر دیکھا جائے تو جناب فضہؓ کا کردار سب سے اونچا ہے یہ فاطمہ زہراؓ کی کنیز تھیں اور ان پر فاطمہ زہراؓ کی صفات کا کافی اثر تھا۔ ظاہر بات ہے جس کی صفات اور کردار میں خاندانِ نبوت کے جھلک اور اہل بیت سے والہانہ وابستگی اور جس کے اندر خاندانِ رسول جیسا ایثار و قربانی کا جذبہ اور اسلام کی گہرائی کا اثر ہو اسکے اندر سچی مومنہ کی شان ایک فطری چیز ہے۔ فضہؓ کا تعلق فاطمہ زہراؓ سے بہت کم سنی میں ہوا اور واقعہ کربلا کے وقت وہ عمر دراز ہو چکی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک بار فاطمہؓ نے اپنے والد سے درخواست کی کہ انہیں بندی کنیزوں میں سے ایک عطا کی جائے مگر رسول اللہ نے اس سے انکار کر دیا۔ اور یہ کہا کہ لوگ تم سے زیادہ حاجت مند ہیں۔ لیکن کچھ دنوں بعد پیغمبر نے فضہؓ کو اپنی بیٹی کو دے دیا اور کہا کہ اس کے ساتھ بہن جیسا سلوک کرنا یہ تمہاری بہن ہے۔ بیٹی نے باپ کی بات کو پورا پورا نبھایا اور اس کے ساتھ بہن جیسا سلوک کیا۔ یہاں تک کے کھانے پینے میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اور گھر کا کام باری باری کرتیں اور برابری کا یہ عالم تھا جس کو میر صاحب نے اس شعر میں واضح کیا ہے:-

”پاس اپنے سدا فضہؓ کو بٹھلاتی تھیں زہرا

جب اس کو کھلا لیتی تھیں تب کھاتی تھیں زہرا“

جب مالکہ اور کنیز میں ایسا تعلق ہو تو وہاں ایک دوسرے پر جان چھڑکنے جیسی نوبت آ سکتی ہے۔ اور جب حضرت فاطمہ زہراؓ اچھوٹے بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی تو فضہؓ نے انکی ذمہ داری قبول کر لی اور اسے آخر تک نبھایا۔ اسی وجہ سے وہ فاطمہ زہراؓ کے چاروں بچوں میں معزز اور محبوب تھیں۔

میر انیس نے فضہؑ کی ذات و صفات سیرت اور عادت کو بڑے خوبصورت ڈھنگ سے پیش کیا۔ اس کے اندر اہل بیت سے محبت ایثار، دلی لگاؤ اور اہل بیت کی ہم نوائی جیسی خوبیوں کو اس کے ساتھ جوڑ کر واقعہ کربلا میں پیش کیا ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ انکے کردار کو میر صاحب نے ایسا پیش کیا ہے جو واقعہ کربلا میں ایک مثالی اور قابل، تعریف رول کہا جاسکتا ہے۔ میر انیس نے اس کا نقشہ مندرجہ ذیل اشعار میں کھینچا ہے اور صالحہ عابد حسین صاحبہ نے اس پر جو نوٹ دیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

۵۲؎ اتنے میں یہ فضہؑ علی اکبر کو پکاری

لو دیکھ چکی چاند ید اللہ کی پیاری

عادت ہی کہ وہ دیکھتی ہیں شکل تمہاری

آنکھوں کو کئے بند یہ فرماتی ہیں واری

آئے تو رخ اکبر زیباہ کو دیکھوں

شکلِ مہِ نودِ یکھ چکی ماں کو دیکھوں

فضہؑ کا رتبہ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ عرب میں لونڈیاں پردہ نہیں کرتی تھیں

فضہؑ آزاد خواتین کی طرح پردے کی پابند ہیں۔ چنانچہ حضرت عباسؑ ایک جگہ کہتے سنائی

دیتے ہیں:

فضہؑ کبھی بے مقنع و چادر نہیں نکلی

لیکن جب اہل بیت کا کوئی پیام پہنچانا ہوتا ہے تو یہ فرض فضہؑ ادا کرتی نظر آتی ہیں

۔ کبھی خود ہی امام حسینؑ یا عباسؑ کو بچوں کی حالت سے آگاہ کرتی ملتی ہیں۔ صبح عاشورہ نمازِ فجر

کے بعد دشمن تیروں کی بوچھاڑ کرتا ہے تو:

اکبر سے مڑ کے کہنے لگے سرورِ زماں
 باندھے ہیں سرکشی پہ کمرِ شکرِ گراں
 تم جا کے کہہ دخیمے میں یہ اے پدر کی جاں
 بچوں کو لے کے صحن سے ہٹ جائیں بی بیاں
 غفلت میں تیر سے کوئی بچہ ہدف نہ ہو
 ڈر ہے مجھے کہ گردنِ اصغر ہدف نہ ہو
 لیکن حسین ابھی بیٹے سے یہ کہہ ہی رہے ہیں کہ وفا شعارِ فضلہ کی آواز آتی ہے:
 کہتے تھے یہ پسر سے شہِ آسماں سریر
 فضلہ پکاری ڈیوڑھی سے اے خلق کے امیر
 ہی ہی علی کی بیٹیاں کس جاہوں گوشہ گیر
 اصغر کے گاہوارے تلک آگرے ہیں تیر
 گرمی میں ساری رات تو گھٹ گھٹ کر روئے ہیں
 بچے ابھی تو سرد ہوا پا کے سوئے ہیں
 بچوں کی دردناک حالت کا پورا نقشہ کھینچ رہی ہے۔
 باقر کہیں پڑا ہے سکیںہ کہیں ہے غش
 گرمی کی فضل یہ تب و تاب اور یہ عطش
 رو رو کے سو گئے ہیں صیغرانِ ماہ و ش
 بچوں کو لے کے یاں سے کہاں جائیں فاقہ کش
 یہ کس خطا پہ تیر پیا پے برستے ہیں
 ٹھنڈی ہوا کے واسطے بچے ترستے ہیں “۵۲

جب حضرت عباسؓ کی شہادت کی خبر سن کر جناب سیکینہؓ بے قرار ہو جاتی ہیں اور میدانِ جنگ میں جانے کی کوشش کرتی ہیں تو جناب فضہؓ کو سمجھاتی ہیں۔ اس کا نقشہ میر صاحب نے اس طرح سے پیش کیا ہے۔

”یوں کہنے لگی دوڑ کے فضہ جگر افگار

جاتی ہو کہاں تیر نہ مارے کوئی خونخوار“

جب کوئی سانحہ پیش آتا ہے اور لوگ صدمہ سے نڈھال ہو جاتے ہیں تو اس وقت باہر کے لوگ صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہیں تو وہی چیز فضہؓ نے خاندانِ اہل بیت کے لئے کیا ہے۔ میر انیس صاحب نے فضہؓ کے کردار کو بہترین پیرائے میں پیش کیا ہے وہ اہلیت کے خاندان سے نہ تھیں صرف ایک کنیز تھی۔ اس کے اندر وہ باتیں نہیں تھیں جو اہل بیت کی عورتوں میں ہوتی ہیں وہ ایک غریب خاندان کی تھی جو جنگ میں قیدی بن کر آئی تھیں لیکن خوش نصیب تھیں کہ اسے فاطمہ زہراؓ کا سایہ نصیب ہوا۔ ان کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں مگر قیاس یہ ہے کہ ان کے بچپن یا جوانی کا زمانہ ہوگا۔ کیونکہ واقعی کر بلا ان کے اہل بیت سے جڑنے کے 60 سال بعد پیش آیا تو واقعہ کر بلا کے وقت ان کے بڑھاپے کا زمانہ رہا ہوگا۔ اور ان کے انتقال کے بعد اس کے بچے بھی فاطمہ زہراؓ کے خاندان سے جڑے رہے۔ فضہؓ نے اہل بیت کے ساتھ صبر کیا اور پریشانیاں جھیلیں اور صبر و تحمل سے کام لیا۔ میر صاحب نے یہ دکھایا ہے کہ خاندانِ رسول کی پروردہ کنیز کتنے اعلیٰ صفات کی مالک ہو گئی اور فضہؓ کا کردار ایک لاثانی کردار ہے۔ ان سارے حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی مسلمان عورت اس مقام کو نہیں پہنچ سکی جو مقام جناب فضہؓ کو کنیزوں میں حاصل تھا۔

شیریں کا کردار:-

اہل بیت کی کنیزوں میں شیریں کا بھی نام آتا ہے۔ وہ ایرانی تھی انکا تعلق ایران سے

تھا وہ بہت ہی کم عمر میں قیدی بن کر آئی تھی۔ جن قیدیوں کے قافلے میں شہر بانو تھیں اس قافلے میں شیریں بھی تھیں۔ شہر بانو نے انکی دیکھ بھال اولاد کی طرح کی اور آزاد کر کے دمشق کے ایک ثروت مند آدمی سے شادی کر دی۔ اسی وجہ سے انہیں امام حسینؑ اور شہر بانو سے گہرا تعلق تھا۔ میرانیس نے شیریں کا جو کردار پیش کیا ہے وہ ایک معمولی لونڈی نہیں بلکہ سچی مسلمان اور عاشقِ اہل بیت کی شکل میں ان کا کردار پیش کیا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ شہر بانو کا تعلق شیریں سے بہت کم سنی سے ہی تھا۔ جس وقت شیریں کی رخصتی ہوئی تو وہ بے قرار ہوئی جس کا نقشہ میرانیس نے مندرجہ بند میں کھینچا ہے۔

۳۳ شیریں کے یہ سن کر ہوئے اشک آنکھوں سے جاری
لیں ہاتھوں سے بانو کی بلائیں کئی باری
سجاد کو لے گود میں بولی کہ میں واری
اب تم سے جدا ہوتی ہے لونڈی یہ تمہاری
خط بھیج کے اپنا مرا دل شاد کرو گے
اس پالنے والی کو کبھی یاد کرو گے

صدقے گئی خدمت کو مری بھول نہ جانا
جب ہونے لگے بیاہ تو لونڈی کو بلانا
سہرا مجھے اس چاند سی صورت پہ دکھانا
اس سمت سفر ہو تو میرے گھر میں بھی آنا

نزدیک جو آنے کی خبر پاؤں گی واری
چھاتی میری امڑے گی میں آپ آؤں گی واری
بجائے بزرگوں سے کہنے کے ننھے بچے سے دل کا حال کہنا عین فطرت کے مطابق ہے

پھر پاؤں پہ سر حضرت زینب کے جھکایا
شفقت سے گلے شاہ کی خواہر نے لگایا
جب آپ کو اسنے قدمِ شہ پہ گرایا
سب روتے تھے حضرت کو بھی رونا بہت آیا

بانو کے نہ قدموں سے جدا ہوتی تھی شیریں
نعلین سے منہ ملتی تھی اور روتی تھی شیریں، ۵۳

اس گھر کی پروردہ لڑکی کی رخصتی کا میر صاحب نے کس انداز میں نقشہ کھینچا ہے اور
رخصتی کے وقت شیریں کی اس کیفیت کو دکھایا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اس گھر سے
کتنی والہانہ محبت تھی۔

انیس انسانی فطرت خاص کر نسوانی فطرت سے واقف ہیں۔ اور اسکی مرقع کشی انہوں
نے شیریں کے کردار میں کی ہے اہل بیت میں مردوں پر رونے کی قماست تھیں۔ وہ لوگ ضبط
و برداشت کا نمونہ تھے۔ جب کسی ہمدرد اور غم گسار کو دیکھتے تو دل تڑپ اٹھتا تھا۔ جس سے
گریہ و ماتم ظاہر ہوتا تھا۔ صدموں سے جو شہر باٹو کی حالت ہوئی شیریں نے اسکی پہچان کی اور
میر صاحب نے اس کی تصویر کشی کی جو صالحہ عابدہ حسین کے نوٹ کے ساتھ مندرجہ ذیل ہے۔

۵۴ ”شیریں یہ رو کے کہتی تھی بانو سے بار بار

بتلاؤ تم کدھر مری بی بی ہے میں نثار

شیریں سے رو کے بولی یہ کبریٰ جگر فگار

کیا کہتی ہو یہی تو ہیں بانوئے نام دار

قیدی ہیں کو کھ اجڑ گئی اور مانگ جل گئی

وارث شہید ہو گیا صورت بدل گئی

مصائب انسان کے ذہن کے ساتھ ساتھ جسم پر بھی گہرا اثر چھوڑتے ہیں اکثر دیکھا گیا ہے کہ سخت دکھ یا صدمے نے کسی کو چند گھنٹوں میں بدل ڈالا۔ اہل بیت رسول کی مصائب کی انتہا دکھانے کے لئے انیس بتاتے ہیں کہ شہر بانو اور زینب کی صورتیں اتنی بدل گئی تھیں کہ ان کی پرانی جاننے والیاں تک نہ پہچان سکتی تھیں:

قدموں پہ گر کے تب وہ پکاری بہ درد و غم
یہ حال ہو گیا مری بی بی کا ہے ستم
پہچانوں کیا کہ بال ہیں بکھرے کمر ہے خم
ماتھے سے خون بہتا ہے آنکھوں پہ ہے ورم

چھاپے ہیں خاک کے رخ نیکو پہ ہے غضب

نیلے نشان ہیں چاند سے بازو پہ ہے غضب

کیا مصوری ہے؟ لگتا ہے شیریں کے ساتھ ہم بھی اپنی آنکھوں سے شہر بانو کی وہ حالت دیکھ رہے ہیں جو یزیدی فوج کے ظلم و ستم نے کر دی تھی۔ اب شہر بانو کو ضبط کی تاب نہیں رہتی۔

بانو پکاری کیا کہوں شیریں میں اپنا حال
زہرا کا باغ ہو گیا مقتل میں پائمال
اکبر جوان تھے علی اصغر تھے خرد سال
بے جرم قتل ہو گئے وہ مرے نونہال

دونوں کے سر قریں سر شاہ زمن کے ہیں

برچھی کے پھل پہ پھول ہمارے چمن کے ہیں“ ۵۴

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ایک شاعر ایک مصور ہوتا ہے۔ یہاں میر انیس صاحب نے جو تصویر کشی کی ہے اور جس شاعرانہ انداز میں پر اثر دل گداز اور دل نشیں منظر بیان کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ میر انیس صاحب اس فن کے سچے مصور ثابت ہوئے شیریں کی اہل بیت سے والہانہ محبت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دشمن حضرت حسینؑ کا سر اور اہل حرم کو لیکر دمشق روانہ ہوتے ہیں۔ شیریں اس موقع پر حسرت سے آنسو بہا کر رہ جاتی ہیں الغرض کنیران اہل بیت جس طرح سے اہل بیت سے والہانہ لگاؤ رکھتی تھیں ان میں فضہ اور شیریں کا نام سرفہرست ہے مگر وہ کنیریں جو دشمنوں کے قبضے میں تھی انکی بھی اہل بیت سے دلی وابستگی کچھ کم نہ تھی اور انہوں نے بھی ایک مثالی کردار پیش کیا ہے۔ جس میں یزید اور خولی کی بیویاں بھی قابل ذکر ہیں۔

کچھ عورتیں ایسی ہیں جنکا تعلق اہل بیت سے پہلے سے رہا ہے اور کچھ ایسی ہیں جنکا واسطہ اہل بیت سے پہلے سے نہیں تھا۔ انہوں نے اہل بیت کے لوگوں کو دیکھا بھی نہیں تھا مگر انہیں اہل بیت سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ بانی اسلام اور اسکے خاندان کی فدائی اور جاں نثار تھیں۔ انہیں جب امام حسینؑ کی شہادت کی خبر ملی تو انہوں نے ظلم و استبداد کے خلاف زبر دست احتجاج کیا۔ یہاں تک کہ وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئیں میر صاحب نے واقعہ کربلا کے ان عام کرداروں کی خوبی اور بڑھائی کو پوری طرح سے قلم بند کیا اور انہیں کردار کو مرثیوں کے انداز میں پیش کیا۔ کچھ گم نام عورتیں ایسی بھی ہیں جن کو میر انیس نے زندہ و جاوید بنادیا۔ اور یہ بھی پیش کیا کہ وہ عورتیں جنہوں نے اپنے شوہر کی لعن و طعن کی ان میں بنی اسد کی عورتیں، کوئی عورتیں، شامی عورتیں شامل ہیں۔ جن میں حارس کی بیوی ہے حارس کی بیوی کوفہ کی رہنے والی تھی۔ یہ وہی کوفہ ہے جہاں کے لوگوں نے حضرت حسینؑ کو بیعت کے لئے بلایا تھا۔ ان سے اہل بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جب حضرت مسلم کو کوفہ میں قتل کیا گیا اور انکے

دونوں بچوں کو بے رحمی سے تہ تیغ کیا گیا تو اس پر عورتوں نے احتجاج کیا مگر وہ بے بس اور مجبور تھیں۔ کیونکہ یزیدی فوج نے انسانیت اور شرافت کے جامہ کو اتار دیا تھا اور ظلم ستم کو اپنا ہتھیار بنالیا تھا۔ حارس نے جب بچوں کو قتل کیا تو راستے سے اپنی بیوی کو ہٹا دیا بیوی پر اسکا زبردست اثر پڑا جس کا نقشہ میرا نیس نے مندرجہ ذیل بند میں کھینچا ہے۔

۵۵۔ جب لے کے چلا گھر سے انہیں قتل کی خاطر
 زوجہ نے یہ کہہ کر مرے پاؤں پہ رکھا سر
 مہماں تیرے گھر آئے ہیں یہ دونوں مسافر
 لے انکے عوض کاٹ لے سر ہے مرا حاضر
 تقصیر جو کچھ ان سے ہوئی ہے وہ بخل کر
 ہے ہے مجھے مہمانوں کے آگے نہ نخل کر

اللہ تو معصوموں کے اب چھوڑ دے بازو
 کیوں کھنچتا ہے بچوں کو پکڑے ہوئے گیسو
 تلوار کو کر میان میں ڈرتے ہیں یہ گل رو
 قربان میں یہ چپ ہیں بھرے آنکھوں میں آنسو
 کس یاس سے ہے ہر مہمانہ تکتے ہیں ہیں دونوں
 دہشت سے تیری کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں دونوں

یہ کہہ کے جو بچوں کو چھڑانے لگی ایک بار
 جھنجھلا کے میں بولا تجھے کیا ان سے سروکار
 جادو رہو کہنا ترا مانوں گا نہ زہار
 میں قتل کروں گا یہ ہیں حاکم کے گنہگار

اب حلق سے معصوموں کے شمشیر ملے گی
 سران کے دکھاؤں گا تو جاگیر ملے گی
 سمجھا نا نہ ہرگز وہ مرا دھیان میں لائی
 جھنجھلا کے اس ضرب ستم میں نے لگائی
 ایک وار میں ساعد سے گری کٹ کے کلائی
 چلا کے لگی دینے دہائی پہ دہائی
 اور پھر اس حالت میں ۔

مظلوموں کی لے لے کے بلائیں یہ پکاری
 اب تم سے جدا ہوتی ہے لونڈی یہ تمہاری
 شکوہ نہ مرا کچھو زہرا سے میں واری
 کس طرح بچاؤں مجھے تلوار ہے ماری
 مجبور ہوں طاقت نہیں اٹھنے کی زمین سے

اللہ بچائے تمہیں اس دشمن دین سے “۵۵
 مندرجہ بالا اشعار میں جذبے کی شدت اور صداقت کو آئینے کی شکل میں قارئین کے
 سامنے پیش کیا ہے۔ جبکہ بیوی با آواز بلند یہ کہتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ہے جو ان معصوموں کو ظلم
 کے ہاتھوں سے بچائے۔ صالحہ عابد حسین نے اس منظر کو مندرجہ ذیل اقتباس میں میرا نیس کی
 قلمی طاقت اور اندازِ بیان کو لیکر نہایت بہترین انداز میں ایک حیوانیت کی تصویر کھینچی ہے۔ جو
 مندرجہ ذیل ہے:

۵۶ ”اس واقعہ میں انیس نے ایمان و کفر کا شرافت و سفاکی کا انسان و درندے کا فرق
 کس خوبی سے دکھایا ہے ایک طرف ایک ظالم مرد ہے جو جاہ و منصب کی طلب میں بدتر مظالم

ڈھانے سے گریز نہیں کرتا۔ جو حیوانیت سے بھی بڑھ کر شیطانیت کے درجے پر اتر آتا ہے۔ وہ نمائندہ ہے ان عہد شکن جابر و بزدل کوفیوں کا جنہوں نے حسین سے دغا کی اور خود انکے قتل میں حصہ لیا تھا۔ دوسری طرف انکی گم نام بیوی ہے۔ کوفی عورتوں کی نمائندہ جن کے دل میں ایمان کی شمع روشن ہے بانی اسلام اور اسکے اہل بیت کی محبت جلوہ گر ہے۔ وقت آنے پر انکی ایک بہن جرات، شجاعت، ایمان و یقین، انسانیت و شرافت کی چٹان بن کر ظالم شوہر کے سامنے ڈٹ جاتی ہے اور اسکے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد مرتے مرتے بھی مظلوم بچوں کی حمایت کا نعرہ اسکے لبوں پر رہتا ہے۔ وہ شہید مومنہ ختم ہو جاتی ہیں۔ مگر داستان کر بلا کے ساتھ اس بے نام کوفی عورت کا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ جاتا ہے اور اردو داں طبقے کو اس دل کش، اس حسن و خوبی سے روشناس کرانے کا کام انیس انجام دیتے ہیں“ ۵۶

میری رائے میں صالحہ عابد حسین نے جو کہا ہے کہ ایک باغی اور ظالم شوہر کی ستم ظریفی اور معصوموں کے خلاف ایک بے بس بیوی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور شوہر کو لعنت و ملامت کرنا اللہ کی مدد چاہنا اور اہل بیت سے والہانہ عقیدت کا اظہار کرنا یہ اعلیٰ خصوصیت زوجہ حارث کی ہے۔ جو اس شہر کی رہنے والی تھیں جس شہر کے لوگوں نے ظلم و ستم میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھیں حاصل کلام یہ کہ زوجہ حارث ایک مثالی بیوی تھیں۔ اور سچی اور پکی مومنہ عورت جس کو پیغمبر اسلام سے سچی محبت اور عقیدت اور ان کی اولاد سے بے پناہ محبت تھیں۔

حواشی

- ۱۔ انیس کے مرثیے، صالحہ عابد حسین، ترقی اردو بیونئی دہلی ص ۴۲-۴۱
- ۲۔ ایضاً ص ۴۴
- ۳۔ حوالہ مذکور ص ۴۵
- ۴۔ خواتین کربلا، صالحہ عابد حسین، جمال پرنٹنگ پریس دہلی، جنوری ۱۹۷۳ء ص ۱۴۰
- ۵۔ میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، ڈاکٹر اکبر حیدری، سرفراز قومی پریس لکھنؤ ص ۱۱۸
- ۶۔ ایضاً ص ۱۱۹
- ۷۔ انیس کے مرثیے، صالحہ عابد حسین ص ۳۰۰
- ۸۔ میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، ص ۱۲۲
- ۹۔ انیس کی مرثیہ نگاری، مرزا جعفر علی خاں لکھنوی ص ۱۱۳
- ۱۰۔ ایضاً ص ۱۱۶
- ۱۱۔ میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر ص ۱۲۳
- ۱۲۔ حوالہ مذکور ص ۱۲۳
- ۱۳۔ حوالہ سابق ص ۱۲۴
- ۱۴۔ ایضاً ص ۱۲۴

-
-
- ۱۵- میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر ص ۱۲۴
- ۱۶- ایضاً ص ۱۲۵-۱۲۷
- ۱۷- حوالہ مذکور ص ۱۲۷
- ۱۸- حوالہ سابق ص ۱۲۸
- ۱۹- میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر ص ۱۲۸-۱۲۹
- ۲۰- ایضاً ص ۱۳۰-۱۳۱
- ۲۱- خواتین کربلا، صالحہ عابد حسین، ص ۳۳۴
- ۲۲- ایضاً ص ۳۴۵
- ۲۳- حوالہ مذکور ص ۱۴۶-۱۴۵
- ۲۴- حوالہ سابق ص ۱۴۹
- ۲۵- خواتین کربلا ص ۱۶۹-۱۷۰
- ۲۶- ایضاً ص ۱۷۳
- ۲۷- حوالہ مذکور ص ۱۸۱-۱۸۲
- ۲۸- حوالہ سابق ص ۳۳
- ۲۹- ایضاً ص ۳۵
- ۳۰- خواتین کربلا ص ۳۷-۳۸
- ۳۱- ایضاً ص ۵۶
-

۶۰ ص	۳۲۔ حوالہ مذکور
۶۱ ص	۳۳۔ ایضاً
۶۴ ص	۳۴۔ خواتین کربلا
۷۸-۷۹ ص	۳۵۔ ایضاً
۹۶ ص	۳۶۔ حوالہ مذکور
۱۰۱-۱۰۲ ص	۳۷۔ حوالہ سابق
۱۰۵-۱۰۶ ص	۳۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے خواتین کربلا
۱۰۷ ص	۳۹۔ ایضاً
۱۰۷ ص	۴۰۔ حوالہ مذکور
۱۱۱ ص	۴۱۔ ایضاً
۱۱۱ ص	۴۲۔ حوالہ سابق
۱۱۸ ص	۴۳۔ خواتین کربلا
۱۱۹-۱۱۲ ص	۴۴۔ ایضاً
۲۱۶-۲۱۷ ص	۴۵۔ حوالہ مذکور
۲۲۲ ص	۴۶۔ حوالہ سابق
۲۲۳ ص	۴۷۔ خواتین کربلا
۲۳۱ ص	۴۸۔ ایضاً

-
- | | |
|-----------|--------------------------------|
| ۱۳۷ ص | ۴۹۔ میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر |
| ۱۳۸-۱۳۷ ص | ۵۰۔ ایضاً |
| ۱۳۹-۱۳۸ ص | ۵۱۔ حوالہ مذکور |
| ۱۸۶-۱۸۵ ص | ۵۲۔ ایضاً |
| ۲۰۱-۲۰۰ ص | ۵۳۔ حوالہ مذکور |
| ۲۱۱-۲۱۰ ص | ۵۴۔ ایضاً |
| ۲۴۶-۲۴۵ ص | ۵۵۔ حوالہ سابق |
| ۲۴۷ ص | ۵۶۔ ایضاً |
-

حاصل مطالعہ

حاصل مطالعہ

مجھے دورانِ مطالعہ بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی اور مختلف ادباء اور شعراء کی رائے کو میں نے ایک تنقیدی زاویہ ہائے نظریے سے بغور چھان بین کی اور خاص طور سے شہیدانِ کربلا اور خواتینِ کربلا کی قربانیوں اور جذبہ و ایثار کا بڑے ہی غور و خوص کے بعد ان سب کا جو تجزیہ کیا تو ان میں بہت سی باتیں سامنے آئیں اور کچھ باتیں ایسی بھی ملیں جن میں مبالغہ کا بھی اثر ہے اور حقائق کی سے بھی ان میں کچھ خامیاں نظر آئیں یوں تو جیسا کہ کہا گیا ہے کہ شاعر کچھ چیزیں ماحول کے مطابق پیش کرتا ہے اس میں بہت سی چیزیں خیالی ہوتی ہیں بہت سی تصوراتی ہوت ہیں۔ جن میں یہ بھی ہو سکتا ہے وہ بھی ہو سکتا ہے کا گمان گزرتا ہے۔ اور اسے اپنے فکری انداز اور اپنے ذہن کی پیداوار کو اس خوبصورتی سے پیش کرتا ہے کہ وہ بالکل حقیقت کی شکل میں نظر آتی ہیں، جیسے ایک جگہ کہا گیا ہے کہ:

ع اُن کے بازو میں تو زہرہ علی گریہ کنناں پھرتے ہیں

یہ مصرع حضرت حسینؑ کی شہادت کے بعد کا ایک منظر ہے جسے میر انیس نے پیش کیا ہے لیکن اس وقت حضرت علیؑ با حیات نہیں تھے اور یہاں وہی خیالی تصویر پیش کی گئی ہے۔ واقعاً یہ خیالی تصویر ہے لیکن حقیقت کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے دوسری جگہ یہ مصرع بھی کہا ہے۔

ع لاش کے بابا کو لائے ہائے زین العابدین

یہ مصرع اس وقت کہا گیا ہے جب حضرت حسینؑ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زین العابدین نے میت کو کیسے اٹھایا وہاں تو سر کاٹ کر کے یزید کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔ کفن اور دفن کے معاملے میں مختلف رائیں ہیں۔ ہاں اگر زین العابدین اس حالت میں ہوتے تو

ضرور اٹھاتے۔ یہ تو ایک خیالی تصویر ہے۔

میر انیس کی شاعری کا سب سے بڑا جوہر جو مجھے اُن کی شاعری میں نظر آیا وہ یہ ہے کہ انھوں نے بروقت، بر محل اور چسپاں الفاظ کا استعمال اُردو شعرا کے مقابلے میں کثرت سے کیا ہے اس وجہ سے انھیں مختلف قسم کے الفاظ کام میں لانے پڑے اس کے باوجود بھی کلام میں غیر فصیح الفاظ کا استعمال نہ کے برابر ہے جیسا کہ میں نے دیکھا کہ عامیانہ اور بھونڈے پن کا وجود نہ کے برابر ہے یہ ان کا خاص کمال ہے کہ وہ مناسب الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں جو عام فہم ہوتے ہیں، اور وہ صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ یہاں میں شبلی مرحوم کے حوالے سے یہ کہنا چاہوں گی کہ ان کے ہم عصر مرزا دبیر صاحب نے غیر فصیح الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مولانا شبلی نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر مرزا صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر انیس صاحب کے یہاں فصیح تر ہوں گے۔ آگے چل کر مجھے بھی کچھ ایسا ہی دیکھنے کو ملا اور میں شبلی مرحوم کے اس نظریے سے متفق ہوں۔

دورانِ مطالعہ کچھ اشعار ایسے ملے جہاں مجھے تھوڑا احساس ہوا کہ میر صاحب نے کلام میں فصاحت کو برقرار رکھنے کے لیے کلام کی ساخت کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ جس سے سبکی اور گرانی بالکل نہ آئے اور فصاحت قائم رہے جیسے ایک جگہ انھوں نے کہا ہے

ع آدمی ہے کہ صحرا کا جانور

صحرا یہاں الفاظ صحرا نے مصرعے میں فصاحت پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ساتھ اگر کسی مصرع یا شعر میں تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب اور توازن ہو تو وہ تمام الفاظ فصیح گردانے جاتے ہیں اور شعر آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ جتنے اشعار کو میں نے مقالے میں پیش کیا ہے ان میں مجھے اکثر یہ چیزیں دیکھنے کو ملیں اور ساتھ ساتھ ترکیب الفاظ کو میر صاحب نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے روزمرہ کی زبان کو بھی انھوں نے بڑی خوش سلیقگی سے پیش کیا ہے جو عام فہم بھی ہیں اور سبکی اور گرانی سے دور بھی ہیں۔ میں

چند اشعار یہاں پیش کرتی ہوں جس میں روزمرہ کی زبان کا انیس نے استعمال کیا ہے:

”زندہ نہ محمد ہے ، نہ اب عون ہے، بیٹا

تم بھی نہ پوچھو تو میرا کون ہے بیٹا

خادم جدانہ تھا شہ گردوں سر پر سے

کسی جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے“

ساتھ ساتھ میرا انیس کے یہاں یہ بھی ایک مثالی چیز دیکھنے میں آئی کہ وہ مضامین کی نوعیت کے حساب سے زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ الفاظ سادہ، شیریں و سہل ہوتے ہیں، ردیف و قافیہ کا بھی استعمال بڑے حسن و خوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ پرانے مرثیوں میں ردیف کی پابندی بہت کم ہوتی تھی صرف قافیہ ہی قافیہ ہوتا تھا بلکہ جو لوگ انگریزی شاعری کی نقل کرتے ہیں ان کے یہاں قافیہ سے کوئی مطلب نہیں ہوتا اور خاص طور سے اردو میں ردیف لے اور رسم کا کام دیتی ہے جس طرح راگ میں تالے نہ ہوتو بد مزہ ہے یہی حالت اردو شعر کی ہے لیکن ردیف کے قائم رکھنے میں قادر الکلامی ایک اہم چیز ہے اور یہی شعر میں چمک اور دمک پیدا کرتی ہے۔

(موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، دہلی، ۱۹۴۹ء، ص ۴۶۔)

چاہنا خلق کو صہبا و صنم سے محروم

ایسی نیت پہ بہشت آپ کو واعظ معلوم

بلاغت اور فصاحت کے ساتھ ساتھ استعارات و تشبیہات کے استعمال سے شعر میں ایک خاص خوبی پیدا ہو جاتی ہے یہی چیزیں حسن فن کا زیور ہیں بلکہ نظم و نثر اور تقریر و تحریر میں جو خوبی پائی جاتی ہے وہ ان ہی کی بدولت ہے جس طریقے سے اردو شاعری میں بے معنی تکلفات پیدا ہو گئے ہیں اور جس کی وجہ سے شاعری کی اصلی خوبی کا فقدان ہو گیا ہے مگر اس وقت کے اہل قلم اس کو کمال سمجھتے ہیں تشبیہ کی دو قسمیں

بتائی جاتی ہیں۔ مفرد اور مرکب۔ مفرد تشبیہ میں جدّت نہیں ہوتی اور مرکب میں جدّت ہوتی ہے۔ تشبیہ کا ایک اصل نکتہ یہ ہے کہ مشبہ کی تصویر ہو، ہو سامنے آجائے اور پرانی شاعری میں یہی باتیں تھیں لیکن اب وہ خیالی بن کر رہ گئیں ہیں۔ یہ چیز جس قدر میر انیس کی شاعری میں پائی جاتی ہے اس کی مثال کا ملنا مشکل ہے، اور یہ تشبیہات عام فہم ہیں۔ ادباء کا خیال ہے کہ تشبیہ سے مقصد مشبہ کی بڑائی اور خوبی اور کبھی مذاق اور رسوائی اور کبھی جاہ و جلال مقصود ہوتا ہے لیکن یہ چیزیں بہت سے مرثیہ نگاروں کے اندر مجھے نظر نہ آئیں لیکن جو حسن و خوبی میر انیس کے مرثیوں میں تشبیہ اور اشعارے سے متعلق مجھے ملی وہ کسی اور کے یہاں مجھے نہیں ملی کیونکہ دورانِ مطالعہ مجھے کچھ اور مرثیہ نگاروں کے کلام میرے سامنے آئے اور ان کو میں نے سرسری نظر سے پڑھا مگر میں نے اس فن میں بھی میر انیس صاحب کو الگ تھلگ پایا مثال کے طور پر ایک شعر پیش ہے۔

یوں برا جھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب سے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صنائع و بدائع بھی کلام میں حسن و خوبی پیدا کرنے ہیں کیونکہ فائع بدائع و مبالغہ، ایہام اور مناسبات لفظی شاعری کو بدرجہ اتم پہنچانے میں اہم مانی جاتی تھیں کیونکہ میر انیس ایسے سماج سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے۔ اور ان کے خیال میں صنائع و بدائع شاعری کے چہرے پر داغ تھے کیونکہ یہ فن اسی وقت زوال پذیر ہو چکا تھا۔ لیکن مجبوراً انھیں اسے اپنانا پڑا حالانکہ اس کی نا پسندیدگی کا اظہار کیا۔ مگر انھوں نے سادگی اور برجستگی اور صفائی کا پورا اہتمام کیا۔

دوسری صفت ایہام کی ہے جو میر انیس کے یہاں بخوبی موجود ہے کیونکہ ہمیں دورانِ مطالعہ کچھ ناقدین کی کتابیں پڑھنی پڑیں۔ جن سے ہمیں اپنے مقالے کی تیار کرتے ہیں ایک نیا راستہ ملا ساتھ ساتھ یہ چند اہم نکتے بھی سامنے آئے جنھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہا۔ اور اب بھی ان کے پڑھنے کا شوق

باقی ہے۔ اور کہیں کہیں میں نے مقالے میں اس کا ذکر بھی کیا ہے جو میرے لئے ایک نئی چیز ہوئی کیونکہ اس تحقیقی کام سے پہلے ایم اے اور بی اے کے کلاس میں یہ چیزیں سامنے آئیں تھیں مگر اس کی گہرائی تک میری رسائی نہیں ہوئی تھیں مگر اس وقت مجھے کچھ تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا جو یہاں میں نے قلم بند کیا ہے اور اس پر مزید تفصیل سے مطالعے کا ارادہ ہے۔

ایہام کے معنی ایک چیز کو دو معنوں میں استعمال کرنا ہے۔ ایک معنی مراد ہو، ایک معنی مراد نہ ہو۔ لیکن آگے اور پیچھے کے الفاظ سے مناسبت ہو۔ اس فن کا میرا نیس کے زمانے میں عام رواج ہو چکا تھا اور میرا نیس صاحب نے عوام کی پسندیدگی کی بنا پر اس کو اپنایا۔ مثال کے طور پر ایک مصرع پیش ہے۔ ”اک پھول کا مضمون ہو تو سورنگ سے باندھوں رنگ“ کے دو معنی ہیں۔ ایک تو وہی معمولی رنگ، دوسرے قسم، طرح، طرز، انداز یہاں یہی آخر الذکر معنی مراد ہیں یعنی پھول کے مضمون کو میں سو انداز سے باندھ سکتی ہوں۔

ایک اہم صفت مبالغہ ہے مبالغہ کیونکہ شاعری میں ایک عام وصف ہے اور عربی شعرا نے تو مبالغہ کو اس حد تک پہنچا دیا کہ اس پر یقین کرنا تو درکنار اسے لوگوں نے مزاح اور دل جوئی کا ایک ذریعہ بنا لیا اور اسی لئے یہ فن کلام میں نقص کا سبب بن گیا۔ جب عربی شاعری میں تصنع زیادہ بڑھا اور اصلی چیز اوجھل ہو گئی اور لوگ مبالغے کی طرف مائل ہو گئے تو یہ شاعری میں بہت بڑے نقص کا سبب بن گئی جس کی ایک مثال میں یہاں پیش کرنا پسند کروں گی۔

متنبی نے اپنے بادشاہ سیف الدولہ کی مدح میں لکھا ہے کہ جب بنو کلاب کو شکست ہوئی تو بادشاہ کے لشکر نے بنو کلاب کا پیچھا کیا اور بہت زور و شور سے ان کی تلاش شروع کی تو اس زمانے میں کوئی بھی قافلہ وہیں قیام کرتا تھا جہاں پانی دستیاب ہو۔ تو شاعر کا کہنا ہے کہ بدلی دہشت زدہ ہو گئی کہ یہاں پانی ہے اور سیف الدولہ کا لشکر انھیں تلاش کرتے ہوئے وہاں نہ پہنچ جائیں لیکن میر صاحب اس قسم کی نقالی

سے بہت دور رہے، اور اس قسم کے مبالغہ سے پرہیز کیا اور ایسی بنیاد پر ان کے حریف یہ کہتے ہیں کہ وہ خیال بندی اور خیال آفرینی میں دوسرے مرثیہ گو مرزا صاحب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

بہر حال میری اپنی یہی رائے ہے کہ مرزا صاحب سے میرا نیس ہر فن میں آگے تھے۔ اب اگر مخالفین اس بنا پر مرزا صاحب کو میرا نیس پر فوقیت دیتے ہیں کہ انھوں نے مبالغہ کا استعمال نہیں کیا جس حد تک مرزا دبیر نے کیا ہے تو میرے خیال میں یہ ایک امر مسلم ہے کہ مبالغہ حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ نقص بن جاتا ہے اگر میرا صاحب نے اس سے گریز کیا تو یہ ایک حقیقت پسندی ہے جو کہ ایک خوبی ہے۔ ہم یہاں چند مثالیں ان کے مبالغہ کی دیتے ہیں جس میں اعتدال پایا جاتا ہے۔

وہ یوں، وہ آفتاب کی جدت، وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے جبابوں کے، پتے تھے سب کے سب

سرخ اڑی تھی پھولوں سے، سبزی گیہا سے
سایہ کنویں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے طائر ادھر دھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خن خانہ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر آنکھ سے نکل کے، ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینہ فلک کو نہ تھی تاب و لب کی تاب
 چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
 سب سے سوا تھا گرمِ مراجوں کو اضطراب
 کا فورِ صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب
 بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اشیر میں
 بادل چھپے تھے سب کرہ زمہریر میں
 شیراٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے
 آہونہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
 آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
 گردوں کو تپ چڑھی، زمیں کے بخار سے
 گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
 بھن جاتا تھا جو گرہا تھا دانہ زمین پر
 گرداب پر تھا شعلہٴ جوالہ کا گمان
 انگارے تھے جباب، تو پانی شررِ فشاں
 منہ سے نکل پڑی تھی ہر ایک موج کی زبان
 تہہ میں تھے سب نہنگ، مگر تھی لبوں پہ جاں
 پانی تھا آگ، گرمی روزِ حساب تھی
 ماہی جو بخ موج تک آئی، کباب تھی

گھوڑے کی تعریف:

اس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
ساکن جو حرف ہو، وہ نہ آئے زبان پر
کل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
بجلی ہے، جس طرف دم پیکار پھیر لو
کاوے میں شکل گنبدِ دوّار پھیر لو
نقطے کے گرد صورت پر کار پھیر لو
دوڑتے بہ روئے آب، تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

(حوالہ سابق، ص ۹۷-۹۸)

پہلے شعر میں دھوپ کا رنگ تاریک رات کی سیاہی سے ملایا ہے مندرجہ بالا اشعار میں مبالغہ اتنا زیادہ نہیں ہے جو بعید از قیاس ہو۔ دوسری صفت حسن تعلیل کی ہے اس میں شاعر کسی چیز کی ایک علت فرض کرتا ہے جو درحقیقت اس کی علت نہیں ہوتی ہے۔

ع بھلائی جو کرے دنیا میں، ہوے وہ پا مال

بسان جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا

جادہ کے معنی راستے کے ہیں وہ پا مال ہو جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرتا ہے یہ ایک قسم کا تخیل ہے اس لئے اسے ایک صفت شاعری قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی صفت میں اس وقت زیادہ لطافت پیدا ہو جاتی ہے جب وہ صفت بھی جس کی علت بیان کرتی ہے وہ بھی تخیل ہی ہو۔
”اکبر سے بھی وغا میں کچھ آگے“ بڑی حضرت علی اکبر کی تلوار کی تعریف

ہر چند مچھلیاں تھی زرہ پوش سر بہ سر
منہ کھولے چھتی پھرتی تھیں لیکن ادھر ادھر
بھاگی تھی موج، چھوڑ کے گرداب کی سپر
تھے تہہ نشیں نہنگ، مگر آپ تھے جگر

دریا تھمتا خوف سے اس برق تاب کے

لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

یہ ایک دوسری اہم صفت ہے جس کا استعمال میرا نیس نے اکثر برتا ہے اور نہایت حسین پیرائے
میں اس کو بیان کیا ہے وہ ہے صفت طباق جس میں دو مخالف چیزیں یک جا جمع کر دی جائیں مثال کے
طور پر چند اشعار یہاں پیش ہیں۔

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے

اقلیم سخن میرے قلم و سے نہ جائے

ہر نخل برو مند ہے با حضرت باری

پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

ع: آتی ہوں میں سروں پہ ذرا فرق فرق ہے۔ (تلوار کی زبان سے)

موازنہ انیس و دبیر (مئی ۹۹-۱۰۰)

ع: کیا مورچہ بندی تھی پے قتل سلیمان

اصغر سے اگر اکبر مہہ رونہ ملے گا

تم ہاتھ سے جاؤ گے تو باز و نہ ملے گا

فرماتے تھے حسین کہ اوخانماں خراب

دریا کو خاک جانتا ہے ابن بو تراب

(موازنہ انیس و دبیر، ص ۱۰۱-۱۰۲)

انسانی جذبات اور احساسات کی تصویر کشی میر انیس نے بڑے اچھے انداز میں پیش کی ہے۔ اور اصل شاعری کی پہچان اسی سے ہوتی ہے۔ شبلی کے قول کے مطابق شاعری درحقیقت مصوری ہے اور شبلی نے شاعر اور مصور میں یہی فرق بتایا ہے کہ مصور مادی اشیاء کی تصویر کھینچتا ہے اور شاعر مادی اور غیر مادی دونوں کی تصویر کھینچتا ہے۔

”یہاں تک جن محاسن کلام کا ذکر ہوا، وہ شاعری سے نہیں، بلکہ بلاغت سے تعلق رکھتے تھے۔ شاعری جس چیز کا نام ہے اس کی بحث اب شروع ہوتی ہے۔

یہ شاعری کی اصل روح رواں ہے، اور اگر شبلی صاحب کی رائے تسلیم کی جائے تو صرف اسی ہنر کا نام شاعری ہے، شاعری درحقیقت مصوری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اس قدر دشوار نہیں جس قدر غیر محسوسات اور غیر مادی اشیاء کا نقشہ اتارنا مشکل ہے۔ ایک درخت کی تصویر کھینچنی ہو تو کسی قسم کی تخیل اور دیدہ وری کی ضرورت نہیں۔ ٹہنیاں، پھل، پھول پتے سب سامنے ہیں اور ہر شخص ان کو محسوس کر سکتا ہے۔ مصور کا صرف یہ کمال ہے کہ ہر چیز کا پورا نقشہ کھینچ دے۔ لیکن رنج و غم، خوشی، محبت، غیظ، بے قراری، بے تابی، مسرت خوشی، محسوس اور مادی چیزیں نہیں ہیں۔ آنکھ ان کو محسوس نہیں کر سکتی البتہ دل پر ان کا اثر ہوتا ہے لیکن یہ اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا، اسی لیے ان کی ہو بہ ہو اور اصلی تصویر اتارنا مشکل ہے۔

میر انیس کا اصلی جوہر یہیں آ کر کھلتا ہے اور یہیں ان کی شاعری کی حدان کے ہم عصروں سے بالکل الگ ہو جاتی ہے۔ انسانی جذبات کی سیکڑوں قسمیں ہیں، اور پھر ہر ایک کے مختلف مراتب اور مدارج، ہیں مثلاً جذبات انسانی کی ایک قسم محبت ہے، لیکن محبت کے بھی مختلف اقسام اور مدارج ہیں، باپ بیٹے کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، یار آشنا کی محبت، آقا اور غلام کی محبت وغیرہ وغیرہ۔ میر انیس کے مرثیوں میں نہایت کثرت سے ان جذبات اور ان کے مختلف مدارج کا ذکر ہے لیکن جس جگہ جس چیز

کولیا ہے اس کمال کے ساتھ اس کی تصویر کھینچی ہے کہ اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے بھر جاتا ہے۔“
(ایضاً ص ۱۰۴-۱۰۵)۔

اسی ضمن میں میر انیس کے اشعار اتنے زیادہ ہیں اور کافی سے کافی مقالے میں موجود ہیں یہاں اس کے نمونے کو پیش کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

یہی حال میر انیس کی کردار نگاری میں بھی ہے۔ جس احسن طرز کلام سے انھوں نے خواتین کر بلا کی کردار نگاری کی ہے یا اہلیت کے درد و غم کی جس موثر انداز میں تصویر کشی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شبلی نے میر انیس کی واقعہ نگاری کے فن کو چند لفظوں میں بیان کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ واقعہ نگاری میں اردو کیا فارسی میں بھی اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے ہر قسم کے واقعات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ واقعہ نگاری کی کسی صنف کو باقی نہیں چھوڑا اور واقعہ نگاری کے جزئیات کو بھی انھوں نے اتنے چھوٹے انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ کلیات کی شکل میں سامنے آ جاتی ہے جیسے دو حریفوں کی معرکہ آرائی کو جہاں دیر اور دوسرے شعراء لکھتے ہیں جہاں اوپر اوپر کی باتیں لکھ دیتے ہیں، اور پتہ نہیں چلتا کہ کس نے کیا ہنر دکھائے ہیں میر صاحب ان کی خصوصیات کو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ جیسے انھوں نے امام حسینؑ کا کر بلا میں داخلہ دشمنوں کی طرف سے رکاوٹ امام کے رفقاء کی ناراضگی حضرت امامؑ کی صلح پسندی اور معافی وغیرہ مندرجہ ذیل اشعار میں پیش کیے ہیں اشعار تو بہت زیادہ ہیں لیکن نمونے کے طور پر چند اشعار پیش ہیں۔

اترا یہ کہہ کے، کشتی امت کا ناخدا

جتنے سوار تھے، وہ ہوئے سب پیادہ

حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا

دیکھو تو کیا ترائی ہے، کیا نہر، کیا فضا

اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عبّاس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہشاہِ سر بلند
کیوں یہ مقام ہے تمہیں شاید بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہِ ارجمند
بس یاں تو خود بہ خود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند

شیراب یہیں رہیں گے، عنایتِ جورب کی ہے
بس کیا کہوں حضور، ترائی غضب کی ہے

روتے ہوئے وہاں سے بڑے آپ چند گام
گویا زمیں کی سیر کو اترامہ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدر کے لالہ فام
شکلیں وہ نور کی، وہ تجمل، وہ احتشام

زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں، ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کے دونوں لال
پھولوں سے کھیلنے لگے زینب کے نو نہال
سبزے سے واں کے ابنِ حسن خوش ہوئے کمال
کی عرض، اس زمین کا ہر اک گل ہے بے مثال

اے خسروِ زمین! یہ جگہ ہے جلوں کی
 خوش بو ہے یاں کی خاک میں عطرِ عروس کی
 صحرا سے آئے پھر سوے دریا شہہ ام
 الیاس شاد ہو کے پکارے بہ صد حشم
 اچھلیں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم
 بولے حباب، آنکھوں پہ شاہا! ترے قدم
 پانی میں روشنی ہوئی حسنِ حضور سے
 لے لیں بلائیں پنجہٴ مرجان نے دور سے
 ٹھہرے کنارِ نہرِ جوانانِ ماہِ رو
 دھو یا کسی نے رخت، کسی نے کیا وضو
 گھوڑے سے جو آئے پیاس بھانے کنارِ جو
 بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیرِ نیکِ خو
 کھینچی اک آہِ سرد، ترائی کو دیکھ کر
 ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

(ایضاً، ص ۱۸۱-۱۸۰)

رزمیہ شاعری بھی ایک واقعہ نگاری ہوتی ہے اس کو بھی میر انیس نے بہت کامیاب انداز میں
 پیش کیا ہے اور اس میں بھی اپنے حریفوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے کیونکہ رزمیہ نظم واقعہ نگاری کی شکل میں
 میدانِ کربلا سے لے کر اور آخر تک جس مؤثر انداز میں پیش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔
 میر انیس نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ نہایت ہی تعلیم یافتہ اور شائستگی اور عمدہ اخلاق کا

ماحول تھا کیونکہ اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم عام نہ تھی اور جس گھرانے میں عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو جاتیں تھیں اسے سونے پر سہاگہ سمجھا جاتا تھا۔

کیونکہ سماج میں اس وقت عورتوں کو وہ مقام حاصل نہیں تھا جو انھیں ملنا چاہئے اور میر انیس اس سے نہایت بدظن تھے اور ان کے دل کے ہر گوشے میں عورتوں کا احترام اور ان سے عقیدت کا جذبہ موجود تھا۔ چونکہ شاعر کے ساتھ ساتھ وہ ماہر نفسیات بھی تھے وہ چھوٹے سے چھوٹے واقعات سے بہت غم گین ہو جاتے اور ماں کی عظمت اور محبت کا نقشہ ہی فنکار کے فن میں عورت کا مقام مقرر کرتا ہے میر انیس نے اپنے مرثیوں میں عورتوں کو بہت بلند درجہ دیا۔ وہ عورت کو محبت کا پیکر، حیا کی مثال، ایمان کی جان، شرافت اور نیکی کی تصویر، قربانی اور ایثار کی خوگر سمجھتے تھے بلکہ انھیں عورت میں بلندی ہمدردی اور حوصلہ شعاری اور بہادری کی خوبیاں بھی نظر آتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ عورت اصول کے لئے بڑے سے بڑے پہاڑ سے ٹکڑے لے سکتی ہے۔ جان سے زیادہ عزیز چیز کو بھی قربان کر سکتی ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ یہ خوبی خاندان اہل بیت کی عورتوں تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ خوبی عام عورتوں کے اندر بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ امام حسینؑ کے دشمنوں کی عورتوں نے جو ہمت اور جرأت دکھائی اور جس اعلیٰ ظرفی اور حمیت و شرافت کا مظاہرہ بغیر کسی خوف و جھجک کے پیش کیا وہ بھی ایک قابل مثال ہے۔ انیس صاحب نے ہزاروں ہزار صفحات قلم بند کر ڈالے لیکن کبھی ان کو ظالم پرست، بدعقیدہ، حرص و ہوس کے غلام جیسی خصلت عورت میں نظر نہیں آئی۔ اس سے انداز ہوتا ہے کہ انیس کی ماں، بیوی اور خاندان کی دوسری عورتیں اونچی شخصیت کی مالک رہی ہوں گی۔ اسی طرح سے انھوں نے میدان کر بلا یا اس کے بعد یا اس سے پہلے خواتین اہل بیت کی معرکہ کشی جس انداز میں پیش کی ہے اور قاتلان حسینؑ کی بیویوں کی اعلیٰ ظرفی کو بھی انھوں نے بڑے اچھے انداز سے اُجاگر کیا ہے اور ساتھ ساتھ عام عورتوں کے کردار کی تصویر کشی بھی ایک ایسی تصویر ہے کہ دنیا کے بقا تک مثال کے طور پر پیش کی جائے گی۔

بے جھک یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ واقعہ کر بلا کے بعد جو صبر و عزیمت ثابت قدمی اور اللہ پر بھروسہ کا مظاہرہ میدانِ کر بلا میں خواتین کر بلا نے پیش کیا کہ سب کچھ لٹ جائیکے بعد بھی زبان سے اف نہیں نکالا اور صبر و قناعت کو اپنا بہترین ہتھیار بنایا اور اسی سے انھیں پذیرائی ملی اور دونوں جہاں میں سرخ روئی حاصل ہوئی۔

اب تک جو کچھ میں نے ذکر کیا اس کا تعلق میر انیس کی ہمہ جہتی شخصیت اور ان کی اپنے فن پر دسترس کے متعلق تھیں۔ لیکن یہ بھی کہنے میں گریز نہیں کرونگی کہ ان کا کلام غلطیوں سے پاک ہے، اور لوگوں نے ان کی غلطیوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ صرف اسی شخص کی ہر بات کی تقلید کرتے ہیں اگر وہ غلط بھی ہو تو اس کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرتے ہیں۔ سبھی عبدالغفور خاں نساخ نے میر انیس کی غلطیوں کو جمع کیا تھا اور ان کو ایک رسالے میں چھپوایا۔ جیسے میر انیس نے جابجا سینہ، مدینہ، کینہ، قرینہ کو دانا اور دبینا کا قافیہ باندھا ہے۔

حق نما ہے تو جہاں میں ہے یہی آئینہ
اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا

اسی کے جواب میں کہا گیا کہ یہ قدما کا طریقہ ہے جن الفاظ میں ان کا اعلان ضروری ہے میر انیس نے ان کا اعلان نہیں کیا ہے۔ اکثر جگہ شایگان کافی ہیں نساخ نے اس قسم کے شعر جمع کیے ہیں لیکن لوگوں نے اس کا انکار کیا اس قسم کے اعتراضات بڑی تفصیل کے ساتھ مولانا شبلی نے اپنی کتاب ”موازنہ انیس و دبیر“ میں ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ سرسری طور پر میں نے اس کا ذکر کر دیا ہے۔ مگر اس کی تفصیل ان کی کتاب، میں موجود ہے، جس سے میں نے استفادہ کیا ہے اگر قارئین تفصیل چاہیں تو اسے پڑھ سکتے ہیں معذرت کے ساتھ میں قارئین کے گوش گزار کرنا چاہوں گی میری یہ بساط نہیں ہے کہ میں میر انیس پر اعتراضات کروں مگر حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے میں نے

یہ ضروری سمجھا کہ صاف طور سے اس بات کا ذکر کردوں اس چیز کو پڑھنے کے بعد تھوڑی سی سوجھ بوجھ مجھ میں اس مسئلے میں آئی اور قارئین کو گوش گزار کرنا میں نے ضروری سمجھا۔

دوسری چیز جو دورانِ مطالعہ میرے سامنے آئی اور میں نے اسے بھی پڑھا جس میں شبلی صاحب نے جو کہا وہ مندرجہ ذیل ہے اور میں بعینہ میں نے اس کو یہاں قلم بند کر لیا ہے۔

”اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میرا نیس (اور میرزا دپیر) کے بہت سے اشعار پر سرفراز کا گمان ہو سکتا ہے، کیونکہ وہی مضامین بعینہ یا بہ خفیف تغیر اساتذہ کے یہاں پائے جاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب پر سرفراز کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے۔ اساتذہ کا قاعدہ ہے، جیسا وہ دیکھتے ہیں کہ ایک مضمون کسی متقدم شاعر نے باندھا، لیکن اچھی طرح نہ بندھ سکا یا اس پر ترقی ممکن ہے، تو وہ دانستہ اس مضمون کو لے کر، اس طرح ادا کرتے ہیں کہ جو کسرتھی نکل جاتی ہے اور شعر بلند رتبہ ہو جاتا ہے۔ فردوسی نے خیمہ کی تعریف لکھی تھی، یکی خیمہ داشت اضراسیاب۔ زمشرق بہ مغرب کشیدہ طناب۔ نظامی نے دیکھا کہ مبالغہ اچھا ہے لیکن کوئی ثبوت نہیں۔ انھوں نے ایک تشبیہ پیدا کر کے ثبوت دے دیا۔

یکی خیمہ داشت چوں آفتاب

زمشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

آفتاب کی تشبیہ نے مشرق سے مغرب تک طنابوں کا کھنچا ہونا ثابت کر دیا، کیونکہ آفتاب خیمے سے اور اس کی کرنیں طناب سے مشابہ نہیں۔

سعدی کا شعر تھا:

ترا ہر آئین باید بشہر دیگر رفت

کہ دل نہماند در لیس شہرتاز بایی باز

شہر کے شہر کا دل چھین ”لینا“ معشوق کا کمال ہے، لیکن معشوق کی یہ صلاح دینی کہ وہ کسی اور شہر کو

چلا جائے، لغوبات ہے اس لیے امیر خسرو نے اس کا چارہ کاریہ بتایا:
 کسی نمائد کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی
 سلمان ساوجی کا شعر تھا:

شاہد آن نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل
 شاہد آن است کہ این دار دو آنی دارو
 خواجہ حافظ ہے اس کو مطلع کر کے بلند کر دیا
 شاہد آن نیست کہ موی و میانی دارد
 بندہ طلعت آن باش کہ آنی دارد

سلمان کے شعر میں این و آن کا جو لطیف تھا، وہ اچھی طرح ادا نہ ہو بہکا تھا، کیونکہ آن میں نون بہ اعلیٰ ہے، اس لیے آن جو این کا مقابل) کا ایہام نہیں ہوتا۔ خواجہ حافظ نے اس نقش کو یوں پورا کیا۔

این کہ میں گویند آن بہتر ز حسن یار ما این دارد و آن نیز ہم
 صاف نظر آتا ہے کہ ان لوگوں نے دیکھا کہ ایک عمدہ بات پیدا ہوئی تھی لیکن ناقص رہ گئی، ایک چیز کو ناقص چھوڑ دینا اچھا نہ تھا اس کو پورا کر دیا۔ اگر اس کا نام سرقہ ہے اور یہ معیوب نہیں ہے، تو دنیا میں ہر قسم کی صفتیں جو ایجاد ہوئیں، وہ اسی پہلی حالت پر قائم رہنی چاہئے تھیں، چھکڑے کے بجائے فٹن اور بروم تیار کرنا بھی سرقہ قرار پاتا“ (حوالہ سابق، ص ۲۴۷-۲۴۸)

میر انیس صاحب کے یہاں جو سرقے پائے جاتے ہیں وہ اس قسم کے نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سرقے کے حوالے سے جو باتیں کہی گئیں ہیں وہ بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں کیونکہ میر انیس اپنے ہم عصروں میں بالاتر سمجھے جاتے ہیں بلکہ بہت سے ادباء کا یہ کہنا ہے کہ میر انیس اپنے زمانے میں اور اس کے بعد آنے والے زمانے میں بھی ایک بے مثال شخصیت مانے گئے۔ اور اب اس شخص کے متعلق

سرفے کی بات کہنا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے جو سراسر ناقابل یقین ہے۔ دوسرے شاعر اگر ان کے شعر سے سرفے کر لئے تو ایک حد تک روا سمجھا جاسکتا ہے لیکن انیس خود گونا گوں صلاحیت کے مالک تھے اور اپنے زمانے کے بے مثال شاعر تھے تو اسے تعصب نظری سے قطع سے بٹ کر اور انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بات کسی حد تک بھی سچ نہ ہوگی۔ لیکن اس ہنر کا ذکر شبلی جیسے قلم طراز نے کیا ہے تو یہ قابل غور بات ہے اب میں اس پر کوئی اضافہ نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ میری بے بصاعتی اس میں کار فرما ہو میں یہ مسئلہ قارئین پر چھوڑتی ہوں اور شبلی صاحب پر۔

اپنے اس حاصل مطالعہ میں، میں نے اپنے نظریے کی وضاحت کر دی ہے۔ مگر میں اپنے آپ کو بہت کم تر سمجھتی ہوں۔ تحقیق کا کام ایسا کام ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ میں نے ایک ایسے عربی ادیب کی کتاب میں لکھا دیکھا ہے جو بہت ہی مشہور اور عالم مانا جاتا ہے جس کی اپنی ساری کتابیں تقریباً دس ہزار صفحات میں ہیں۔

”کہ تحقیق ایسا سمندر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں“ اور ساتھ ساتھ قرآنی آیت کو مع ترجمہ پیش کروں گی۔

”فوق کل ذی علم علیم“

”انسانوں میں ایک سے ایک بالاتر ہے یہی اس حاصل کلام کا خاتمہ ہے اور اللہ سے مدد کی درخواست ہے۔“

کتابیات

کتابیات

نمبر شماره	نام کتاب	نام مصنف / مرتب	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱	مراثی انیس جلد سوم	مرتبہ نظم طباطبائی نظم	نظامی پریس بدایوں	۱۹۳۰ء
۲	باقیات انیس	مرتبہ اکبر حیدری	لکھنؤ محمدی پبلشرز	۱۹۷۹ء
۳	انیس الاخلاق	مرتبہ محمد عباس،	لکھنؤ نظامی پریس	۱۹۳۹ء
۴	انیس (سوانح)	نیر مسعود	نئی دہلی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	۲۰۰۲ء
۵	انیس کی مرثیہ نگاری اور ان پر چند اعتراضات کا جواب	اثر لکھنؤ جعفر علی خاں	دانش محل	۱۹۵۷ء
۶	انیس کی مرثیہ نگاری اور ان پر چند اعتراضات کا جواب دوم	اثر لکھنؤ جعفر علی خاں	دانش محل	۱۹۵۷ء
۷	رباعیات انیس	مرتبہ سید محمد حسن بلگرامی	لکھنؤ اتر پردیش اردو اکاڈمی	۱۹۷۹ء
۸	روح انیس	مرتبہ سید مسعود حسین رضوی ادیب	طبع چہام لکھنؤ کتاب نگر	۱۹۶۸ء

۹	انتخاب انیس	مرتبہ ابن سعید	الہ آباد اسرار کریبی پریس	۱۹۶۴ء
۱۰	جواہرات انیس	مرزا امیر علی جوہری	لکھنؤ، اردو	۱۹۷۳ء
۱۱	اردو مرثیہ	محمد طاہر فاروقی	مشمولہ نقوش لاہور	جون ۱۹۶۰ء
۱۲	اردو مرثیہ	سفارش حسین رضوی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	جولائی ۱۹۶۵ء
۱۳	انتخاب مراثی انیس ودبیر	انیس ودبیر	مکتبہ جامعہ اردو	۱۹۷۰ء
۱۴	اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقاء	پروفیسر اکبر حیدری کشمیری	نظامی پریس لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۱۵	باقیات دبیر	ڈاکٹر اکبر حیدری	مرزا پبلشرز حسن آباد سری نگر	۱۹۹۴ء
۱۶	تاریخ مرثیہ گوئی	حامد حسن قادری		فروری ۱۹۷۳ء
۱۷	تلاش دبیر	کاظم علی خاں	لکھنؤ	۱۹۷۹ء
۱۸	حیات دبیر	سید افضل حسین ثابت لکھنوی	مطبع سیوک سیٹم پریس لاہور کتاب خانہ سید دلشاد حسین صاحب	۱۹۱۳ء
۱۹	دفتر دبیر	ڈاکٹر ہلال نقوی محمدی	ایجوکیشنل پبلشرز کراچی	۱۹۹۵ء
۲۰	دفتر ماتم	مطبوعہ احمدی	لکھنؤ	۱۸۹۶ء، ۱۸۹۷ء
۲۱	دہلوی مرثیہ جلد اول	علی جواد زیدی	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۸۷ء
۲۲	دہلوی مرثیہ جلد دوم	علی جواد زیدی	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۸۷ء

۲۳	رباعیات دبیر	مرتبہ سید سرفراز حسین خیر لکھنوی	نظامی پریس	۱۳۳۹ء
۲۴	رسالہ سرفراز، لکھنؤ دبیر نمبر	مرتبہ کاظم علی خاں	سرفراز قومی پریس لکھنؤ	۲۱۹۷۵ء
۲۵	شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر	ڈاکٹر اکبر حیدری	اردو پبلشرز لکھنؤ	اگست ۱۹۷۶ء
۲۶	شعار دبیر	مہذب لکھنوی	یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ	فروری ۱۹۵۱ء
۲۷	فسانہ عجائب	رجب علی بیگ سرور	مطبع نامی نول کشور	۱۹۴۹ء
۲۸	کاشف الحقائق	امداد امام اثر	مکتبہ معین الادب لاہور	۱۹۵۶ء
۲۹	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ابوالیث صدیقی	گیلان پریس لاہور	۱۹۵۵ء
۳۰	ماہ کامل	مہذب لکھنوی	سرفراز قومی پریس	جنوری ۱۹۶۱ء
۳۱	ماہ نامیہ کتاب نماد دبیر نمبر	مرتبہ عبدالقوی دسنوی	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	۱۹۷۵ء
۳۲	ماہ نامیہ راوپنڈی دبیر نمبر	مدیر فضل قدیر	راوپنڈی	۱۹۷۵ء
۳۳	زینب اخت لیکن	علامہ محمد حسین الادیب	وسفینۃ البحار جلد ۸	۵۵۸
☆	مراثی انیس	مرزا احمد عباس	کراچی بک لینڈ	۱۹۳۱ء
۳۴	اردو مرثیہ	علی عباس حسینی	لکھنؤ اردو پبلشرز	۱۹۷۲ء
۳۵	انتخاب مراثی مرزا دبیر	مرتبہ اکبر حیدری	لکھنؤ اتر پردیس اردو اکادمی	۱۹۸۰ء
۳۶	دبستان دبیر	ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	۱۹۶۶ء

۳۷	اردو مرثیے کی روایت	مسح الزماں	لکھنؤ کتاب نگر	۱۹۹۶ء
۳۸	اردو مرثیے کی سرگزشت آغاز سے زمانہ حال تک		دہلی عاکف بک ڈپو	۱۹۹۲ء
۳۸-	مراثی انیس جلد اول	مرتبہ نظم طباطبائی نظم	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۵ء
۳۹	مراثی انیس	مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب	کتاب نگر لکھنؤ	۱۹۵۶ء
۴۰	اردو مرثیہ	از سفارشی حسین رضوی	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	۱۹۶۵ء
۴۱	اردو مرثیہ کا ارتقاء	ڈاکٹر مسیح الزماں	کتاب نگر لکھنؤ	۱۹۸۶ء
۴۲	اردو مرثیہ	اظہر علی فاروقی	الہ آباد	۱۹۵۸ء
۴۳	انیس شناسی	مرتبہ گوپی چند نارنگ	گلوب آفسیٹ پریس دہلی	۱۱۰۰۶
۴۴	وقار انیس (جلد دوم)	مرتبہ مہذب لکھنؤی	لکھنؤ	۱۹۵۴ء
۴۵	جواہرات انیس جلد دوم	مرزا امیر علی جوہر پوری	لکھنؤ	ستمبر ۱۹۷۴ء
۴۶	مرثیہ انیس	مطبوعہ نول کشور	کان پور	۱۸۹۳ء
۴۷	نضر انیس جلد اول	محمد صادق صفوی	تنویر پریس لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۴۸	مراثی انیس جلد ۱، ۲، ۳، ۴	نول کشور	لکھنؤ	۱۹۵۸ء
۴۹	مراثی انیس	مرتبہ نائب حسین نقوی جلد ۱، ۲، ۳	غلام علی لاہور	۱۹۵۹ء

۵۰	موازنہ انیس ودبیر	شبلی نعمانی	مفید عام آگرہ	۱۹۰۷ء
۵۱	المیزان	سید نظر حسین فوق مہابنی	مطبع فیض عام علی گڑھ	۱۹۱۳ء
۵۲	حیات دبیر	سید افضل حسین ثابت لکھنوی	مطبع سیوک سیٹم پریس لاہور کتاب خانہ سید دلشاد حسین صاحب	۱۹۱۳ء
۵۳	رد واقعات انیس	سردار مرزا	مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ	۱۹۰۸ء
۵۴	واقعات انیس	سید امجد علی شہری	مطبوعہ اصح المطابع تھوی ٹولہ لکھنؤ	۱۹۰۸ء
۵۵	سراپہ سخن	محسن علی محسن	مطبوعہ نول کشور رکاب گنج لکھنؤ	۱۹۷۰ء
۵۶	جوش ملیح آبادی کے مرثیے	ضمیر احمد نقوی	لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۵۷	تاریخ مرثیہ گوئی	حامد حسن قادری	دہلی	۱۹۷۳ء
۵۸	کاشف الحقائق	امداد امام اثر	نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۵۹	میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعراء	محمود فاروقی	مکتبہ جدید انارکلی لاہور	۱۹۵۶ء
۶۰	کلیات میر تقی میر	عبادت بریلوی		۱۹۵۷ء
۶۱	خوش معرکہ زیب قلمی	سعادت خاں نامرٹیکور	لاہور پری لکھنویونیورسٹی	۱۹۶۱ء
۶۲	ریاض لطافت،	شوکت جعفری	لکھنؤ	۱۳۰۸ء

۶۳	میر انیس، بحیثیت رزمیہ شاعر	ڈاکٹر اکبر حیدری	سرفراز قومی پریس لکھنؤ	۱۹۶۵ء
۶۴	مرثیہ میر انیس	نول کشور	لکھنؤ	۱۸۷۷ء
۶۵	وقار انیس	مہذب لکھنؤی	لکھنؤ انجمن محافظ اُردو	۱۹۵۴ء
۶۶-	موازنہ انیس ودیہ	شبلی نعمانی	زرین آرٹ، پریس، لاہور	مارچ ۱۹۶۴ء طبع اول
۶۷	خواتین کربلا	صالحہ عابد حسین	ملکتیہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ	جنوری ۱۹۷۳ء
۶۸	انیس کے مرثیے جلد دوم	صالحہ عابد حسین	نئی دہلی	۱۹۸۰ء- ۱۹۰۲ء شک